www.Pklibrary.com

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

# خواتین ڈائجسٹ

مارچ 2024

www.Pklibrary.com

www.pklibrary.com


# خواتین ڈائجسٹ

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

واٹس اپ 03172266944



بانی ——— محمود ریاض
مدیر اعلیٰ ——— آذر ریاض
مدیرہ ——— نادرہ خاتون
نائب مدیرہ ——— رضیہ جمیل
مدیر خصوصی ——— امت الصبور
بلقیس بھٹی
نفسیات ——— عدنان
قانونی مشیر ——— نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز



کہنی سنی، مسید 6
کرن کرن روشنی، ادارہ 7
ہمارے نام، نادرہ خاتون 25

## آپ سے کیا پردہ

غزل، انشاجی 12

## خاتون کی ڈائری

میری ڈائری سے، امت الصبور 200

## مجھ سے ملئے

باتیں حریم فاروق سے، شاہین رشید 13

## انٹرویو

سلمیٰ یاسمین نجمی سے ملاقات، شاہین رشید 18

## ناول

انگنا پھول کھلیں گے، راحت جبیں 34

## پیا و ساجدہ حبیب

آئینہ صفت لوگ، امت الصبور 202

## مکمل ناول

ملال، نمرہ احمد 173
احد، صوفیہ بٹ 148
رو اور روشنا، آسیہ رئیس خان 114
چاہا ہے تمہیں، راشدہ رفعت 60

## ناولٹ


دو دھاری تلوار، سنعیہ عمیر 90


## افسانے


راہ کے ستارے، عارفہ فضل شاہ 57

پردیس، راضیہ سید 55

مذاق، فریحہ اشتیاق 87

رمضان کے رنگ، آنسہ عائش 110


## نظمیں غزلیں


غزل، شاعر لکھنوی 196

نظم، مبارک صدیقی 196


## پکوان


موسم کے پکوان، واصفہ سہیل 206


## رنگا رنگ پھول


رنگا رنگ سلسلہ، شگفتہ جاہ 197



مارچ 2024

جلد 51 شمارہ 11

قیمت 150 روپے



خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی



زر سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ———— 1,800 روپے

امریکہ کینیڈا آسٹریلیا یورپ — 25000 روپے

سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں

subscriptions@khawateendigest.com


## میری بیاض سے


آپ کی بیاض سے، روحیلہ خان 199


## نفسیات


نفسیاتی ازدواجی الجھنیں، عدنان 208


## بیوٹی بکس


بیوٹی بکس کے مشورے، امۃ الصبور 210

www.pklibrary.com

مُدیر

# کہی مُسکراتی

خواتین ڈائجسٹ مارچ کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

رمضان المبارک کا مقدس مہینہ سایہ فگن ہے۔ رحمتوں اور برکتوں کا یہ مہینہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ گراں قدر نعمت اور انعام ہے۔ روزہ صرف بھوکا پیاسا رہنے کا نام نہیں ہے۔ روزے کے لغوی معنی کسی چیز سے رکنے کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے روزہ کی حالت میں جن باتوں سے منع کیا ہے۔ ان سے رک جانا روزے کی اصل روح ہے۔

رمضان المبارک دراصل ایک ماہ کا تربیتی پروگرام ہے۔ جو ہماری ذہنی اور فکری تربیت کرتا ہے تاکہ ہم سال کے بقیہ مہینوں میں بھی اس تربیت کے مطابق زندگی گزاریں۔

رمضان المبارک میں قرآن نازل کیا گیا۔ اس کے آخری عشرہ میں وہ ایک رات ہے، جو ہزار مہینوں سے افضل ہے جس کی عبادت کا ثواب ہزار ماہ کی عبادت سے زیادہ ہے۔

رمضان المبارک کا پہلا عشرہ رحمت، دوسرا مغفرت اور تیسرا عشرہ جہنم سے آزادی اور نجات ہے۔

اللہ تعالیٰ اس ماہ کی مبارک ساعتوں کو ہمارے لیے بخشش اور نجات کا ذریعہ بنادے۔ آمین۔

## عید نمبر، سالگرہ نمبر، قارئین سے سروے

اس شمارے کے ساتھ خواتین ڈائجسٹ کا ایک اور سال اختتام کو پہنچا۔ اپریل کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ یہ شمارہ عید سے پہلے آئے گا۔ اس لیے عید نمبر بھی ہوگا۔ اس بار سروے کے لیے ہم نے عید اور سالگرہ نمبر دونوں کے حوالے سے سوال کیے ہیں۔ سوالات یہ ہیں۔

1۔ چاند رات عید کے دن سے زیادہ بارونق اور بھرپور ہوتی ہے، آپ چاند دیکھ کر عید کے دن کے لیے کیا تیاریاں کرتی ہیں؟

2۔ وقت کے ساتھ ساتھ اقدار بھی بدلی ہیں کیا آپ کے ہاں اب بھی روایتی انداز میں عید منائی جاتی ہے؟ آپ آج کی اور بچپن کی عید میں کیا فرق محسوس کرتی ہیں؟

3۔ خواتین ڈائجسٹ سے پہلا تعارف کیسے اور کب ہوا؟ وقت کے ساتھ ساتھ آپ کی زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں، ان تبدیلیوں میں خواتین ڈائجسٹ کا ساتھ رہا؟

4۔ کبھی ایسا ہوا کہ کوئی کہانی شروع کی اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگئیں۔ ہانڈی جل کر راکھ ہوگئی۔ یا کوئی اور کام بگڑ گیا اور گھر والوں سے ڈانٹ کھانا پڑی؟

5۔ کوئی ایسی کہانی جس کے کرداروں اور ماحول میں آپ کو اپنی اور اپنے گھر والوں کی جھلک نظر آئی؟

## اس شمارے میں

☆ مالا...... نمرہ احمد کا مکمل ناول ☆ احد...... صوفیہ بٹ کا مکمل ناول

☆ رواوروش...... آسیہ رئیس خان کا مکمل ناول ☆ چاہا ہے تمہیں...... راشدہ رفعت کا مکمل ناول

☆ عارفہ فضل شاہ، راضیہ سید، فریحہ اشتیاق اور انیسہ عائشہ کے افسانے ☆ سدیعہ عمیر کا ناولٹ

☆ انگنا پھول کھلیں گے...... راحت جبیں کا ناول ☆ معروف مصنفہ سلمیٰ یاسمین نجمی سے ملاقات

☆ باتیں حریم فاروق سے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

# کرن کرن روشنی

ادارہ

## رمضان کی آمد پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان کی آخری تاریخ میں ہم لوگوں میں بیان فرمایا کہ

"اے لوگو! تمہارے اوپر ایک مہینہ آ رہا ہے جو بہت بڑا اور مبارک مہینہ ہے۔ اس میں ایک رات (شب قدر) ہے جو ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے روزے کو فرض فرمایا اور اس کے رات کے قیام (یعنی تراویح) کو ثواب کی چیز بنایا ہے جو شخص اس مہینہ میں کسی فرض کو ادا کرے، وہ ایسا ہے جیسا کہ غیر رمضان میں ستر فرض ادا کرے۔ یہ مہینہ صبر کا ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے اور یہ مہینہ لوگوں کے ساتھ غم خواری کرنے کا ہے۔ اس مہینہ میں مومن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے۔ جو شخص کسی روزہ دار کو روزہ افطار کرائے اس کے لیے گناہوں کے معاف ہونے اور آگ سے خلاصی کا سبب ہوگا، روزہ دار کے ثواب کی مانند اس کو ثواب ہوگا مگر اس روزہ دار کے ثواب میں سے کچھ کم نہیں کیا جائے گا۔ صحابہ نے عرض کیا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم میں سے ہر شخص تو اتنی وسعت نہیں رکھتا کہ روزہ دار کو افطار کرائے۔" تو آپ نے فرمایا کہ (پیٹ بھر کھلانے پر موقوف نہیں) "یہ ثواب تو اللہ تعالیٰ ایک کھجور سے کوئی افطار کرا دے یا ایک گھونٹ پانی پلا دے یا ایک گھونٹ کسی پلا دے اس پر بھی مرحمت فرما دیتا ہے۔

یہ ایسا مہینہ ہے کہ اس کا اول حصہ اللہ کی رحمت ہے، درمیانی حصہ مغفرت ہے اور آخری حصہ آگ سے آزادی ہے۔ جو شخص اس مہینے میں اپنے غلام (وخادم) کے بوجھ کو ہلکا کر دے، اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرماتا ہے اور آگ سے آزادی عطا فرماتا ہے اور اس میں چار چیزوں کی کثرت رکھا کرو، جن میں سے دو چیزوں سے تم اللہ کو راضی کرلو گے اور دو چیزیں ایسی ہیں کہ جن

سے تمہیں چارہ کار نہیں۔ وہ دو چیزیں جن سے تم اپنے رب کو راضی کرو گے۔ وہ کلمۂ شہادت اور استغفار کی کثرت ہے اور دوسری دو چیزیں یہ ہیں کہ جنت کی طلب کرو اور آگ سے پناہ مانگو۔ جو شخص کسی روزہ دار کو پانی پلائے، اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) میرے حوض سے اس کو ایسا پانی پلائے گا جس کے بعد جنت میں داخل ہونے تک اسے پیاس نہیں لگے گی۔"

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب ماہ رمضان قریب آ گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کے وقت مختصر بیان فرمایا جس میں ارشاد فرمایا "رمضان تمہارے سامنے آ گیا ہے اور تم اس کا استقبال کرنے والے ہو۔ غور سے سنو! رمضان کی پہلی رات میں ہی اہل قبلہ (مسلمانوں) میں سے ہر ایک کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔"

## روزے کی احتیاط

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "روزہ (دوزخ سے) ڈھال ہے۔ روزے میں فحش باتیں نہ کرے نہ جہالت کی باتیں۔ اگر کوئی آدمی اس سے لڑے یا گالی دے تو دو بارہ کہہ دے۔ میں روزہ دار ہوں۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ اللہ فرماتا ہے روزہ دار میرے لیے اپنا کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے اور اپنی خواہش ترک کر دیتا ہے۔ روزہ خاص میرے لیے ہے اور میں خود ہی اس کا بدلہ دوں گا اور ایک نیکی کے بدلے دس نیکیوں کا ثواب ملے گا۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جنت میں ایک دروازہ ہے جسے ریان کہتے ہیں۔ روزہ دار لوگ بہشت میں اس دروازے میں سے جائیں گے، روزے دار کے سوا اور کوئی اس میں سے نہ جائے گا۔ پکارا جائے گا روزے دار کہاں ہیں؟ وہ اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ان کے سوا اس میں سے کوئی نہ جائے گا، جب وہ جا چکیں گے تو یہ دروازہ بند کر دیا جائے گا کوئی اور اس میں نہ جا سکے گا۔"

## اللہ کی راہ میں خرچ کرنا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص اللہ کی راہ میں جوڑا (دو روپے یا دو کپڑے یا اور کوئی دو چیزیں) خرچ کرے گا، اسے (فرشتے) بہشت کے دروازوں سے پکاریں گے، اور اللہ کے بندے! یہ دروازہ اچھا ہے پھر جو نمازی ہوگا، وہ نماز کے دروازے سے بلایا جائے گا اور جو مجاہد ہوگا وہ جہاد کے دروازے سے بلایا جائے گا اور جو روزے دار ہوگا۔ وہ ریان کے دروازے سے بلایا جائے گا اور جو زکوٰۃ دینے والا ہوگا وہ زکوٰۃ کے دروازے سے بلایا جائے گا۔"

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر عرض کی "میرے ماں باپ آپ پر صدقے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر کوئی ان دروازوں میں سے کسی ایک دروازے سے بھی بلایا جائے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ لیکن کوئی ایسا بھی ہوگا جو ان سب دروازوں سے بلایا جائے گا؟"

آپ نے فرمایا "ہاں ایسے لوگ بھی ہوں گے اور مجھے امید ہے۔ تم ان لوگوں میں سے ہو گے۔"

## رمضان کی برکت

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے تحقیق، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب رمضان آتا ہے تو بہشت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب ماہ رمضان آتا ہے تو آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کیے جاتے ہیں اور شیطان زنجیروں میں جکڑ دیے جاتے ہیں۔"

## گناہوں کی بخشش

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو کوئی شب قدر میں ایمان رکھ کر ثواب کی نیت سے عبادت میں کھڑا ہو، اس کے سابقہ گناہ بخش دیے جائیں گے اور جو کوئی رمضان کے روزے ایمان کے ساتھ ثواب کی نیت سے رکھے۔ اس کے سابقہ گناہ بخش دیے جائیں گے۔"

## رمضان میں سخاوت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں سب دنوں سے زیادہ سخاوت کیا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب لوگوں سے زیادہ سخی تھے، بھلائی پہنچانے میں اور رمضان میں جب حضرت جبرائیل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتے رہتے تو آپ دوسرے دنوں سے زیادہ سخاوت کرتے تھے، جبرائیل علیہ السلام رمضان میں ہر رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا کرتے، رمضان گزرنے تک وہ آپ سے قرآن کا دور کیا کرتے تو جن دنوں میں جبرائیل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتے رہتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم چلتی ہوا سے بھی زیادہ بھلائی پہنچانے میں سخی ہوتے۔

## روزے میں احتیاط

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص جھوٹ بولنا اور دغا بازی کرنا نہ چھوڑے تو اللہ کو یہ احتیاج نہیں کہ کوئی اپنا کھانا پینا چھوڑے۔"

## سحری کی اذان

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم کھاتے پیتے رہا کرو یہاں تک کہ عبداللہ بن ام مکتوم اذان دیں۔ وہ اس وقت تک اذان نہیں دیتے جب تک صبح نہیں ہوتی، قاسم نے کہا بلال رضی اللہ عنہ اور ابن مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں کی اذان میں اتنا ہی فرق ہوتا کہ ایک اترتا اور ایک چڑھتا۔

## سحری اور فجر کی نماز میں فاصلہ

صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سحری کھائی پھر آپ صبح کی نماز کے لیے کھڑے ہوئے حضرت انس نے کہا۔

"میں نے پوچھا سحری میں اور صبح کی اذان میں کتنا فاصلہ ہوتا؟" انہوں نے کہا "پچاس آیتیں پڑھنے کے موافق۔"

## سحری کی برکت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سحری کھایا کرو، اس میں برکت ہوتی ہے۔" (ثواب ملتا ہے)

## روزے میں نہانا

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے روزے میں ایک کپڑا بھگو کر اپنے بدن پر ڈالا اور شعبی روزہ دار تھے اور حمام میں گئے اور ابن عباس نے کہا ہانڈی کا مزہ یا اور کسی چیز کا مزہ چکھنے میں کوئی حرج نہیں اور امام حسن بصری نے کہا کلی کرنا یا پانی سے اپنے آپ کو ٹھنڈا کرنا روزہ دار کو منع نہیں اور ابن مسعود نے کہا جب کوئی روزہ رکھنے والا ہو تو صبح کرے تیل لگایا ہوا، کنگھی کیا ہوا۔ اور انس نے کہا میرا ایک حوض ہے میں روزے میں اس میں غوطہ مارتا ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ روزے میں مسواک کیا کرتے اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ روزے میں صبح اور شام ہر وقت مسواک کیا کرتے اور روزہ دار تھوک نہ نگلے کہا اگر روزہ دار اپنا تھوک نگل گیا تو میں یہ نہیں کہتا کہ اس کا روزہ جاتا رہا اور ابن سیرین نے کہا کچی (تازہ گیلی) مسواک کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ لوگوں نے کہا اس میں تو مزہ ہوتا ہے انہوں نے کہا، مزہ تو پانی میں بھی ہوتا ہے حالانکہ روزے میں پانی سے کلی کرتے ہیں اور انس اور حسن اور ابراہیم نے کہا روزہ دار کو سر ما لگانا

درست ہے۔

## روزے میں بھول کر کھانا پینا

اگر روزہ دار ناک میں پانی ڈالے اور پانی حلق میں اتر آئے تو روزہ نہ جائے گا۔ اگر اس کو نکال نہ سکے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب بھولے سے کوئی شخص روزے میں کھا پی لے تو اپنا روزہ پورا کرے اللہ تعالیٰ نے اسے کھلایا پلایا۔"

## رمضان کے قضا روزے

عباس نے کہا کوئی حرج نہیں اگر قضا کے روزے لگاتار نہ رکھے جائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اتنا فرمایا۔ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرلو۔ اور سعید بن مسیب نے کہا ذی الحجہ کے دس نفل روزے اس کو رکھنا بہتر نہیں جس نے رمضان کی قضا نہ رکھی ہو اور ابراہیم نخعی نے کہا ایک رمضان کی قضا نہ رکھے اور دوسرا رمضان آ گیا تو دونوں کے روزے رکھے اور فدیہ اس پر واجب نہیں اور ابو ہریرہ سے مرسلاً اور ابن عباس سے مقبول ہے کہ وہ فقیروں کو کھانا بھی کھلائے اور اللہ نے اپنی کتاب میں تو کھانا کھلانے کا ذکر نہیں کیا اتنا ہی فرمایا کہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرلے۔

## حیض کا بیان

حیض والی عورت نماز نہ پڑھے نہ روزے رکھے اور ابوالدرداء نے کہا دین کی باتیں اور شریعت کے احکام میں بہت ایسا ہوتا ہے کہ رائے اور قیاس کے خلاف ہوتے ہیں اور مسلمانوں کے لیے ان کی پیروی کرنی ضروری ہے ان ہی میں سے ایک یہ حکم بھی ہے کہ حیض والی عورت روزے کی قضا کرے لیکن نماز کی قضا نہ کرے۔

## وارث روزے کی ادائیگی کرے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص مرجائے اور اس کے ذمہ روزے ہوں تو اس کا وارث اس کی طرف سے روزے رکھ لے۔"

## روزہ جلدی کھولنا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میری امت کے لوگ ہمیشہ اچھے رہیں گے جب تک روزہ جلد افطار کرتے رہیں گے۔"

## نماز تراویح کی فضیلت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے خبر دی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار درمیان رات کو (رمضان میں) نکلے اور مسجد میں تراویح) کی نماز پڑھی اور کچھ لوگوں نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پڑھی جب صبح ہوئی تو انہوں نے اس کا چرچا کیا۔ دوسری رات اس سے زیادہ لوگ جمع ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی اور کچھ لوگوں نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پڑھی جب صبح ہوئی تو انہوں نے اس کا چرچا کیا۔ دوسری رات اس سے زیادہ لوگ جمع ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی، صبح کو لوگوں نے (اور زیادہ) چرچا کیا اور تیسری شب کو بہت لوگ جمع ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم برآمد ہوئے اور نماز پڑھی لوگوں نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی جب چوتھی رات ہوئی تو اتنے لوگ جمع ہوگئے کہ مسجد میں ان کا سمانا مشکل ہوگیا (آپ برآمد ہی نہیں ہوئے) صبح کو نماز کے لیے نکلے اور نماز کے بعد لوگوں کی طرف مخاطب ہوئے پہلے تشہد پڑھا پھر فرمانے لگے "امابعد مجھے معلوم تھا کہ تم یہاں جمع ہو لیکن میں ڈرا۔ کہیں یہ نماز تم پر فرض نہ ہوجائے اور تم سے نہ ہوسکے۔" (اس لیے برآمد نہ ہوا) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی اور یہی کیفیت قائم رہی۔

## تراویح کی رکعت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں کتنی رکعتیں پڑھتے تھے؟" (تراویح یا تہجد کی) انہوں نے کہا" آپ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں اور غیر رمضان میں گیارہ رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے پہلے چار رکعتیں پڑھتے تھے، ان کی خوبی اور لمبائی کے متعلق کیا پوچھتا ہے، پھر چار پڑھتے تھے ان کی خوبی اور درازی کا کیا پوچھتا، پھر تین رکعتیں پڑھتے تھے، میں نے ایک بار آپ سے عرض کی" یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ وتر پڑھنے سے پہلے سوجاتے ہیں۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :" عائشہ! میری آنکھیں سوتی ہیں دل نہیں سوتا۔"

## شب قدر کی فضیلت

اور (سورۃ قدر میں) اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا" ہم نے قران کو شب قدر میں اتارا اور تو کیا جانے شب قدر کیا ہے۔ شب قدر ہزار مہینوں سے افضل ہے اس میں فرشتے اور روح اپنے مالک کے حکم سے ہر بات کا انتظام کرنے کو اترتے ہیں اور صبح تک یہ سلامتی کی رات قائم رہتی ہے۔

## مسواک کرنا

عامر بن ربیعہ سے منقول ہے انہوں نے کہا میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا بے شمار بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم روزہ دار رہ کر مسواک کیا کرتے تھے اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی" اگر میں یہ نہ سمجھتا کہ میری امت پر مشکل ہوگی تو میں انہیں ہر وضو کے ساتھ مسواک کا حکم دیتا۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے اس میں روزہ دار کو خاص نہیں کیا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی آپ نے فرمایا" مسواک منہ کو پاک کرتی ہے پروردگار کو پسند ہے۔"

## سفر میں روزہ رکھنا

حمزہ بن عمرو اسلمی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی" کیا میں سفر میں روزہ رکھوں؟" وہ روزے بہت رکھا کرتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" تیری مرضی" (روزہ رکھ یا افطار کر)

## قیامت کی نشانیاں

سیدنا حذیفہ بن اسید غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس آئے اور ہم باتیں کررہے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ" قیامت قائم نہ ہوگی جب تک کہ دس نشانیاں اس سے پہلے نہیں دیکھ لوگے۔ پھر ذکر کیا دھوئیں کا اور دجال کا اور زمین کے جانور کا اور سورج کے مغرب سے نکلنے کا اور عیسیٰ علیہ السلام کے اترنے کا اور یاجوج ماجوج کے نکلنے کا اور تین جگہ خسف ہونا یعنی زمین کا دھنسنا، ایک مشرق میں، دوسرے مغرب میں، تیسرے جزیرہ عرب میں۔ اور ان سب نشانیوں کے بعد ایک آگ پیدا ہوگی جو لوگوں کو یمن سے نکالے گی۔

## عراق کے اپنے درہم روک لینے کے متعلق

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"عراق کا ملک اپنے درہم اور قفیز کو روکے گا اور شام کا ملک اپنے مدی اور دینار کو روکے گا اور مصر کا ملک اپنے اردب اور دینار کو روکے گا اور تم ایسے ہوجاؤ گے جیسے پہلے تھے اور تم ایسے ہوجاؤ گے جیسے پہلے تھے اور تم ایسے ہوجاؤ گے جیسے پہلے تھے۔"

پھر سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا۔" اس حدیث پر ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کا گوشت اور خون گواہی دیتا ہے۔" (یعنی اس میں کچھ شک نہیں)

صحیح مسلم

www.pklibrary.com

# غزل

انشا جی

قربِ میسّر ہو تو یہ پوچھیں، درد ہو تم یا درماں ہو
دل میں تو آن بسے ہو لیکن مالک ہو یا مہماں ہو

دوری، آگ سے دوری بہتر، قرب کا انجام ہے راکھ
آگ کا کام فروزاں ہونا، راکھ ضرور پریشاں ہو

سودا، عشق کا سودا ہم نے جان کے جی کو لگایا ہے
عشق یہ صبر و سکون کا دشمن، پیدا ہو یا پنہاں ہو

عشق وہ آگ کہ جس میں تپ کر سونا کندن بنتا ہے
آگ میں تجھ کو کچھ نہیں ہو تو آ اس آگ میں بریاں ہو

شہر کہ دشت کہو بھئی سادھو، ہاں بھئی سادھو شہر کہ دشت
ہم بھی چاک گریباں ٹھہرے، تم بھی چاک گریباں ہو

# باتیں حریم فاروق سے

شاہین رشید

1 ''اصلی نام؟''

''حریم فاروق۔''

2 ''پیار کا نام؟''

''کوئی خاص نہیں۔ سب اپنی چاہت سے جو بلا لیتے ہیں مجھے اچھا لگتا ہے۔''

3 ''تاریخ پیدائش/شہر؟''

''26 مئی 1992ء/اسلام آباد ہے۔''

4 ''قد/ستارہ؟''

''5 فٹ 8 انچ۔''

5 ''بہن بھائی آپ کا نمبر؟''

''ایک چھوٹی بہن ہے۔ تو بڑی میں ہوں۔''

6 ''تعلیمی قابلیت؟''

''جرنلزم اور سوشیالوجی میں گریجویٹ ہوں۔''

7 ''آبائی شہر؟''

''نارووال۔''

8 ''شوبز میں آمد؟''

''شوقیہ آئی ہوں۔ کسی نے فورس نہیں کیا۔''

9 ''والدین کی کیا خواہش تھی؟''

''والدین دونوں ڈاکٹر ہیں۔ ظاہر ہے وہ یہی چاہتے تھے مگر میری خواہش شوبز میں آنا تھا۔''

10 ''کامیابی کی امید تھی؟''

''بالکل تھی۔ اتنا اعتماد تو تھا کہ کامیاب ہو جاؤں گی۔''

11 ''کب پریکٹیکل لائف میں آئیں؟''

''وہ تو ٹھیک طرح سے یاد نہیں۔ لیکن چودہ سال کی عمر میں کمائی کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ میں نے ایک این جی او کے ساتھ کام کیا تھا۔''

12 ''پہلی کمائی؟''

''تین ہزار۔ این جی او کے ساتھ کام کرنے پر ملے تھے۔''

13 ''شہرت کس ڈرامے نے دی؟''

''کافی ڈرامے ہیں۔ مگر میں ''میرے ہم دم میرے دوست'' کا نام لوں گی۔

14 ''دل میں جگہ بنانے کے لیے کیا ضروری ہے؟''

''اپنے کام سے کام رکھیں۔ دوسروں کے کام میں مداخلت نہ کریں۔''

15 ''آپ کی صبح کب ہوتی ہے اور رات کب ہوتی ہے؟''

''میں صبح تقریباً نو بجے تک اٹھ جاتی ہوں اور کوشش کرتی ہوں کہ رات کو بارہ ایک بجے تک سو جاؤں۔''

16 ''آپ کا روٹین ورک؟''

''صبح اٹھ کر گرین ٹی پیتی ہوں۔ گرین ٹی نہ پیوں تو صبح ادھوری لگتی ہے۔ پھر میں ''جم'' جاتی ہوں

اور پھر کام پر۔"

17 "کس تہوار کا انتظار رہتا ہے؟"

"عید کا...... کیونکہ عید کے دن سب لوگ ایک ہی گھر میں ہوتے ہیں تو اچھا لگتا ہے۔ ملاقات ہو جاتی ہے سب سے۔"

18 "نفس کا راز؟"

"میں جم جاتی ہوں۔ اپنی ڈائیٹ کا خیال رکھتی ہوں۔"

19 "شدید بھوک میں کیفیت؟"

"دماغ آؤٹ ہونے لگتا ہے۔ کام کے دوران برداشت کر لیتی ہوں بھوک کو۔ مگر عام حالات میں نہیں۔ دماغ گھومنا شروع ہو جاتا ہے۔"

20 "کس طرح کی خوراک کھاتی ہیں؟"

"صحت مند خوراک کھاتی ہوں تاکہ جسم میں طاقت رہے۔ میں ہر دم فٹ رہنا چاہتی ہوں۔"

21 "دوستیاں یا رشتے داریاں کیا پسند ہیں؟"

"دونوں۔ میں ایک فیملی اور ریلیٹڈ شخصیت ہوں۔ مجھے مل جل کر رہنا اور تعلقات بنانا بہت اچھا لگتا ہے۔ آبشاریں، نہریں، قدرتی مناظر مجھے بہت پسند ہیں۔"

22 "سات دنوں میں کون سا دن اچھا لگتا ہے؟"

"چھٹی کا دن۔ خوب آرام کرتی ہوں۔"

23 "نیچر سے آپ کا لگاؤ؟"

"بہت زیادہ ہے۔ جب تھک جاتی ہوں تو سمندر پہ جانا پہاڑوں پہ جانا بہت اچھا لگتا ہے۔ آبشاریں، نہریں، قدرتی مناظر مجھے بہت پسند ہیں۔"

24 "بہت خوش ہوتی ہیں تو کیا کرتی ہیں؟"

"ہلہ گلہ۔ ناچ گانا۔ یہی میرا اظہار ہے۔"

25 "طبیعت میں ضد ہے؟"

"ہے بالکل ہے مگر بہت زیادہ نہیں۔ لیکن میری ضد پوزیٹو ہوتی ہے یعنی کچھ کرنے کی ضد ہوتی ہے۔ بلاوجہ کی نہیں۔"

26 "ملک میں ترقی کیسے ہو سکتی ہے؟"

"جب ہم اپنی سوچ کو بدلیں گے اور خود ٹھیک ہونے کی ٹھان لیں گے۔"

27 "غصہ کب آتا ہے؟"

"جب کوئی میرے منہ پر جھوٹ بولتا ہے۔"

28 "رونا کب آتا ہے؟"

"جب غصے میں ہوتی ہوں۔ تب رونا آتا ہے۔ پتا نہیں کیوں۔"

29 "مرد حضرات میں کیا خوبیاں دیکھنا چاہتی ہیں؟"

"دوسروں پر بھروسہ کریں۔ سچے اور کھرے انسان ہوں۔"

30 "بخشی نہیں ہیں؟"

"اگر راہ چلتے کوئی جملہ کس دے یا گھورے تو۔"

31 "کس کی ناراضی سے ڈر لگتا تھا؟"

"گھر والوں کی، خصوصاً والدین کی۔"

32 "پرائز بانڈ سے لگاؤ؟"

"نہیں لگاؤ نہیں ہے۔ کبھی لیے بھی نہیں۔ مگر سنا ہے کہ نکلتے ہیں۔ ان شاء اللہ کبھی قسمت آزماؤں گی۔"

33 "وقت سے پہلے نصیب سے زیادہ نہیں۔ کیا کہیں گی؟"

"بالکل مگر مجھے سب کچھ وقت سے پہلے اور نصیب سے زیادہ ملا ہے۔ اتنی میری اوقات نہیں جتنا اللہ نے اپنے کرم سے مجھے نواز دیا ہے۔"

34 "پرسنل یا جوائنٹ اکاؤنٹ کیا پسند ہے؟"

"پرسنل...... اکاؤنٹ اپنا اپنا۔"

35 "شاپنگ کرنا پسند ہے؟"

"بہت زیادہ...... شاپنگ کرنا میری کمزوری ہے۔"

36 "زندگی کے کیا اصول ہونے چاہئیں؟"

"زندگی گزارنے کے بھی کچھ اصول ہونے چاہئیں۔ اس نعمت کو ہنسی خوشی گزاریں۔ حسد جلن سے

زندگی کو برباد نہ کریں۔"

37 "پیسہ خرچ کرتے وقت کیا سوچتی ہیں؟"

"سوچتی ہی تو نہیں ہوں۔ یہی تو میرا مسئلہ ہے پھر خرچ کر کے سوچتی ہوں کہ کیسے اتنا خرچ ہو گیا۔"

38 "کبھی غربت میں وقت گزارا؟"

"بالکل گزارا ہے۔ اور برے وقت میں سوچ لیا تھا کہ کچھ بن کے دکھانا ہے۔ اور اللہ نے کامیاب کیا۔"

39 "کسی کو دینے کے لیے بہترین تحفہ؟"

"دوسروں کا دل خوش کرنا ..... انہیں عزت دینا۔"

40 "موڈ اچھا ہو جاتا ہے؟"

"کسی ایک بات سے نہیں۔ کئی باتوں سے موڈ اچھا ہو جاتا ہے۔"

41 "زندگی کا سب سے مشکل کام؟"

"نیند سے بیدار ہونا مجھے مشکل ترین کام لگتا ہے۔ مگر پھر اٹھ ہی جاتی ہوں۔"

42 "اچانک سے بیدار ہونا پڑ جائے تو؟"

"مت پوچھیں کیا حالت ہوتی ہے۔ میں اپنے آپ کو الرٹ کرنے کے لیے الارم ضرور لگاتی ہوں۔"

43 "مخلص کون ہوتے ہیں اپنے یا پرائے؟"

"آزمانے سے ہی اندازہ ہوتا ہے۔ کبھی اپنے بہت مخلص ہو جاتے ہیں تو کبھی پرائے۔ سچوایشن پر بھی منحصر ہے۔"

44 "پسندیدہ لباس؟"

"ہر وہ لباس جو آرام دے۔"

45 "حسن یا ذہانت؟ کیا کہیں گی؟"

"ذہانت بہت ضروری ہے۔ حسن ایک اضافی خوبی ہے۔"

46 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"

"صرف اور صرف اپنے کمرے میں۔"

47 "کس کام میں آپ بہت سست ہیں؟"

"ایس ایم ایس کے جواب دینے میں۔ ہاں اگر کوئی ضروری بات ہو تو پھر جلدی جواب دے دیتی ہوں۔"

48 "فرصت کے اوقات میں کیا کرتی ہیں؟"

"کتاب پڑھ لیتی ہوں یا پھر ٹی وی کا کوئی پروگرام دیکھ لیتی ہوں۔ یا پھر اپنے ادھورے کام کر لیتی ہوں۔"

49 "مہمان کیسے لگتے ہیں؟"

"اچھے لگتے ہیں۔ اچانک بھی آ جائیں تب بھی خوش دلی سے ویلکم کرتی ہوں۔"

50 "کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟"

"جوتے کپڑے، جیولری اور جیولری میں انگوٹھیاں بہت پسند ہیں۔ خاصا ذخیرہ ہے میرے پاس۔"

51 "لوگوں کی ایک بات جو بری لگتی ہے؟"

"کہ فیلڈ کو چھوڑ دو۔ کیوں بھئی۔"

52 "کون سا دور بہت یاد آتا ہے؟"

"ہر گزرنے والا۔ کیونکہ جس دور میں ہم جی رہے ہوتے ہیں وہ برا لگ رہا ہوتا ہے اور جو گزار چکے ہوتے ہیں وہ اچھا لگ رہا ہوتا ہے۔"

53 ''وقت کی پابندی کی کتنی قائل ہیں؟''
''کام کے معاملے میں بہت پابند ہوں۔''
54 ''خرچ کرنا فضول خرچی ہے کیا؟''
''اگر اپنوں پر۔ اپنے دوستوں پر اور اپنی ذات پر خرچ ہو رہا ہے تو یہ فضول خرچی نہیں ہے۔''
55 ''محنت کا صلہ نہ ملے تو؟''
''تو پہلے اپنے اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں..... اور پھر اپنے آپ کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرتی ہوں۔''
56 ''اپنی کمائی سے قیمتی چیز کیا خریدی؟''
''اب تو یاد نہیں۔ کافی ٹائم سے کما رہی ہوں۔ اور بہت کچھ خرید بھی چکی ہوں۔''
57 ''گھر میں کھانے کے لیے آپ کی پسندیدہ جگہ؟''
''مجھے زمین پر بیٹھ کر کھانے کا مزہ آتا ہے۔''
58 ''پاکستان کے کس شہر کے کھانے مزے کے ہوتے ہیں؟''
''لاہور کے کھانے بہت مزے کے ہوتے ہیں۔ لاہور کی فوڈ اسٹریٹ کی تو کیا ہی بات ہے۔''
59 ''کھانے کا مزہ چھری کا ٹا یا ہاتھ سے؟''
''ہاتھ سے کھانے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔''
60 ''سوشل میڈیا سے دلچسپی؟''
''کوئی خاص نہیں۔''
61 ''کس طرح کے کھانے پسند ہیں؟''
''ہر طرح کے۔ مجھے کھانوں میں تجربات کرنے کا شوق ہے۔ اس لیے ہر کھانا آزماتی ہوں۔''
62 ''فیلڈ میں آ کر کیا سیکھا؟''
''کہ ڈرنا نہیں چاہیے۔ عورت بھی اتنی ہی مضبوط ہے جتنا مرد۔ مردوں کی طرح عورت بھی ہر کام کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔''
63 ''نرم گوشہ کس میں ہوتا ہے؟''
''میرے خیال میں دونوں میں نرم گوشہ ہوتا ہے مرد میں بھی اور عورت میں بھی۔''
64 ''کن مکوڑوں سے ڈر لگتا ہے؟''
''اڑتے ہوئے لال بیگ سے بہت ڈر لگتا ہے۔''
65 ''شادی کی پسندیدہ رسمیں؟''
''مہندی میری پسندیدہ رسم ہے۔''
66 ''شادی میں کیش دینا چاہیے یا تحفہ؟''
''یہ تو لڑکی/لڑکے والوں کی پوزیشن پر منحصر ہے۔''
67 ''ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟''
''امی کے ہاتھ کا۔''
68 ''موبائل نمبر کتنی بار تبدیل کیا؟''
''کئی سالوں سے ایک ہی نمبر چلا آ رہا ہے۔''
69 ''ہر وقت خوفزدہ رہتی ہوں؟''
''اپنوں کو کھونے سے۔''
70 ''آپ کے بیگ میں کیا کیا ہوتا ہے؟''
''دنیا جہاں کی چیزیں ہوتی ہیں میرے بیگ میں۔''
71 ''شہرت مسئلہ بنی؟''
''نہیں..... بلکہ جب لوگ پہچان لیتے ہیں۔ تو ایک انجانی سی خوشی ہوتی ہے۔''
72 ''فیلڈ میں آمد پیسہ/شہرت یا شوق؟''
''شوق .....اور اچھے کردار کر کے لوگوں کو پوزیٹو سوچ دینا بھی میرا مقصد ہے۔''
73 ''لوگ ملتے ہیں تو کیا کہتے ہیں؟''
''سیلفی کی فرمائش کرتے ہیں۔''
74 ''اگر آپ سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو؟''
''تو اعتراف کر کے سوری کر لیتی ہوں۔''
75 ''دل یا دماغ کس کی بات مانتی ہیں؟''
''میں تو دل کی ہی مانتی ہوں۔ لوگ کہتے ہیں دماغ کا فیصلہ ٹھیک ہوتا ہے۔''
76 ''بچپن کی کیا چیز آج تک محفوظ ہے؟''
''ڈرامنگ سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ ہی کچھ محفوظ ہے۔''
77 ''غصے میں کیفیت؟''
''کھانا پینا چھوڑ دیتی ہوں۔ بھوک ہی نہیں لگتی۔''

78 "غصے میں پہلا لفظ؟"
"یار......"
79 "ا کی خوب صورت تخلیق؟"
"ہر چیز...... پوری کائنات بہت خوب صورت ہے۔"
80 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا رکھتی ہیں؟"
"بہت کچھ...... لیکن پانی اور فون لازمی رکھتی ہوں۔"
81 "کھانے کی ٹیبل پہ کیا نہ ہو تو کھانے کا مزہ نہیں آتا؟"
"بس کھانا اچھا اور لذیذ ہونا چاہیے۔"
82 "پیسہ حاصل کرنے کے لیے کیا ضروری ہے؟"
"محنت، جدوجہد اور پھر فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیں کہ وہ آپ کو کب اور کیسے صلہ دیتا ہے۔"
83 "زندگی کب بدل جاتی ہے؟"
"میرے خیال میں زندگی ہر دم بدلتی رہتی ہے۔"
84 "جھوٹ کا سہارا کب لیتی ہیں؟"
"میں چھوٹے چھوٹے معصومانہ جھوٹ بولتی ہوں۔ بڑے جھوٹ سے ڈرتی ہوں اور بہت مجبوری میں جھوٹ کا سہارا لیتی ہوں۔"
85 "اپنے آپ کو کب فریش محسوس کرتی ہیں؟"
"جب سارا دن کی تھکی ہاری گھر آتی ہوں تو گھر میں داخل ہوتے ہی تھکن دور ہو جاتی ہے۔"
86 "دنیا کا کون سا مسئلہ اب حل ہو جانا چاہیے؟"
"امن کا...... بہت افراتفری دیکھ لی اب سکون ہو جانا چاہیے۔"
87 "پسندیدہ مشروب؟"
"گرین ٹی۔"
88 "دنیا میں کیا تبدیلی لانا چاہتی ہیں؟"
"دنیا میں تو خیر نہیں...... بس فیلڈ میں تبدیلی لانا چاہتی ہوں۔"
89 "کہاں کنجوسی نہیں کرتیں؟"
"اگر کوئی اللہ کے نام پر مانگے تو۔"
90 "کس ملک کے لیے کہتی ہیں کہ کاش یہ ہمارا ہوتا؟"
"کسی کے لیے نہیں...... کیونکہ اپنا ملک بہت اچھا ہے۔"
91 "منیر نیازی کا یہ مصرعہ آپ پر فٹ آتا ہے کیا کہ "ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں؟"
"بالکل فٹ آتا ہے۔ کیونکہ میں تھوڑی سست طبیعت ہوں۔ اکثر لیٹ ہو جاتی ہوں۔"
93 "اچانک لائٹ چلی جائے تو منہ سے کیا نکلتا ہے؟"
"شٹ یار۔"
94 "اگر آپ کی شہرت کو زوال آ جائے تو؟"
"اللہ مالک ہے۔ تو ہر عروج کو زوال ہے اور ہر زوال کو عروج ہے۔"

# سلمیٰ یاسمین نجمی سے مُلاقات

شاہین رشید

اردو ادب کا دامن بہت وسیع ہے۔ بے شمار لوگوں نے ادب کی مختلف اصناف میں اپنے جوہر دکھائے۔ شاعر افسانہ نگار، ناول نگاری میں بڑے بڑے نام نظر آتے ہیں اور ان ناموں میں اضافہ ہورہا ہے۔ اچھی شاعری بھی کی جارہی ہے اور نثر میں بھی ناول اور افسانے لکھے جارہے ہیں لیکن مزاح کی صنف میں دیکھیں تو چند ہی نام نظر آتے ہیں جنہیں انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مزاح نگاری آسان کام نہیں اچھا مزاح لکھنے کے لیے غیر معمولی ذکاوت، ذہانت اور حسِ لطیف کے ساتھ ساتھ ایک خاص تہذیبی تربیت بھی ضروری ہے۔ ذرا سی پٹڑی سے ادھر ادھر ہوجائیں تو مزاح پھکوپن میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

آج ہم آپ کی ملاقات جس ہستی سے کروارہے ہیں۔ انہیں قدرت نے دل کھول کر نوازا ہے۔ انہوں نے ناول بھی لکھے، افسانہ نگاری بھی کی مزاح کے میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے اور ہر میدان میں اپنی انفرادیت کو منوایا اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بے شمار شخصی خوبیوں سے بھی نوازا ہے۔

بوئے گل سے لے کر سانجھ بھئی چودیس تک سلمیٰ یاسمین نجمی کا سفر بہت طویل ہے۔ اس سفر میں وہ مسلسل آگے بڑھی ہیں۔ اور ان کی حیرت انگیز صلاحیتیں سامنے آئی ہیں۔ میں ہمیشہ سلمیٰ یاسمین نجمی سے کہتی ہوں۔ سلمیٰ آپ اپنی سوانح لکھیں۔ مجھے یقین ہے کہ سلمیٰ کا یہ انٹرویو پڑھ کر قارئین بھی میری تائید کریں گے۔

آیئے آپ کو سلمیٰ یاسمین نجمی سے ملواتے ہیں۔

''کیا حال ہیں آپ کے؟''

''الحمدللہ۔''

''کچھ اپنے بارے میں بتائیے؟''

''امتل کا فون آیا کہ ہم آپ کا انٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔ میں حیران رہ گئی۔ میرا انٹرویو؟ وہ کس خوشی میں بھئی۔ نہ میں کوئی بڑی لکھاری ہوں نہ ہی آپ کے رسالے میں لکھتی ہوں۔ (سلمیٰ بے شک خاص طور پر آپ ہمارے رسالے میں نہیں لکھتیں۔ لیکن آپ کی کافی تحریریں ہمارے پرچوں میں شائع ہوئی ہیں ہماری قارئین کے لیے آپ اجنبی نہیں ہیں)

جواب آیا انٹرویو تو ہوگا۔ پھر امتل نے میرے بارے میں جو کہا وہ میری نظر میں کسی حد تک مبالغہ آرائی تھی۔ سو اس کا ذکر کیا کروں (سلمیٰ جی! سچ تو یہ ہے کہ یہ آپ کی منکسر المزاجی ہے ورنہ آپ کی صلاحیتوں اور خوبیوں کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے)

شاہین رشید نے دلاسا دیا کہ کسی میں کوئی خاص بات ہوتی ہے تو انٹرویو کیا جاتا ہے اور وہ خاص بات لگتا تھا کہ ان کے علم میں بھی نہیں تھی اور اتفاق سے میرے علم بھی نہیں تھی۔ بس امت الصبور کا اصرار نما حکم تھا جس کے سامنے ہم دونوں نے سر جھکا دیا۔ حکم حاکم ''مرگ مفاجات'' ہوا کرتا ہے۔ حاکم کے سامنے تو یہ سر شاید کبھی نہ جھکتا لیکن دوستوں کے لیے تو بندہ جان بھی لٹا سکتا ہے۔ اب آتے ہیں آپ کے سوالوں کی طرف۔''

"آپ کا نام طویل ہے؟"

"آپ میرے نام کی طوالت جاننا چاہ رہی ہیں تو نام کا پہلا حصہ "سلمیٰ" ہے۔ ہر پیدا ہونے والے کو ایک نام تو دیا ہی جاتا ہے سو ہمیں بھی ایک نام عنایت ہوا۔ اکثر پہلا نام خاندان کے بزرگ رکھتے ہیں۔ اب ماں کا دل بھی چاہتا ہوگا کہ وہ اپنی پسند سے نام رکھے چنانچہ ماں نے یاسمین کا لاحقہ لگا دیا۔ اب باری آئی ہماری۔

نو سال کی عمر میں، میں نے پہلی کہانی لکھی "ننھا مجاہد" اسے بچوں کے رسالے میں بھیجنے سے پہلے یہ گمان ہوا کہ شاید ہم بڑے ادیب بننے والے ہیں تو ایک فلمی نام بھی ہونا چاہیے۔ چنانچہ اپنے والد کا نام جو کہ "نجمی" تھا اس کا بھی اضافہ کر دیا اور یہ نام ان کا بھی نہیں تھا، یہ نام ان کو میری خالہ نے دیا تھا۔ اس زمانے میں وہ ناول بڑے شوق سے پڑھتی تھیں تو کسی رائٹر کے نام میں "نجمی" بھی تھا چنانچہ انہوں نے اپنے پیارے بہنوئی کو "نجمی" نام سے پکارنا شروع کر دیا تو یہی نام مشہور ہو گیا تو انہیں وہ ہیرو کی طرح لگے ہوں گے اور وہ تھے بھی ہیرو کی طرح۔

س: "اپنی مصروفیت کے بارے میں بتائیں؟"

"آپ نے میری مصروفیات کے بارے میں پوچھا تو اس کے لیے سوچنا پڑے گا کہ میں اپنی ذاتی باتیں بتاؤں، یا نہ بتاؤں اور سنی ان سنی کر دوں۔ پھر سوچتی ہوں کہ کیا فرق پڑتا ہے میں کون سی کسی ملک کی وزیر اعظم ہوں یا خفیہ ادارے کی سربراہ۔

تو جواب یہ ہے کہ میں صبح بہت ہی اطمینان کے ساتھ دس بجے اٹھتی ہوں۔ کبھی اپنا درس ریکارڈ کرتی ہوں جو مجھے ہر منگل کو "درس کے گروپ" میں بھیجنا ہوتا ہے، جمعہ کو اقبال کی اردو نظموں کی تشریح ریکارڈ کر کے "اقبال کے گروپ" میں بھجوانی ہوں۔ ایلیس کی مجلس شوریٰ ختم ہونے والی ہے علامہ اقبال کی فارسی کی کتاب "ارمغان حجاز" اس کی چند رباعیاں بھجوانی ہوں۔

آج کل ہم "حضور رسالت" کر رہے ہیں ان پر گفتگو جمعرات اور پیر کے دن "گفت و شنید" گروپ میں گفتگو ہوتی ہے، سب پڑھنے والے اس میں حصہ لے سکتے ہیں۔ بارہ بجے میں ناشتا کرتی ہوں۔ کچھ وقت مل جائے تو ماہنامہ "عفت" کی ادارت کی جو ذمہ داری مجھے سونپی گئی ہے اس کے لیے کام کرتی ہوں۔ دراصل "عفت" میگزین کے منیجر بھی ہم ہیں پروف ریڈر بھی، کلرک بھی اور چوکیدار بھی۔

ہفتے کو میری معاونین آتی ہیں، ان کے ساتھ مل کر پرچے کے کام نمٹائے جاتے ہیں۔ اور جو وقت بچ جائے اور دل چاہے تو اس میں لکھنے لکھانے کا کام بھی کرتی ہوں۔"

س: "آپ نے لکھنا اتنا کم کیوں کر دیا؟"

"آپ نے کہا لکھنے کا کام میں نے کم کر دیا ہے تو بھئی "زود نویس" تو میں پہلے بھی نہیں تھی اور میں کوئی بہت بڑی ادیب تو نہیں ہوں جس کا اوڑھنا بچھونا لکھنا لکھانا ہوتا ہے میرا اوڑھنا کچھ اور ہے اور بچھونا کچھ اور یہ تو فرصت کے مشاغل ہیں اور "فرصت محال ہے قدرت کے کارخانے میں" نہ جانے اجمل کو یہ غلط فہمی کیوں ہوگئی کہ میں افسانہ نگار یا ناول نگار ہوں۔"

آپ میرے بہن بھائیوں اور میرے بچوں کے بارے میں بھی جاننا چاہتی ہیں تو میں نہیں سمجھتی کہ لوگوں کو اس سے کوئی دلچسپی ہوگی یا ہونی ہے۔ شاید میرے ادبی بچوں یعنی میری تحریروں سے ہو اور نہ بھی ہو تو میں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا۔ لکھا اور ادب کے دریا میں ڈال دیا اب آگے دریا جانے اور ادبی مچھیرے جانیں۔"

"آپ کا تعلق کہاں سے ہے اور پرورش کہاں پائی؟"

"پیدا میں دلی میں ہوئی تھی۔ لیکن بچپن اور لڑکپن پنجاب یعنی سیالکوٹ میں گزارا۔ والدہ کا تعلق مظفر نگر "یوپی" سے تھا وہ جماعت اسلامی کی پہلی رکن خاتون تھیں۔ "خرم جاہ مراد" ان کے سگے خالہ زاد

بھائی تھے۔ بعد میں وہ جماعت کی حلقہ خواتین کی قیمہ (قیم سے قیمہ) بھی رہیں۔ لکھتی بھی تھیں اور بہت اچھا لکھتی تھیں۔ کاش میں ان کے جیسا لکھ سکتی ان کا نام "نیر بانو" تھا اور ان ہی کے زیر سایہ پروان چڑھنے کی وجہ سے کچھ جراثیم مجھ میں بھی سرائیت کر گئے۔

کچھ انہوں نے حوصلہ افزائی کی، کچھ میری استاد محترمہ حمیدہ بیگم نے جو حلقہ خواتین کی پہلی قیمہ تھیں میری حوصلہ افزائی کی۔ انہوں نے ماہنامہ "بتول" کی ادارت میرے سپرد کی تھی ان سے ہی ادارت کے گر میں نے سیکھے۔ اٹھائیس سال میں "بتول" کی مدیرہ رہی پھر "عفت" کی۔

"س: کچھ اپنی تعلیم کے بارے میں بتائیں؟"

"میری تعلیم کا کیا پوچھتی ہیں۔ بامشکل بی اے کیا ہی تھا کہ میری شادی ہوگئی۔ شادی کے بعد رزلٹ آیا۔ بہن بھائیوں کو تاکید کردی تھی کہ اگر فیل ہوگئی یا سپلی آگئی تو ہرگز نہ بتانا۔ کہیں سسرال میں بے عزتی نہ ہوجائے۔ بہرحال اللہ نے عزت رکھ لی۔ یہ اور بات ہے کہ بی اے پاس کے ناول "سانجھ بھئی چودیس" پر بھارت میں ایک پروفیسر صاحبہ عنبرین فاطمہ نے پی ایچ ڈی کرلی اور وہ مقالہ جب مجھ تک پہنچا تو میں بڑی حیران ہوئی کہ اس ناول میں کیا تھا اور کیا محرکات تھے کہ محترمہ نے پی ایچ ڈی کیا۔

پھر مجھ پر انکشاف ہوا کہ اس ناول میں کیا تھا۔ سماجی شعور اور تہذیبی روایات اور نہ جانے کیا کیا کہ جس پر عنبرین صاحبہ نے لکھ ڈالا۔ بہرحال عنبرین صاحبہ کا شکریہ کہ اس لاعلم اور بے خبر پر وہ کچھ منکشف کیا جو پہلے معلوم نہ تھا۔ خاصا مشکل مقالہ تھا کچھ سمجھ میں آیا کچھ سر سے گزر گیا۔

"س: بچپن کیسا گزرا؟"

"اب آپ نے پوچھا کہ بچپن کیسا گزرا...... تو بچپن تو اچھا ہی ہوتا ہے خواہ گھرانہ مڈل کلاس ہو یا دولت مند...... پارٹیشن کے بعد خاندان لٹ لٹا کر پاکستان آیا صرف تن کے تین کپڑوں کے ساتھ کہ والد پولیس میں تھے۔ وہ ایک سال کے بعد آئے ہم نانا کے پاس کوئٹہ میں رہے وہیں "پہلی جماعت میں" داخل ہوئی۔"

جب ابا نے پاکستان کا انتخاب کیا تو ان کی پہلی نوکری سیالکوٹ میں لگی اور پھر ہم سب سیالکوٹ چلے گئے۔ پڑھاکو تو میں شروع سے تھی چار سال کی عمر میں پڑھنے لگی تھی اور چونکہ گھر میں بڑی تھی تو امی کی ساری توجہ مجھ پر ہی تھی تو آج جب میں چار سال کے بچوں کو دیکھتی ہوں، جو ABCD اور الف ب ج ہی پڑھ رہے ہوتے ہیں تو بڑی حیرت ہوتی ہے۔ اپنے بچوں سے بھی یہی توقع تھی مگر یہ ناکام ہوگئی۔

سب سے بڑی تھی تو چھوٹے بہن بھائیوں پر رعب بھی جمائی تھی، وہ ہی تو میری "رعیت" تھے سو وہ رعب ہمیشہ قائم رہا۔ پھر "بہو" بھی بڑی بنی اور یہ بڑائی قائم و دائم رہی۔

بچپن میں بہت شوخ و شنگ تھی۔ والدہ جتنی سنجیدہ تھیں، میں اتنی ہی باتونی تھی۔ اور ہاں کہہ سکتے ہیں کہ کسی حد تک لڑاکا بھی تھی تو بھئی دوسروں کے حقوق کی خاطر لڑنا تو چاہیے ہی تھا اور یہ لڑائی یا تو زبان سے لڑی یا پھر قلم سے۔ تلوار نہیں اٹھائی۔

والدہ کو بھی مطالعہ کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ گھر میں سارے ادبی رسالے آتے تھے۔ ان میں رسالہ "عصمت" بھی شامل تھا۔ ہر چیز پڑھنے کی اجازت نہیں تھی مگر جن ادیبوں کو یا ان کی غیر ممنوعہ نگارشات پڑھنے کی اجازت تھی، وہ سب پڑھنے کی کوشش کی۔

کالج تک پہنچے تو پھر انگریزی ادب کی چاٹ لگ گئی۔ لکھنا لکھانا بھی شروع کردیا تھا۔ سگھڑ بالکل نہیں تھی۔ اماں کی دس انگلیوں میں دس چراغ جلتے تھے مگر ہماری تو کسی ایک انگلی میں بھی نہ جل سکا، اماں نے بہت کوشش کی کہ سینا پرونا آجائے یا کچھ پکانا ہی آجائے۔ مگر کہاں صاحب اگر ایک ہاتھ میں کتاب

ہوتی بھی تو دوسری میں ڈوئی (چمچہ) تو خود سوچیے کہ ہانڈی پر کیا گزرتی ہوگی۔

تو جناب، کھانا پکانا شادی کے بعد ہی سیکھا بلکہ سیکھنا پڑا اور اچھا خاصا سیکھ لیا۔ ابھی تک کسی نے برائی نہیں کی۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ بچپن بہت اچھا اور مزے کا گزرا۔ ابا کے لاڈ، والدہ کی ڈانٹ، سہیلیوں کی محبت اور اساتذہ کی کرم فرمائی۔

کالج کی بیسٹ ڈبیٹر بھی تھی۔ افسانہ نگار بھی تھی۔ سوائے گیمز کے ہر ایکٹیویٹی میں حصہ لیا۔ مزے کا وقت گزرا۔ اگر چالاک نہیں تھی تو سیدھی سادی بھی نہیں تھی۔"

"وہ دور گڑیوں کا بھی تھا، آپ نے گڑیاں کھیلیں؟"

"جی..... بالکل کھیلیں۔ ان کی شادیاں بھی کیں۔ اماں بہت اچھی گڑیا بناتی تھیں۔ بھائی بھی ساتھ کھیلتا تھا۔ وہ تو گڑیوں کے کپڑے بھی سی لیتا تھا۔ وہ ہم دو بہنوں کے درمیان میں تھا۔ شاید اس لیے اس میں لڑکی پن سرائیت کر گیا تھا۔ لڑکوں کے کھیل کبھی نہیں کھیلے میں نے، آنکھ مچولی، اونچ نیچ، رسی کودنے کا بھی بہت شوق تھا۔ چھوٹے موٹے ڈرامے گھر میں ہم لوگ اسٹیج کر لیا کرتے تھے اور محلے کے بچوں کو ایک ایک پیسہ یا دو دو پیسے لے کر ڈرامہ دکھا بھی دیا کرتے تھے۔ مشاعرے بھی کیے۔

ابا پولیس انسپکٹر تھے مگر رشوت کا پیسہ گھر میں نہیں آنے دیتے تھے۔ حق حلال کی کمائی میں عیش نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا ایک نظم وضبط کی زندگی تھی۔ ہر چیز ملتی بھی مگر نپی تلی اور حصے کے مطابق۔ اماں بہترین منتظم تھیں سلیقہ شعار تھیں۔ ہاں کھانا پیٹ بھر کر کھلایا۔ ایک وقت دال اور ایک وقت گوشت۔ موسم کے پھل بھی کبھار، گاجر مولی ہر وقت میسر ہوتے تھے۔

مہمان آتے تو مرغ بھی پکتا۔ پلاؤ اور قورمہ بھی بنتا تھا تو اس میں سے حصہ مل جاتا تھا۔ والدین نے ہمیشہ قناعت سکھائی۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم کبھی بیمار ہی نہیں ہوئے سوائے ان بیماریوں کے جو بچپن میں سب بچوں کو ہو جاتی ہیں۔ وہ خود بھی حکیم تھیں انہوں نے "حکیم اجمل خان" کے مدرسے سے پڑھا ہوا تھا (حکمت) اور وہاں پڑھایا بھی تھا اس لیے ابا میری والدہ کو "حکیم جی" کہہ کر پکارتے تھے۔

اس زمانے میں جو بھی بچت ہوتی بھی ہوگی تو وہ رسالوں اور کتابوں پہ خرچ ہوتی ہوگی، ہمارے پاس تو نہ ایرانی قالین تھے اور نہ ہی فرنچ صوفے، ہاں کتابیں ہر قسم کی تھیں۔ چارپائیاں وہ خود بُن لیتی تھیں۔ لحاف بھی سی لیتی تھیں اور ہر طرح کا ڈیزائن بھی بنا لیتی تھیں۔

ہمیں سردیوں میں ایک بار پائے، حلیم، گاجر کا حلوہ اور انڈوں کا حلوہ ضرور کھلاتی تھیں۔ مکئی کی روٹی، لہسن کی چٹنی کے ساتھ جو اصلی گھی میں بھگاری جاتی تھی کھاتے تھے اور یہ میرے ابا کی پسندیدہ ڈش تھی۔ ہمارے یہاں "ڈالڈا" بھی نہیں آیا تھا۔

ہندوستان میں میرے والد کی زمین داری تھی اور اورنگ زیب عالمگیر کے وقت میں، انہوں نے دلی کے نواح میں بہت زمین دی تھی کہ بیٹھ کر تبلیغ دین کریں۔ "امیر خرم اللہ" ہمارے اجداد میں سے تھے تذکرہ اولیاء میں ان کا تذکرہ موجود ہے۔ ابا کے مرشد محترم عبدالسلام شاہ نیازی صاحب تھے۔ وہ ابا سے محبت بھی کرتے تھے اور سید ہونے کے ناتے ان کا احترام بھی کرتے تھے۔"

"بہن بھائیوں میں والدین کو کس نمبر کی اولاد سے پیار تھا؟"

"میرا خیال ہے کہ اولاد تو ساری ہی پیاری ہوتی ہے۔ مگر جس سے ذہنی ہم آہنگی ہو جائے، منزل ومقصد ایک ہو جائے تو وہ زیادہ قریب ہو جاتا ہوگا اور یہ بات تو پکی ہے کہ میرے والد، اپنی اولاد میں سب سے زیادہ پیار مجھ سے ہی کرتے تھے حالانکہ صرف دو بہنیں اور دو بھائی تھے، میرے بہن بھائیوں کو شکوہ ہی رہا کہ آپا زیادہ لاڈلی ہیں۔

رہی اماں کی بات تو شروع میں تو وہ سوتیلی ماں ہی لگتی تھیں، ہر وقت کی ڈانٹ، ہر وقت کی تنقید۔ میں

ذرا باغی بھی تھی ہر بات اندھا دھند نہیں مان لیا کرتی تھی مجھے پہلے وجہ معلوم کرنی ہوتی تھی اور یہ بات اماں کو بہت ناگوار گزرتی تھی وہ کہتی تھیں۔

"بس جو کہہ دیا ہے اسے مان لو۔ جو کہہ رہی ہوں وہ تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہی ہوں۔ بحث مت کرو اور اگر نہیں ماننا چاہتیں تو گھر بیٹھو۔ کل سے پڑھنے کے لیے نہیں جانا گھر بیٹھ کر گھر داری سیکھو۔"

اب بتایئے کیا کرتی، چولہے کے آگے ہاتھ اور دل جلانے سے تو بہتر تھا کہ اماں صاحبہ کی بات مان لی جائے۔

شادی کے بعد ان کا پہلا خط جو مجھے لندن میں ملا اس سے پتا چلا کہ وہ مجھ سے کتنی محبت کرتی تھیں، انہیں مجھ پر کچھ "مان" بھی تھا، انہوں نے مجھے اپنی زندگی کی بہار کا پہلا پھول قرار دیا اور پھول جب درخت سے جدا ہوتا ہے تو درخت کے دل پر کیا گزرتی ہے، اس کا ذکر تھا جس نے مجھے رلا ڈالا۔

انہوں نے کبھی میری تعریف میرے منہ پر نہیں کی۔ ان کے جانے کے بعد ان کی منہ بولی بیٹیوں نے بتایا کہ وہ ان سے میرا ذکر کن الفاظ میں کرتی تھیں۔

"ہاں میری مزاحیہ کہانیاں پڑھ کر وہ بہت ہنستی تھیں اور خوش ہوتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتوں کا سایہ کرے اور انہیں جنت میں اعلا مقام عطا فرمائے (آمین)"

"کبھی بچپن میں مار پڑی؟"

"مار" وہ کیا ہوتی ہے؟ نہیں صاحب اس اعزاز سے محروم رہے۔ والد نے مجرموں کو تو شاید مارا ہو لیکن ہمیں کبھی پھولوں کی چھڑی سے بھی نہیں چھوا تھا۔ امی ڈانٹتی تھیں مگر مارا کبھی نہیں۔ البتہ میں کبھی کبھار ضرور اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی کٹائی کر دیتی تھی۔ مجھ سے چھوٹا والا بہت زیادہ شرارتی تھا۔ کبھی میرے پراندے (چوٹی) کے ساتھ بھاری چیز باندھ دیتا۔ تو اس کی خبر لینا تو میرا حق بنتا تھا نا۔ میں گرمیوں کی دوپہروں میں اسے ابن صفی کے ناول سناؤں۔ شفیق الرحمٰن کے شہ پارے گوش گزار کروں تاکہ وہ اس تیز دھوپ میں کمرے سے باہر نہ جائیں۔ اور وہ میرے ساتھ یہ حرکت فرمائیں۔ اس طرح کی بہت سی باتیں تھیں اب کہاں تک آپ کی "سمع خراشی" کروں۔"

بچوں کے لیے میں نے پہلی کہانی نو سال کی عمر میں لکھی تھی جو چھپ بھی گئی۔ پھر پھول اور ہدایت میں لکھا۔ میٹرک میں پہلا افسانہ "منزل" لکھا۔ کالج کے دوران جو کچھ لکھا وہ میری کتاب "گھر سے کالج" تک میں موجود ہے۔ پھر یہ کہانیاں ماہنامہ عفت اور بتول میں شائع ہوئی ہیں۔

شادی کے بعد جو کچھ لکھا، وہ "چلمن اور سیارہ" میں شائع ہوا۔ دو چار چیزیں "چراغ راہ" میں آئیں۔ "سودا گھر" میں بھی کچھ لکھا تھا جو کہ اب دستیاب نہیں۔ امی لکھتی تھیں تو ہمیں بھی لکھنے کا شوق چرایا۔ حوصلہ افزائی اماں نے بھی کی اور خالہ حمیدہ بیگم نے بھی کی۔ پڑھنے والوں نے تو تعریف کی تو ہمیں لگا کہ شاید ہم "توپ" قسم کی چیز ہیں۔ یہ سلسلہ رک رک کر جاری رہا۔

یہاں تک کے پہلا ناول "بوئے گل" لکھ ہی لیا وہ چلمن میں قسط وار چھپا، میری مزاحیہ تحریریں اردو پنچ میں شائع ہوتی تھیں۔ اور جب کرنل محمد خان صاحب جیسی شخصیت نے تعریف کی تو میں حیران ہی رہ گئی کوئے ملامت کا پہلا ایڈیشن، سلطان رشک صاحب نے شائع کیا جو اردو پنچ کے مدیر تھے۔ "سانجھ بھئی چودیس" کے لیے سید قاسم محمود کا اصرار تھا کہ وہ شائع کریں گے اور پھر انہوں نے ہی شائع کی۔

لکھنے کی صلاحیت خداداد ہوتی ہے مگر اس کو نکھارنے کے لیے مطالعہ بہت ضروری ہے اور صرف اردو ادب نہیں عالمی ادب بھی پڑھنا چاہیے کہانی افسانے، ناول یا ناولٹ فنی لحاظ سے تب مضبوط ہوتا ہے جب دنیا کے بڑے ادیبوں کو پڑھا جائے۔ اگر مطالعہ نہیں ہوگا تو جس میں لکھنے کی صلاحیت ہوگی وہ لکھ تو لے گا مگر وہ خام ہوگا۔ حقیقت سے دور ہوگا۔

الفاظ کا ذخیرہ بھی پڑھنے سے ہی ملتا ہے اور ان الفاظ کا استعمال بھی آجاتا ہے کہ کون سا لفظ کہاں جڑنا ہے الفاظ بھی نگینے ہوتے ہیں۔ وہ صحیح طریقے سے استعمال ہوں تو اپنا تاثر چھوڑتے ہیں۔

پڑھنے کا ایسا چسکا پڑا کہ میگزین کے علاوہ جو ہاتھ آیا پڑھ ڈالا جن لفافوں میں دالیں اور نمک مرچ آتے تھے، ان کو بھی کھول کر پڑھ لیتی تھی جس زمانے میں اخبار اور رسالوں کے صفحات سے لفافے بنتے تھے۔ اگر پتا چل جاتا کہ کسی کے پاس رسالوں کے ذخیرے ہیں تو وہ بھی لاکر پڑھ لیتی تھی۔ میری مامی تاریخی کتابیں پڑھتی تھیں تو ان کے یہاں سے کتابیں اٹھالاتی۔

ہر عمر کی اور ہر دور کی پسند الگ الگ ہوتی ہے۔ کبھی کوئی بھا جاتا ہے تو کبھی کوئی۔ ڈپٹی نذیر احمد اور راشد الخیری سے ابتدا ہوئی اور پھر نسیم حجازی اور اے آر خاتون سے ہوتی ہوئی فرحت اللہ بیگ، عصمت چغتائی اور پطرس بخاری تک جا پہنچی۔

ایک زمانہ آیا کہ ابن صفی بہت زیادہ پسند آگئے اور اتنے پسند آئے کہ ان کا ایک ہیرو، کرنل احمد کمال خریدی اتنا پسند آیا کہ میں نے اپنے دوسرے بیٹے کا نام ''احمد کمال'' رکھ دیا۔ دراصل ہم اپنے آس پاس زندہ انسانوں کو اپنا آئیڈیل بنانے کے بجائے، ان کو بناتے ہیں جو یا تو تخلیقی ہوتے ہیں یا پھر تاریخ کے صفحات میں گم ہوں اور اگر ایسا ہو جائے تو بہت ساری لڑکیاں گوشت پوست کے انسان کے شر سے محفوظ رہ سکتی ہیں۔

جاسوسی ادب مجھے ہمیشہ اچھا لگتا تھا سسپنس ہوتا ہے اور مزہ بھی بہت آتا ہے تو میں نے بہت جاسوسی کتابیں پڑھیں، جن کی فہرست کافی طویل ہے۔ اسی لیے مجھے ''نمرہ احمد'' بھی اچھی لگتی ہیں کہ ان کی کہانیوں میں سسپنس ہوتا ہے۔ مطالعہ کا یہ سفر ترقی پسند ادیبوں تک جا پہنچا۔ اگرچہ ان کے نظریات سے شدید اختلاف تھا مگر بہرحال فنی لحاظ سے ان کی تحریروں کا معیار بہت اونچا تھا۔

منٹو کی وہ کتابیں جن کو پڑھنے کی اجازت ملی وہ بھی پڑھیں، عصمت چغتائی، شمیم سلیم چھتاری، جیلانی بانو، حاجرہ مسرور اور خدیجہ مسرور سے ہوتے ہوئے ''اے حمید'' تک پہنچے۔ اس زمانے میں جو بھی نقوش اور ادب لطیف میں چھپا وہ ضرور پڑھا۔

مجھے اپنے بچپن کی ایک مزے دار بات بھی یاد آگئی۔ میں آٹھ یا نو سال کی تھی تو امی کے بکس سے ایک رسالہ نکلا جو شاید انہوں نے مجھ سے چھپا کر رکھا ہوا تھا اس کا نام ''روح ادب'' تھا اس میں اشفاق احمد کا افسانہ تھا ''مہمان بہار'' اس کے ہیرو کا نام غالباً اختر تھا۔ وہ میں نے چھپ چھپا کر جلدی جلدی پڑھ ڈالا۔ اب اس عمر میں کیا سمجھ میں آنا تھا مگر ڈانٹ کافی پڑھی۔

سیالکوٹ کی لائبریری میں جب بچوں کی ساری کتابیں ختم ہوگئیں تو امی کا نام لے کر میں، ناول لے آئی اس کی ہیروئن کا نام کلثوم تھا۔ کلثوم بے چاری اپنے شوہر کے قدموں میں تھی اور شوہر کا تھپڑ اسے لگا اور اسی وقت ایک تھپڑ مجھ ناچیز کے سر پر بھی پڑا۔ ہم ذرا بھونچکے سے ہوگئے کہ یہ حضرت تو اپنی بیوی کو مار رہے تھے، مارتے مارتے ہمارے سر پر کیسے پہنچ گئے نظر اٹھائی تو نانا جان عجیب نظروں سے گھور رہے تھے کہ تم خیر سے ناول پڑھ رہی تھیں۔ کہاں سے ملا ہے یہ اس کے بعد، لائبریری جانے کی ممانعت ہوگئی۔ آج تک یہ جاننے کی حسرت رہ گئی کہ کلثوم پر کیا گزری تھی۔

اصل میں ہر ادیب کی تحریر شاہکار نہیں ہوتی اور یہ بھی نہیں ہوتا کہ جو بڑا ادیب ہوتا ہے اس کی تخلیقات شاہکار نہ ہوں اور جو تحریر مجھے متاثر کرتی ہے ضروری نہیں کہ وہ سب کو متاثر کرے۔ اور کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمیشہ یاد رہ جاتی ہیں جیسے ''قرۃ العین حیدر'' کا آگ کا دریا، عصمت چغتائی کا ''ٹیڑھی لکیر''، الطاف فاطمہ کا، چلتا مسافر، اور، دستک نہ دو اور عبداللہ حسین کا ''نئی فصلیں''، ''بیدی'' کا ناولٹ اک چادر میلی سی۔ ''ایمی زولا کی ''ارتھ'' اور جب میں نے

ان کی کتاب ''ارتھ'' پڑھی تو اس نے مجھے ''سانجھ'' لکھنے پر اکسایا کہ اگر فرانس کے کسی گاؤں کی تہذیب وروایات کو اس خوب صورتی سے لکھا جاسکتا تو ہم کیوں نہیں، کیا ہمارے گاؤں اور قبیلے کسی سے کم ہیں۔ کہانی اس وقت زندہ رہتی ہے جب تک علاقے اور کردار اصلی ہوں۔ اور رائٹر پر لزایس بک کی گڈ ارتھ بھی بہت عمدہ تھی۔ ٹالسٹائی کی وار اینڈ پیس اور انگریزی ادب کی کئی کتابیں مجھے بہت اچھی لگیں ایک ایک کا ذکر کروں گی تو بات بہت آگے تک نکل جائے گی۔''

''آپ نے ڈھیروں ڈھیر رائٹرز کے شاہکاروں کا ذکر کیا جو صفحات کی کمی سے نہیں لکھ پائی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا سوشل میڈیا نے نوجوانوں کے ہاتھ سے کتاب چھین لی؟''

''سچ کہا آپ نے کہ سوشل میڈیا نے ہاتھ سے کتاب چھین لی ہے بلکہ مصنف بھی چھین لیا ہے لائبریریاں نہیں رہیں اور جو ہیں ان میں کتابیں یونہی سجی ہوئی ہیں۔ جو مزہ ہاتھ میں کتاب لے کر پڑھنے کا ہے وہ انٹرنیٹ پر پڑھنے کا نہیں، ذرا سی انگلی لگی اور سب کچھ ڈیلیٹ ہوگیا۔

اب تو کسی کو کتاب پڑھنے کا کہو تو جواب آتا ہے کہ فرصت نہیں ہے۔ سوشل میڈیا نے ذوق ہی چھین لیا ہے یا بدل دیا ہے اور سارا وقت سوشل میڈیا ہی لے جاتا ہے۔ اور اگر شوق نہ ہو تو ذوق بھی نہیں ہوتا۔ پھر وقت میں بھی برکت نہیں رہی ہے۔''

س: ''ڈائجسٹ کی دنیا میں کب قدم رکھا؟''

''میں نے تو کبھی ڈائجسٹ کی دنیا میں قدم نہیں رکھا۔ میں تو رومانٹک ناول لکھتی ہی نہیں ہوں۔ میرے تو صرف دو ناول چھپے ہیں ''بوئے گل'' اور ''سانجھ بھئی چودیس'' ایک ناولٹ ''ہم نفس'' اور ''خلیج'' اور دو مزاحیہ تحریروں کے مجموعے کیسے کیسے لوگ'' اور افسانوں کے مجموعے میں ''گھر سے کالج تک'' چوتھا کنول، ''سانس، آس نراس'' تین سفر نامے ہیں جو ابھی کتابی شکل میں نہیں آئے۔ ''نوائے سحر'' جس میں اقبال کے اشعار کی تشریح ہے۔

بے شمار افسانے اور کہانیاں راہ تک رہے ہیں اور جب بھی فرصت ملی تو انہیں بھی کسی کتاب میں نظر بند کردیا جائے گا۔ دو ناول زیر تحریر ہیں وہ بھی مکمل ہونے کے منتظر ہیں۔ ان میں ایک ناول تو میں نے امت الصبور کی فرمائش پر لکھا ہے اور رومانٹک لکھنے کی کوشش کی ہے۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ کامیاب ہوتی ہوں یا نہیں ہوتی۔

بس یہی حقیر سی پونجی ہے میرے پاس، لکھنا لکھانا فرصت کا مشغلہ ہے اور فرصت ملتی نہیں۔ آپ نے پوچھا کہ مجھے اپنی کون سی کتاب پسند ہے تو اپنی کتاب ''سانجھ بھئی چودیس'' مجھے زیادہ اچھی لگی ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ ایک زمانہ تھا جب عورت کس قسم کی تھی۔ کتنی وہ مضبوط اور ہمت والی تھی اور کس طرح جنگ لڑتی ہے۔ جس طرح ''گڈ ارتھ'' کی عورت تھی۔

لیکن ''گڈ ارتھ'' کی عورت چپ چاپ ظلم سہتی تھی لیکن ''سانجھ بھئی چودیس'' کی عورت ظلم سہتی نہیں ہے بلکہ مقابلہ کرتی ہے۔ اور شاید اسی لیے مجھے اپنی یہ کتاب پسند ہے۔ اور میں نے یہ اس لیے لکھا کہ لڑکی کو یہ پتا ہونا چاہیے کہ ''نفس'' انسان کو ہمیشہ کھائی میں گراتا ہے۔ پستی میں گراتا ہے اور انسان کو اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ کوئی اس کی طرف انگلی اٹھا کر نہ دیکھ سکے اور اگر کسی کو محبت ہو بھی جائے تو اس کا اظہار نہیں ہونا چاہیے۔ اظہار انسان کو حقیر کردیتا ہے اور عورت حقیر نہیں ہے اگر کوئی عورت اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے تو مجھے بتائیں کہ پھر وہ دنیا میں کیا کرے گی تو مرد سے زیادہ عورت کو مضبوط ہونا چاہیے۔

اظہار کرنا مرد کا کام ہے، اب یہ عورت کا کام ہے کہ وہ اسے قبول کرے یا انکار کردے۔ میری تحریروں میں عورت آپ کو مضبوط ہی نظر آئے گی، جو اپنے جذبات پر قابو رکھتی ہے۔ آج کی لڑکی نے اپنا یہ کردار بھلا دیا ہے وہ کچھ شکاری سی بن گئی ہے مگر آپ نے دیکھا ہوگا وہ خود اکثر اپنے جال میں پھنس جاتی ہے اور شکار ہو جاتی ہے۔ عورت بے نیاز ہوگی تو مرد نیاز مند رہے گا۔''

(جاری ہے)

www.pklibrary.com



خط بھجوانے کے لیے پتا۔
خواتین ڈائجسٹ۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔
Email:Info@khawateendigest.com

مزنہ کرن...... گوجرانوالہ

شمارہ ملا تو میں برتن دھو رہی تھی۔ جلدی جلدی برتن دھو کر فوراً اسے رسالہ پکڑا اور "ہمارے نام" میں چھلانگ لگائی۔ دل کی دھڑکنیں بہت تیز۔ ہر ایک صفحہ کو تین بار دیکھا۔ مگر اپنا نام کہیں نظر نہ آیا۔ جنوری کا خط میں نے اپنے پیپر کی تیاری چھوڑ کر لکھا تھا۔ اور پیپر بھی انگلش کا۔ چلیں کوئی بات نہیں۔

اس ماہ پھر الیکشن کی وجہ سے اتنی چھٹیاں آ گئی ہیں۔ جو کہ مجھے بالکل بھی پسند نہیں، میرا بس چلے تو میں اتوار کو بھی کالج جاؤں۔ میں نے اپنی دوست بتول کو ساری چھٹیاں بہت مس کیا۔

اب چلتے ہیں تبصرہ کی طرف ٹائٹل گرل بہت خوب صورت لگی۔ "ہمارے نام" میں گوشی جی سے شادیوں کا ذکر سن کر دل کیا کاش ہمیں بھی کوئی شادی کی دعوت آ جائے۔ پر افسوس دور دور تک کوئی شادی نظر نہیں آ رہی۔ پہلے میں اور آپی مل کر خط لکھتے تھے۔ مگر اب وہ خط نہیں لکھ رہیں۔ پچھلے تین ماہ سے میں اکیلی خط لکھتی ہوں۔ آپی بس پڑھتی ہیں۔

ابھی بھی جب میں خط لکھ رہی ہوں تو وہ مجھ سے لڑائی کر کے رسالہ لے گئیں کہ میں نے "مالا" پڑھنا ہے۔ عروج عباس کو کہنا چاہتی ہوں کہ آپ کی کوئی بہن نہیں مجھ سے لے لیں۔ مجھے بھی تھوڑے دن سکون مل جائے گا۔

صفیہ مہر کا خط پڑھ کر دل کیا کہ اللہ ہمیں بھی ایسا شوہر دے۔ (آمین)

"مالا" کے کیا کہنے، پہلے صفحہ سے آخر صفحہ تک سحر میں جکڑے رہتا ہے۔ آپ سے ایک بات پوچھنی تھی؟ کہ نمرہ احمد کہاں پر رہتی ہیں؟ آپ پلیز نمرہ جی کا بھی انٹرویو لیں۔

پہلے مجھے آسیہ رئیس کی تحریریں نہیں پسند آتی تھیں۔ لیکن اب آتی ہیں۔ میرا ان کو مشورہ ہے کہ کوئی سلسلہ وار ناول لکھیں۔ اور ہاں پلیز انڈیا کے علاوہ بھی کوئی اور ملک دکھایا کریں۔ بیوٹی ٹپس سے مستفید ہوئے پھر عدنان بھائی کی طرف گئے۔ اور انہوں نے جو شروع میں لکھا ہے۔ وہ آج کل میں اپنی سائیکالوجی کی بک میں پڑھ رہی ہوں۔ اور انہوں نے جو شمائلہ جی کو مشورہ دیا، وہ بالکل سو فیصد درست دیا ہے۔ خود رجی کی طرح مجھے بھی سیاست میں دلچسپی ہے لیکن میں نے ایک بات سیکھ لی ہے۔ کہ سیاست اور مذہب پر کبھی بھی بحث نہیں کرنی چاہیے۔ ہر کسی کی اپنی رائے ہوتی ہے۔ اور وہ اپنی رائے میں آزاد ہے۔ نگہت سیما سے ملاقات کر کے بہت اچھا لگا۔ ان کا ماہ الملوک شعاع میں بہت اچھا جا رہا ہے اور "آنگنا پھول کھلیں گے" میں ثانیہ کی سازشیں ختم ہونے کا نام نہیں لے رہیں۔ میں اگر ارم کی جگہ ہوتی تو شاید کبھی معافی نہ مانگتی۔

سب افسانے ہی اچھے رہے۔ لیکن "چھوٹی چھوٹی باتیں" تو سب شادی شدہ عورتوں کو اپنے اپنے شوہر کو پڑھانا چاہیے۔ اور ناولٹ "دل کا آنگن سونا ہے۔" حمیرا شفیع بہت اچھا لکھتی ہیں۔ اور رجی میری دعائیں رنگ لے آئیں اور ہمارا فیصل آباد شفٹ ہونے کا پلان کینسل ہو گیا ہے۔ شکر الحمدللہ۔

ج۔ پیاری مزنہ! آپ کا خط پچھلے ماہ شامل نہ

ہوسکا اور آپ کے معصوم سے دل کو تکلیف پہنچی۔ اس کے لیے معذرت، معصوم اس لیے لکھا کہ آپ ہمیں بہت معصوم لگیں بھلا بہن بھی کوئی دینے کی چیز ہے۔ ابھی آپ بہن کو دینے کو تیار ہیں کل جب شادی ہو جائے گی تو یاد کریں گی ان کو۔

خواتین آپ کو پسند آیا جان کر بہت خوشی ہوئی۔

عائشہ خان...... کراچی

پہلے میں ٹنڈو محمد خان سے خط لکھا کرتی تھی پھر ہم کراچی شفٹ ہو گئے۔ کراچی میں ایک افراتفری ہوتی ہے۔ وقت ہی نہیں ملتا کافی عرصے بعد ڈائجسٹ خریدا تو سوچا فیڈ بیک دے دوں۔

سب سے پہلے مکمل ناول رفاقتیں پڑھا۔ بہترین تحریر تھی ویلڈن۔ سعدیہ رئیس خان۔

مجھے مصنفہ سے یہ پوچھنا ہے کہ کیا اس ناول کے کردار بھارت میں رہتے تھے ہول کا آنگن سونا ہے حمیرا شفیع کا سادگی بھرا انداز لیے ناولٹ نے دل چھو لیا۔

باورچی خانے میں ثمن لیاقت کے وائٹ پراٹھے کی ریسپی اچھی لگی۔ مجھ سے ملیے میں احمد رفیق کے جوابات منفرد لگے بناوٹ سے پاک، عنبرین ابدال کا کارساز اچھا لگا لتی آصف کا پیکیج بھی ہلکا پھلکا بہترین لگا جویریہ مریم کا اعتراف بھی اچھا لگا باقی پرچہ ابھی زیر مطالعہ ہے ان شاء اللہ خواتین سے تعلق جڑا رہے گا۔

ج۔ پیاری عائشہ! کراچی کے بارے میں آپ کو ہی نہیں کراچی میں رہنے والوں کی بھی یہ ہی شکایت ہے کہ وقت نہیں ملتا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا راز کیا ہے۔ یہ اس شہر کی خصوصیت ہے یا یہاں کام زیادہ ہیں۔

سعدیہ مصطفیٰ...... گاؤں مڑھ بھنگواں

''کہنی سنی'' میں مدیرہ نے درست کہا: ''انسان نے حیرت کو چھوتی ترقی کی ہے مگر اس دنیا میں رہنے کا سلیقہ نہیں سیکھا۔''

ہمارے معاشرے میں بھی زیادہ نہ سہی لیکن ایسا ہی ہے۔ بہت سارے لوگوں نے تعلیمی ڈگریوں کو صرف ایک ''کاغذ'' کی حد تک محدود رکھا ہے۔ چھ سال اداروں میں دھکے کھانے کے بعد اگر آپ اس قابل نہ بن سکے'' کسی بے سہارا کو سہارا نہ دے سکے۔

''زبان پر آتے طنز کو نہ روک سکے۔'' ''بحث کو چھوڑ کر اپنی غلطی کا اعتراف نہ کر سکے۔'' تو معذرت پھر خود سوچیں وہ تعلیم اس قابل ہے کہ اسے تعلیم کہا جا سکے؟؟

''ہمارے نام'' میں ''عروج عباس۔ کراچی (کاش میرا بھی کوئی بہن بھائی ہوتا) ڈیئر عروج آج سے ''سعدیہ مصطفیٰ'' آپ کی بہن۔ ٹھیک ہے اب خوش۔

''میری ڈائری سے'' ''آمنہ زاہد'' کی غزل پسند آئی۔

''باتیں'' ''رفیق احمد'' سے اچھی رہیں۔

''نگہت سیما'' سے ملاقات خوب رہی۔

''مالا'' میں ''سرکار'' کا بچپن کافی دلچسپ رہا اور مالا تم ماہر کو اب دھوکا مت دینا۔ ''احد'' اچھا جارہا ہے۔ ''قدر'' ثوبیہ نے قدر تو کی لیٹ ہی سہی۔ ''چھوٹی چھوٹی باتیں'' صحیح کہا چھوٹی چھوٹی باتیں ہی تو بڑے بڑے مسائل کا سبب بن سکتی ہیں۔ بعض اوقات ''کارساز'' بے شک اللہ تعالیٰ بہترین کارساز ہے۔ ''پیکیج'' کوئی خاص پسند نہیں آیا۔ ''فاخرہ بتول'' کی نظم اچھی لگی۔

پیاری سعدیہ! آپ کا افسانہ مل گیا تھا۔ آپ میں صلاحیت ہے۔ لکھ سکتی ہیں۔ تھوڑی مزید محنت کی ضرورت ہے۔ آپ مزید افسانے لکھیں۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

فرزانہ انصاری...... کراچی

پچھلے کچھ عرصہ کافی بیمار رہی۔ کچھ ٹینشن رہی۔ جس کی وجہ سے آپ کو خط نہیں لکھ پائی نظر کمزور ہو گئی ہے۔ آنکھوں کے ڈاکٹر کے پاس جانے کا وقت نہیں مل رہا ہے جو چشمہ بنوا سکوں۔ باریک الفاظ دھندلے نظر آتے ہیں۔ قرآن پاک کا ترجمہ بھی بہت وقت سے پڑھتی ہوں۔

مالا حسب توقع بہترین جارہا ہے۔ احد نے بھی اپنے حصار میں لے رکھا ہے۔ راحت جبیں کا انگنا پھول کھلیں گے بھی زبردست ہے، ایسے لگتا ہے ہمارے گھروں کی کہانی ہے۔

ج۔ پیاری فرزانہ! آپ کا طویل خط پڑھا۔ بہت افسوس ہوا۔ جو آپ پر گزری اللہ آپ کو صبر دے۔ آمین۔

فرزانہ بہن! آپ اس سے پہلے بھی ہمیں طویل خط

pklibrary.com

کی رہی ہیں۔ تین سو ماوہ غیر مربوط ہوتے تھے۔ بہت
سے جملے اور باتیں ایک سے زائد بار لکھے ہوتے تھے۔ صاف لگتا تھا کہ آپ بہت زیادہ ٹینشن اور اضطراب کا شکار ہیں۔ پہلی بار آپ نے بہت مربوط خط لکھا۔ عزیز بہن آپ بہت باصلاحیت ہیں۔ آپ افسانے، کہانیاں لکھیں، ہمیں یقین ہے کہ آپ بہت اچھا لکھ سکتی ہیں اس سے آپ کے ذہن پر بھی خوش گوار اثرات ہوں گے۔ اور آپ کو بہت سکون محسوس ہوگا۔ ہم آپ کے لیے اور تمام متعلقین کے لیے دعا گو ہیں۔

صدف ناصر......گوجرنوالہ

ماہ فروری کا شمارہ ملا، ٹائٹل اس قدر پیارا ہے کہ نظریں نہیں ہٹ رہیں۔ "کہنی ستی" کی سن کر دل سے دعا گو ہیں، کہ اللہ بہترین فیصلہ فرمائے وطن عزیز کے حق میں۔ (آمین)

"نگہت سیما" سے ملاقات ایسی کمال کی رہی کہ بیان کے لیے الفاظ ہی نہیں۔ ان کے ہمراہ خود کو ہر جگہ محسوس کیا۔ بچپن سے اب تک۔ پورا انٹرویو زبردست اور حیرت انگیز رہا۔

"ہمارے نام" میں حاضری دی۔ خود کو کہیں نہ پایا۔ مطلب پھر سے ڈاک لیٹ۔

سب ہی بہنوں اور دوستوں کے تبصرے پسند آئے۔ "صفیہ مہر فرحان" کی بات پر بہت ہنسے کہ "ہمارے تبصرے محتاط ہو کر پڑھتی ہیں۔" نہیں بھئی! آپ ایزی ہو کر پڑھا کریں۔ ہم بھی آپ جیسے ہی ہیں۔ عروج عباس، عارفہ فضل اور گوشی کی شرکت نے خوشی دی۔ "انگنا پھول کھلیں گے۔" بلآخر تین ماہ کے بعد تحریر مکمل نصیب ہوئی۔ (شکر ہے) "ارم" جیسی اچھی لڑکی کے ساتھ بہت ہی برا ہوا۔ "ثانیہ" وہ "بچھو" ہے جو ہزار بار کاٹے گا، کیونکہ فطرت سے مجبور ہے۔ خوش آئند بات تو یہ ہے کہ "نتاشا بی بی" آ ٹکرائیں گی "ثانیہ فیملی" کو واہ بھئی! اسے کہتے ہیں۔ "جیسے کو تیسا۔" "مکمل ناول" کی طرف آئیں تو "رفاقتیں" نے ایسا باندھا کہ ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔۔ "دیبا" کے سوئے نصیب بوجہ صبر، شکر اور خدمت گزاری کے اسے کہاں

... کا کردار بہت پسند اور مہربان رہا۔
ہمارے "سسر" بھی بالکل ایسے ہی شفیق ہیں اپنی ہوؤں اور سب کے ساتھ بہر حال رشتوں اور رفاقتوں کو بخوبی سکھایا" آسیہ رئیس" نے البتہ ایک "شانو" رہ گئی، شادی ہونے سے۔ (ہاہاہا)

"احد" کی باری آئی تو ڈیرنا درہ! ایک بار پھر سے بائنڈنگ کی غلطی۔ پوری تحریر" وفا ہے کہ جفا ہے" کے "باب" سے شروع ہوئی تو "پروفیسر زید ابصار" پر جا کر "باقی آئندہ ماہ" پر ختم ہوئی۔ میں تو شکر بجا لا رہی تھی کہ "انگنا پھول" اس ماہ ٹھیک ہے تو اب یہ تحریر۔ پلیز توجہ فرمائیں۔ کیونکہ بار بار شمارہ تبدیل کروانا آسان اور ممکن نہیں ہے۔ پلیز "مالا" میں "نگینہ" بیگم کا خوب مزا آ رہا ہے۔ اپنا بویا اب پل پل کاٹے گی۔

"افسانے" کی باری آئی تو "سیکیج" نے خوب ہنسایا۔ "لبنیٰ آصف" نے حرف حرف سچ لکھا۔ کیونکہ ہمارا بھی بڑا تلخ تجربہ ہے اس منحوس سیکیج کا۔ تو یہ بھی بڑی پکی کی ہم نے۔

"جویریہ مریم" کے "اعتراف" نے ہمارے سارے سوئے زخم جگا دیے۔ واقعی ہم دوسروں کو سمجھنے میں غلطی کر بیٹھتے ہیں۔

اور ہمارے ساتھ یہ ہوا کہ کچھ مہمان آ گئے شادی کے کچھ دنوں بعد تو ہماری "ساس" نے روٹی پکانے کو کہا۔ ہم نے آٹا گوندھا، روٹیاں بنائیں۔

مہمان نے کھانا کھایا۔ پھر ان کے بیٹے کی شادی کی بابت سب نے پوچھا کہ کس طرح کی بہو چاہیے۔ تو حضرت نے بڑی حقارت سے فرمایا۔

"جیسی بھی ہو، پر پڑھی لکھی نہ ہو کہ جسے روٹی بھی گول نہ بنانی آتی ہو۔"

یہ طنز مجھ پر کیا سر محفل کیونکہ شروع شروع میں روٹی تھوڑی گول نہیں بنتی تھی۔ بہر حال بیٹے کی شادی کی انہوں نے۔ بہو پرائمری پاس لائے۔ اور اس بہو نے ایک دن بھی سسرال کو ایک وقت کا کھانا آج تک نہیں بنا کے دیا۔ اور پڑھی لکھی بہو ایک وقت میں سولہ سولہ روٹیاں بناتی رہی بالکل اکیلی پورے نو سال۔ تو گزارش

ہے رائے قائم کرنے میں جلدی نہ کیا کریں۔ دکھی دل کی "آہ" بھی لگ جایا کرتی ہے۔

"صائمہ نور" نے ہر بار کی طرح اچھا افسانہ پیش کیا۔ "قدر" میں "ہارون" نے دلی "قدر" کی "ثوبیہ" کی۔ ورنہ "خالہ شمع" نے ہارون کو ہتھیانے کی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ "راشدہ رفعت" کی "چھوٹی چھوٹی باتیں" نے بے اختیار ہنسا دیا۔ ایک مزے کی بات اور بھی ہے کہ بیوی کے میکے کی ذرا ذرا سی بات پکڑتے ہیں، مگر اپنے گھر والوں کی دفعہ۔ (ہاہاہا) راشدہ رفعت آئندہ آپ "ناول" کے ساتھ نہ آئیں تو ہماری آپ کی "کٹی" ہے۔

"پس آئینہ" عمارہ امداد نے خوب صورت انداز بیان سے بڑا پیارا اور شرعی سبق پیش کیا ہے۔

"بانو" (بہو) نے اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دے کر ساس کا بھرم رکھ لیا۔

"عنبرین ابدال" "کی" کارساز" ہر گھر کی دکھی داستان۔ ویل ڈن! عنبرین، آپ ہمیشہ اچھا لکھتی ہیں۔

"آپ کا باورچی خانہ" نمن لیاقت سے ملاقات بہت ہی سادہ اور اچھی رہی۔ "وائٹ پراٹھا" تو بہت ایزی اور مزے کا لگا۔ منٹوں میں بن جائیگا، بچوں کے لنچ کے لیے۔ (ہاہاہا)

"نقطیں۔ غزلیں" میں آپ "ناصر کاظمی" کو بھی جگہ دیں کبھی۔

"نفسیاتی ازدواجی الجھنیں" عدنان بھائی نے بہترین برین واش کیا ہمارا۔ "حور شمائل" کا سوال اور جواب پڑھ کر قہقہہ لگایا گیا۔ کیونکہ ہو بہو یہی کچھ ہمارے میاں صاحب کرتے ہیں اور ہم بھی ہر دوسرے دن عدنان بھائی والی نصیحتیں کرتے ہیں کہ چھوڑ دیں بحث، خموش رہا کریں۔ (ہاہاہا) عدنان بھائی نے ہمیں گھر بیٹھے "سائیکاٹرسٹ" بنا دیا۔

27 فروری "مناہل ناصر" کی برتھ ڈے پر وش ضرور کیجئے۔ جو مجھے میری برتھ ڈے پر ڈائجسٹ گفٹ کرتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ چہارم کلاس میں بہترین نمبروں سے کامیابی اور پارہ کلاس میں بھی پوزیشن رہی۔ ماشاء اللہ!

ج: پیاری صدف! اولاد کی کامیابی کی خوشی والدین کو اپنی کامیابی سے زیادہ ہوتی ہے۔ والدین کے علاوہ دنیا میں کوئی بھی نہیں چاہتا کہ کوئی اس سے آگے نکلے۔ والدین واحد ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ اولاد ان سے زیادہ ترقی کرے اور زندگی میں کامیابیاں حاصل کرے۔

مناہل ناصر کو سالگرہ مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ کامیابی اور خوشیوں سے نوازے۔ آمین۔

آپ کی فرمائش پر راشدہ رفعت کا ناول شامل ہے۔

نصرت زاہد.....لاہور

پیاری سی ماڈل کی معصوم مسکراہٹ اور خوب صورت ڈریس سرورق کو دلکش بنا رہے تھے۔ کہنی سنی میں مدیر صاحب نے بڑی مہارت سے انسانی زندگی کا خلاصہ ازل سے ابد تک مختصر تحریر میں بیان کیا جو قابل تعریف ہے، پوری توجہ سے آپ کی بات سننے کے بعد اپنی ذمہ داری نبھائی باقی آگے جو اللہ کو منظور۔

"کرن کرن روشنی" یہ روشنیوں کا سلسلہ ہی تو ہے۔ جو ذہنوں اور دلوں میں چھائے اندھیروں کو دور کر رہا ہے۔ محترمہ نگہت صاحبہ سے ملاقات اچھی تھی۔ انشاء جی کا گدگدانا کالم پڑھ کے صوفیہ بٹ صاحبہ کے پاس پہنچے۔ کہانی پڑھنا شروع کی۔ دوبارہ کہانی کا نام پڑھا احد ہی ہے ناں؟ یہ کیا صوفیہ جی! اتنی آگے اور بلندی پر لے جا کر آپ نے اسٹوری بالکل ہی بدل دی۔ احد میں پہلے سے ہی بہت کردار تھے جنہیں سمجھنے میں ہمیں کافی وقت لگا تھا۔ اب جب اسٹوری دوبارہ اس مقام پر پہنچے گی جہاں احمل اور اسود کی شادی کی بات چل رہی تھی تو یہ ہماری یادداشتوں کا بڑا امتحان ہوگا۔ ذرا اپنے پڑھنے والوں کا خیال کیا کریں اور اتنا بھول بھلیوں میں نہ الجھایا کریں۔ لیتی آصف نے ہلکی پھلکی سی اچھی تحریر لکھی۔ راشدہ رفعت نے چھوٹی چھوٹی باتوں میں تقریباً ہر گھر کا مسئلہ بتایا۔

حمیرا اشفیع کی مہ پارہ کو بھی آخر عقل آ ہی گئی اور پپو جیسا بیبا بچہ اسے پسند کرنے لگا۔ آسیہ صاحبہ کی دل کو

چھوٹی تحریر نم آنکھوں سے پڑھی۔ اعظم میر کا کردار قابل تعریف تھا ان میں مجھے اپنے بابا کی جھلک دکھائی دی۔ وہ بھی ایسے ہی تھے مہربان اور محبت کرنے والے۔ دوسرا پاور فل کردار مہیب کا تھا۔ مجبوری میں کیا گیا دیبا سے شادی کا فیصلہ مہیب کے لیے آنے والے دنوں میں بہترین رہا۔ دیبا جیسی غمگسار اور محبت کرنے والی مخلص بیوی اسے مل گئی۔ ان جادوئی تحریریں لکھنے والی محترمہ کا انٹرویو بھی لیں۔ کارساز میں کہانی کی صورت دوسروں کی مدد کا ایک اچھا میسج تھا۔ مالا میں نگینہ بیگم کا ماضی پڑھ کر بھی مجھے ان سے کوئی ہمدردی محسوس نہیں ہوئی۔ اس کا انجام عبرت ناک ہی ہونا چاہیے۔

''انگنا پھول کھلیں گے'' کی ثانیہ کی وہی حرکتیں۔ ایک بندی اب کب تک برداشت کرے۔ ارم دل کی بری نہیں ہے لیکن ثانیہ کو بھی رشتوں کو اہمیت دینی پڑے گی۔ ثمن لیاقت کے باورچی خانہ میں وائٹ پراٹھا کی ترکیب اچھی تھی۔ خوش رہیے اپنا اور اپنے پیاروں کا بہت خیال رکھیے۔ اللہ نگہبان

زرینہ خانم لغاری..... مظفر گڑھ

''کرن کرن روشنی'' نہ پڑھنا تو بدقسمتی ہوگی۔ سروے میں داخل ہوتے ہی اپنا سروے دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ کہانیوں کی طرف انگنا پھول کھلتے کھلتے پھر مرجھا گئے۔ ''کھراسکہ'' واقعی فیکا ہی اصل ہیرو تھا۔ پپی نیوایر نے متاثر نہیں کیا چلوتم کو بتاتے ہیں خوب صورت کہانی تھی، واقعی کبھی کبھی بزرگ بہت ظلم کرتے ہیں، شکر ہے رمزی کو غزل مل گئی۔ رافو نے آمنہ کا نک نیم بتا کر مسئلہ حل کر دیا۔ گمان دل کے۔ نجانے بیٹوں کی ماؤں کو خواہ مخواہ کا گماں کیوں ہوتا ہے کہ بیٹیوں کی مائیں بیٹیاں تھالی میں سجا کر انہیں پیش کر دیں گی صغریٰ بتول کی خوش فہمیوں نے منہ کے بل گرایا ظرف قدح خدا کرے ہر لڑکی کو دریہ کی ساس جیسی ساس ملے تو جھگڑے ہی ختم ہو جائیں آسیہ رئیس کے طویل ناول نے بور کیا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ آسیہ نے لکھا ہے۔ احد میں اصل پر بہت ترس آیا۔ مالا تو شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہی ہوتا جا رہا ہے۔ رنگا رنگ پھول میں ساگ نے بہت ہنسایا۔ بیاض میں تحر خان کا شعر پسند آیا۔

ج: عزیز بہن زرینہ! آپ کا تنقید و تعریف کے ساتھ بھرپور تبصرہ بہت اچھا لگا۔ بہت شکریہ۔

گوشی جمال..... منڈی یزمان

شمارے کی آمد اپنے مقرر کردہ وقت پہ ہو چکی ہے اور اس بار امداد بھائی کے توسط سے ہی مل گیا۔ پچھلے ماہ بھاول پور سے بذات خود شاپنگ کے دوران خریدا۔ اس بار دانش بھائی رکشے پہ مطلوبہ دکان کا سامان لادے ہمراہ خواتین ڈائجسٹ کو گرد و نواح کی سیر کراتے آن پہنچے۔

ان دنوں الیکشن کے شور شرابے اینڈنگ مراحل پہ ہیں۔ ایک دن بعد ملک کے حکمران کا انتخاب ہو جائے گا۔ ہر چہرے پہ افسردگی، امید کی کرنیں ہیں اچھے دنوں بہتر ملکی حالات کی دعائیں مانگتے عوام، اللہ کرے جو بھی ملک کا حکمران بنے ملک میں بہتری لائے۔

کاؤنٹر پہ شمارہ، بال پوائنٹ، کاغذ اور کلپ بورڈ ایک سائیڈ پہ میری عینک اور میں سوچوں میں گم خواتین میں لکھنے کا سلسلہ چار سال مکمل کر چکا ہے اور میں خوش نصیب ہوں اور اس میں زیادہ رول قارئین بہنوں کا جنہوں نے پذیرائی اپنی پسندیدگی برقرار رکھی اور میرا حوصلہ مزید بڑھتا گیا اور کوشش ہے یہ سلسلہ اور شمارے سے وابستگی ہمیشہ قائم دائم رہے۔

تبصرہ محض ایک لفظ لیکن اک سمندر لیے اتار چڑھاؤ کو الفاظ کا رخ دیے اپنی سوچ کے مطابق خیالات کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہے لیکن ہم جیسے ابھی اس قابل تو نہیں بنے ہیں کہ اتنے مشہور و معروف لوگوں کی کاوشوں پہ روشنی ڈالیں۔

سیکھنے کا مرحلہ تو تاحیات رہتا ہے۔ ادارہ خود اس بات کا بہت اچھے سے خیال رکھتا ہے اور عمدہ سے عمدہ تحاریر کا انتخاب کر کے ہم تک پہنچاتا ہے۔

اپنی ذات اور اپنی فیملی ممبرز، گرد و نواح پر جس جانفشانی سے تبصرہ گوشی کو آتا ہے شاید اس عمدگی سے شمارے پہ تبصرہ کے لیے الفاظ کم پڑ جاتے ہیں کہ اچھا تو سب لگتا، ناپسند کیا لکھوں؟ اللہ اور ترقیوں سے نوازے۔

لکھتے وقت یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ڈائریکٹ

آپ سب سے دل کی باتیں ہو رہی ہیں روبرو ہو کر۔ اس لیے فیملی ڈسکس زیادہ ہو جاتی ہے ہاہاہا۔ کافی حد تک میری زندگی کا ڈپریشن کم ہو گیا ہے۔

مارچ کا شمارہ رمضان المبارک میں آئے گا امید ہے ''کرن کرن روشنی'' کا سلسلہ اسی حوالے سے ہو گا اور ٹائٹل پہ ماڈل پر اسکارف یا ڈوپٹہ اُڑھا دیں روح پرور احساس دلائے گا۔ 10 فروری سے دو کزنز کی شادیاں شروع ہیں تین سے چار دن وہاں مصروفیت رہتی ہے ان ہی شادیوں کی شاپنگ کا احوال تو پچھلے ماہ تحریر کیا تھا۔ باقی جو رہ گئی تھی وہ 2 دن پہلے تمام خواتین ہمراہ بچہ پارٹی منڈی یزمان میں شازمہ آپی، انس اور عنایہ کی ہڑبونگ پورے بازار میں جہاں کھانے کی چیز نظر آتی انس اور عنایہ فوراً جھپٹ کر منہ میں اور زوبی پیسے دیتی آگ بگولہ۔ آپا شازمہ کی تیاریاں فل عروج پہ۔ میکسی کے ساتھ میچنگ پوری دکان اٹھا لائیں اب خود دکان بنی زیورات سے آراستہ۔ اونچے ٹیلے نما جوتا پہنے دیکھنے کے قابل ہوں گی۔ شادیوں کا دلچسپ احوال اگلے خط میں ہو گا۔ عنایہ اپنا شرارہ و دیگر سامان ہر رات سرہانے رکھ کر سوتی ہے سو باردن میں اندر باہر لے کر گھوم رہی اور ماں سے تکرار میں مصروف۔ زوبی، عائمہ نے سلکی وہائٹ شرارے آرگنزا بنوائے۔ میرا میرون کلر۔ گڈی آپا حسب روایت بلیو کلر۔ بھائی اختر نے منڈی یزمان سے رینٹ پہ کوچ کروا کر یہاں پنڈ سے سارا ٹبر اٹھانا اور ہیڈ راجگاں قافلہ اتار دینا۔ زرد پھول کی عکاسی کرتی ماڈل ٹائٹل کو رونق بخش گئی۔ فہرست پہ نظر ثانی کی نگہت سیما کا انٹرویو جگمگا رہا تھا۔ ملاقات بہت اچھی رہی۔ البتہ احمد رفیق پتا نہیں کون موصوف ہیں؟ انگنا پھول کھلیں گے میں سازشوں کی بھرمار۔ انسان کا فلسفہ زندگی مثبت ہو تو کسی چیز کی کمی راستے کی رکاوٹ نہیں بنتی۔ بے شک ڈگریاں نہ سہی عملی میدان میں خالص سند ضروری ہے۔ بہت خوب صورت موضوع کا چناؤ ''قدر'' کی صورت ویلڈن صائمہ نور۔ لبنیٰ آصف نے اچھا ''پیچ'' دیا۔ خطوط میں مسز خالد آپ کے پیچ کے بارے میں غور کیا جا رہا ہے۔ کزنز کی شادیوں سے فارغ ہو کر دونوں آپا سے مشورہ کر کے آپ سے رابطہ کرتے ہیں۔ گڈی آپا اس رشتہ کی بابت پہلے ادارہ کے نمبر پہ کال کریں گی اور ان سے مسز خالد کا نمبر لے کر پوچھ گچھ کر لیں گی۔ رشتے اور بھی آ رہے ہیں لیکن دونوں آپا نہیں مان رہیں۔ اولاد کے ساتھ پھر سے شادی بہت سے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔

ج: گوشی جی! الیکشن تو شور شرابے کے بعد اپنے انجام کو پہنچے، یہ شمارہ آپ کو ملے گا تو نئی جمہوری حکومت کا قیام عمل میں آ چکا ہو گا۔ ہم تو دل سے دعا کر رہے ہیں کہ ملک میں استحکام آئے۔ امن و امان کی صورت حال بہتر ہو، مہنگائی کا خاتمہ ہو۔

شادیوں کا احوال ضرور لکھیے گا۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ احوال بہت دلچسپ ہو گا۔ آخر گوشی نے لکھنا ہو گا۔

آپ کی آپاؤں کا ڈر بجا ہے کہ سانپ کا کاٹا رسی سے بھی ڈرتا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ اولاد کے ساتھ دوسری شادی کئی مسائل کھڑے کر دیتی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا میں جہاں برے لوگ پائے جاتے ہیں۔ وہاں اچھے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ دعا ہے کہ اب انہیں اچھے لوگ ملیں۔

میشے علی خان..... خانیوال

دسمبر میں شمارے کے سوالات دیکھ کر لگا میں تو ان کے جوابات دے ہی نہیں سکتی۔ ایک وجہ تو یہ کہ میکہ اور سسرال میں صرف ایک دیوار ہے لیکن اس دفعہ جوابات پڑھ کر بے حد افسوس ہوا خود پر کہ اس طرح تو میں بھی جوابات بھیج سکتی تھی خیر یار زندہ صحبت باقی۔ سروے میں تمام قاری بہنوں نے بہترین جوابات دیے سب سے بہترین صائمہ گل مردان کے لگے۔ احد اور مالا بلاشبہ شمارے کی جان۔ بس یہ سوچ کر افسوس سے زیادہ دکھ ہو رہا ہے کہ اگر احد میں احمل کی شادی اسود سے ہو گئی تو رام کا کیا ہو گا۔ معلوم نہیں کیوں پر مجھے احمل اور اسود سے زیادہ رام اور احمل کی جوڑی اچھی لگتی ہے۔ (تصور میں اور وہ بھی صرف تب اگر رام مسلمان ہو جائے تو) مالا گو کہ بہت طوالت اختیار کر گیا ہے۔ لیکن بہر حال تسلسل سے پڑھ رہی ہوں۔ لگتا ہے کہ بہت کچھ واضح ہونے کے باوجود بھی نمرہ احمد کا قطعی موڈ نہیں جلد اختتام کرنے کا۔

نازیہ جمال سے ملاقات خوب رہی۔ کہاں ہیں کیوں لیکن مجھے کچھ عرصہ سے پرانی قارئین (جیسے شائستہ الیاس نیو ملتان، نمرہ ، اقراء کراچی، سندرہ سحر عمران کراچی، فائزہ شاہ بھلوال، درثمن سرگودھا، مصباح گل سرگودھا، سیدہ نسبت زہرہ کہروڑ پکا، نادیہ جہانگیر اور ثوبیہ جہانگیر موبر آزاد کشمیر) چلیں ثوبیہ تو اللہ کو پیاری ہوئیں لیکن نادیہ اور دوسری بھی بہت سی قاری بہنیں شدت سے یاد آ رہی ہیں۔ ساتھ ساتھ پرانی رائیٹرز بھی پلیز ایسا کہیں سے فرحت اشتیاق، میمونہ خورشید علی، فائزہ افتخار، تنزیلہ ، آمنہ ریاض، نبیلہ ابر راجہ ، فاخرہ جبیں، نگہت عبداللہ کو ڈھونڈ لائیں واپس۔ سچ بہت کمی محسوس ہوتی ہے ان کی نئی لکھاری بہنیں بلاشبہ بہت اچھا لکھ رہی ہیں پر ان کی جگہ تو خالی ہے نا۔

ایسا ایک مسئلہ تھا اس کا حل بھی بتا دیں تو مہربانی ہو گی وہ یہ کہ میرا بیٹا ہے تیرہ سال کا 7th میں پڑھتا ہے ایک تو مجھے اس کی Hieght (قد) بہت کم لگتی ہے ڈاکٹرز کو دکھایا ہے تو کہتے ہیں اس کی ہائٹ کم ہے پر اتنی نہیں کہ آپ پریشان ہوں میری ہائٹ 5.3 ہے اس کے بابا کی مجھ سے زیادہ ہے۔ پھر بھی مجھے پریشانی ہے ۔دوسرا اس کے سر کے بال بہت تیزی سے سفید ہو رہے جس کی وجہ سے میں ازحد پریشان ہوں جسم بھی اس کا دبلا ہے۔ پلیز کوئی حل بتا دیں میں بہت پریشان ہوں۔

باقی یہ کہ میں نے ابھی باقی رسالہ پڑھا نہیں تو تبصرہ کرنا ممکن نہیں اب آؤں گی اس بات کی طرف جس کی وجہ سے میں نے خط لکھنے کی اتنی جلدی کی وہ یہ کہ ہمارے نام میں صدف ناصر نے راحت جبیں کی کہانی کے بارے میں لکھا کہ انگنا پھول کھلیں گے میں کوئی اور سلسلے وار ناول چھپ رہا ہے دو ماہ سے (اس ماہ تین مہینے ہو گئے ہیں) عفان، مانی اور بی جان وغیرہ کے کرداروں کے ساتھ تو آپ کے جواب نے تو میری طوطے چڑیا سب اڑا کر میری سٹی وٹی بالکل گم کر دی میں تو سمجھ رہی تھی کہ راحت جبیں نئے کردار شامل کر رہی ہیں۔ یوں لگا جیسے کوئی مزیدار کھانا کھاتے ہوئے اچانک منہ میں کنکر آ جائے اور سارا مزہ کرکرا ہو جائے تو پھر کھانا کھانے کو بھی دل نہ مانے۔ بس کچھ ایسا حال ہی میرا ہوا ہے تو پلیز اپیا میری کنفیوژن دور کریں۔

ایک بات اور اپیا ایک نظم بھجوا رہی ہوں اگر شمارے میں جگہ مل سکے تو۔ پہلے والی کے بارے میں آپ نے انکار کیا لیکن وہ دسمبر کے شعاع کی زینت بنی اور مجھے جنوری کی دو کو پتا چلا وہ بھی عالیان محمد بیٹے نے رسالہ پڑھنے کے لیے اٹھایا تو اس نے کہا مما یہ تو وہ نظم نہیں جو آپ نے لکھی تھی سچ پوچھیں پڑھ کر کتنی خوشی ہوئی بیان سے باہر ہے اور اس سے بڑی حقیقت یہ کہ اتنی خوشی نظم پڑھ کر نہیں ہوئی جتنی فہرست میں اپنا نام دیکھ کر ہوئی۔

ج: پیاری میشے ! اپریل کا شمارہ سالگرہ نمبر عید نمبر ہوگا۔ آپ اس میں ضرور شرکت کریں۔ آپ اپنے بیٹے کے لیے پریشان نہ ہوں کچھ بچوں کا آہستہ آہستہ قد بڑھتا رہتا ہے اور کچھ بچے ایک دم قدم نکالتے ہیں۔ آپ اپنے بیٹے کو کھجور اور دودھ کا شیک بنا کر روزانہ پلائیں کھجور سے قد بڑھتا ہے اور دودھ ایک مکمل غذا ہے ان شاء اللہ آپ کے دونوں مسئلے حل ہو جائیں گے۔

راحت کے ناول میں آپ کا اندازہ درست ہے۔ راحت نے نئے کردار شامل کیے ہیں۔ ارم کی شادی عفان سے ہوگی آپ نے ہمارے جواب کا غلط مطلب لیا۔

پرانی قارئین اور پرانی مصنفین ہمیں بھی یاد آتی ہیں۔ کہاں ہیں بھئی آپ لوگ؟ لوٹ آئیں۔ ہم اور ہماری قارئین آپ کو یاد کر رہی ہیں۔

عروج عباس..... کراچی

معلوم نہیں یہ سارے بدذوق لوگ مجھ سے ہی کیوں ٹکراتے ہیں پہلے بھائی اور ابو کم تھے کیا کہ جو ہمارے ہاتھ میں چھ عدد ڈائجسٹ دیکھ کر C-29 میں ساتھ بیٹھی بزرگ خاتون بھی جملے بازی سے باز نہ آئیں اور اپنے تلخ تجربے ہم پہ لاگو کرنے لگیں کہ یہ خاندان کی سیاست پہ کہانیاں پڑھ پڑھ کے دماغ خراب ہوتا ہے، کچھ نہیں ملتا، پیسے اور وقت کا ضیاع ہے، میں بھی نوجوانی میں لکھا کرتی تھی لیکن کچھ خاص نہیں دیتے یہ لوگ وغیرہ وغیرہ۔

ہم نے بھی برملا کہہ دیا نہایت ادب سے کہ آنٹی آپ کو پڑھ لکھ کے کچھ نہیں ملا تو ضروری تو نہیں کہ میرے ساتھ بھی ایسا ہو، تجربات سے سیکھتی ضرور ہوں لیکن سب کو ایک سے نتائج ملیں اس بات سے میں متفق نہیں اور وہ آنٹی ایک شرعی پردہ کی ہوئی خاتون سے ایسے برجستہ جملے کی توقع نہیں کر رہی ہوں گی سو باقی رستہ چپ کیے رہیں۔ میں تو ایک قلمی دوست بنانا چاہتی تھی لیکن ملتے آس پاس سب کتابوں سے دور کے لوگ خیر کوئی بات نہیں۔

فروری کے شمارے پہ ماڈل میرے پسندیدہ رنگ سفید میں ملبوس نظر آئی اور اورنج دوپٹہ کا کنٹراس ماڈل کے حسن کو دو آتشہ کر رہا تھا اور صورت کے حساب سے تو سب بنی نوع انسان خوب صورت ہی ہیں۔

مدیر صاحب الیکشن کے لیے پر امید نظر آئے تو دوسرے پیرا میں سب بہنوں کو بھی امید کا دامن تھامے رکھنے کی ہدایت کی، میں نے خود بہت سی عورتوں کو چند مادی چیزوں کے پیچھے اور ایک وقت کی روٹی نہ ملنے پہ گھروں کو جہنم بناتے دیکھا ہے، اللہ پاک سب کو ہدایت دے۔

احمد رفیق سے صرف اس لیے مل لیے کہ ہمارے والد کے ہم نام تھے ورنہ چند گنے چنے کرداروں کے علاوہ ہمیں باقیوں کا پتا ہی نہیں چلتا وجہ ڈراموں کا شوق نہ ہونا ہے اور بے حد پیاری مصنفہ نگہت سیما صاحبہ سے ملنا بہار کے پہلے خوشگوار جھونکے کی طرح لگا اور محترمہ کی تصانیف انتالیس کے قریب ہیں "آنگنا پھول کھلیں گے" راحت جبیں ارم اور ثانیہ کے مزاجوں اور ترجیحات کے ذریعے نو عمر لڑکیوں کو اپنی اقدار کے تعین کو واضح کرنے میں مدد کر رہی ہیں اگر کوئی سیکھنا چاہے، احد میں صوفیہ بٹ صاحبہ نے سسپنس اچھا بنایا ہے ضامن اور ایڈووکیٹ خولہ کا کردار اچھا لگا۔

مکمل ناول اس بار ایک ہی تھا اور منفرد اور الگ قسم کی بچویشن کے اعتبار سے دلچسپ رہا۔

افسانوں میں سب سے پہلے لبنیٰ آصف کا پیکج پڑھا اور جس پیکج کا ذکر کیا گیا وہ اب سات روپے میں نہیں پورے پندرہ روپے میں ہوتا ہے کیونکہ نا چیز خود اپنی دودھیالی کزنوں سے بات کرنے کے لیے یہی والا پیکج کرتی اور کبھی کبھی دو گھنٹے کم پڑ جاتے پر باتیں ختم نہیں ہوتیں، چھوٹی چھوٹی باتیں تو ہر گھر کی عام کہانی ہے بس کسی کسی جگہ مردوں کو عقل آتی۔ قدر میں ہارون کا ثوبیہ کے پوائنٹ کو سمجھنا اور اس کی مشکل کو حل کرنا اچھا لگا، بھئی ایسے ہی منگیتر اور شوہر حضرات ہونے چاہئیں۔ کارساز افسانہ پڑھ کے ہم تو اور سادگی کے قائل ہوئے اور سادہ سے سادہ جہیز اپنا بھی پلان کریں گے۔

نفسیاتی الجھنوں میں اس بار عدنان بھائی نے ایک پر اثر تحریر سے ذہن کو روشن کیا ہر ماہ اسی طرح کی ایک چھوٹی تحریر ان کی ہونی چاہیے۔

ج: پیاری عروج! آپ کا مدلل جواب پڑھ کر اچھا لگا سچ ہے کہ ہر شخص کی رائے علیحدہ ہوتی ہے جو وہ اپنے تجربے کی بنیاد پر قائم کرتا ہے لیکن دوسرے کی بات بھی سننا اور سمجھنا چاہیے۔ دوسرے کوئی ایک کلیہ ہر ایک چیز پر لاگو نہیں کیا جا سکتا۔

احد میں پچھلے باپ کی کہانی کو دوبارہ شروع کیا جائے سالگرہ میں سروے شامل ہوگا۔ سوالات اس ماہ دیے جا رہے ہیں۔

خواتین پر تفصیلی تبصرہ اچھا لگا۔ بہت شکریہ

عدینہ لغاری...... جہلم

کہنی سنی کا اک اک لفظ دل میں اترتا چلا گیا کرن کرن روشنی میں ہر طرف اجالا تھا پڑھ کر سکون آ گیا۔ انشا جی کو پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ "ہمارے نام" کی طرف دوڑے پھر مایوسی میں نے سوچ رکھا تھا میں اب خط نہیں لکھوں گی۔ بہنیں اتنا اچھا لکھتی ہیں۔ مجھے شرمندگی ہوتی ہے اپنے خط دیکھ کر، مگر صوفیہ بٹ نے مجبور کر دیا لکھنے پر صوفیہ جی یہ آپ کہاں آ گئیں اور چودھری نگر کہاں گیا۔ ماڈل اتنی پیاری تھی تعریف بنا رہ نہیں سکی۔ "مالا" پڑھ کر یوں لگا جیسے "جنت کے پتے" پڑھ رہے ہوں۔ "آنگنا پھول" میں کانٹے ہی کانٹے ہیں، پھول کہیں نہیں ہیں۔ آسیہ جی کا ناول اتنا شاندار تھا میں تو دیر تک ان کے لفظوں میں گم رہی۔ نگہت سیما سے ملاقات کی اتنی خوشی

ہوئی میں بیان نہیں کرسکتی ان کی طرح مجھے بھی بچپن میں ریڈیو سننے کا بہت شوق تھا میں ریڈیو سیلون سے سنا کرتی تھی جس پر بہت پرانے گانے پیش ہوتے تھے۔ رنگا رنگ بھی پیارا سلسلہ ہے شعر بہت اچھا لگا۔

ج: عدینہ! پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ سے کس نے کہا کہ آپ اچھا خط نہیں لکھتیں؟ اگر آپ نے خود سوچا ہے تو یہ بات بالکل درست نہیں ہے۔ آپ خط بہت اچھا لکھتی ہیں دوسری بات یہ ہے کہ اگر آپ کو کوئی کمی محسوس بھی ہوتی ہے تو شرمندہ ہونے کی بات نہیں زندگی میں کمی بیشی تو چلتی ہی رہتی ہے۔

خواتین آپ کو پسند آیا یہ جان کر خوشی ہوئی۔

طیبہ شوکت.....مرید کے

اورنج کلر کے لباس میں ملبوس کیوٹ سی ٹائٹل گرل گولی کی طرح سیدھا دل میں لگی، حمد و نعت ہمیشہ کی طرح پرفیکٹ، رکیں کچھ یاد آرہا ہے ہاں یاد آیا۔ میں نے یہ پوچھنا تھا کہ سالار سکندر اور امامہ ہاشم کس کہانی کے کردار ہیں نام بتادیں۔ انشا جی کو پڑھ کر مزا آیا احمد رفیق سے باتیں کرکے اچھا لگا نگہت سیما سے ملاقات اچھی انٹرویکٹ بہت اچھی تھی۔ انگنا پھول کھلیں گے دل کیا وسیم کے مڑور ہی دوں بھئی کان اور ثانیہ تو مجھے زہر لگتی ہے۔ آخر یہ مالا کس مٹی سے بنی ہے۔ نہ ماہر کا یقین کرتی ہے۔ نہ اسے بدر اور سرکار کا پتا دیتی ہے۔ احد بس دل مسوس کر ہی رہ گئے کسی کو نہ پا کر اب دیکھتے ہیں نئے کردار کیا گل کھلاتے میرا مطلب رنگ لاتے ہیں۔ رفاقتیں ٹاپ آف دی لسٹ آسیہ رئیس خان کیا کمال کی لکھی ہے۔ افسانے سب ہی اچھے تھے۔ آپی کرن کے ٹائٹل پہ جو گرل تھی میرے ہونٹ سیم اس جیسے ہیں کیا بڑے ہیں؟

یہاں سب کہتے ہیں کتنے بڑے ہونٹ ہیں اگر بڑے ہیں تو کوئی طریقہ بتائیں جس سے یہ چھوٹے ہوجائیں۔

ج: پیاری طیبہ! سالار سکندر اور امامہ ہاشم عمیرہ احمد کے ناول پیر کامل کے کردار ہیں۔

اگر آپ کے ہونٹ کرن کے ٹائٹل جیسے ہیں تو یقین کریں بہت خوب صورت ہیں اس کو چھوٹا بڑا کرنے کے متعلق سوچیے گا نہیں۔ ویسے بھی بڑا دہانہ اور بھرے بھرے ہونٹ خوب صورتی کی علامت ہیں۔

عینا عمر خان.....کراچی

مجھے نہیں پتا تھا کہ کسی بڑی اور تخلیم رائٹر کی کہانی کے بارے میں یہ کہنا کہ انہوں نے یہ بات ٹھیک نہیں لکھی اس بات کو اس طرح لکھنا چاہیے تھا اتنا برا گناہ ہوگا کہ اس کی سزا کے طور پر آپ میرا خط ہی شائع نہیں کریں گے اتنا اچھا خط لکھا مگر آپ نے ایک لفظ بھی نہیں لگایا۔

مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مجھ سے اتنا سوتیلوں والا سلوک کیوں کرتی ہیں میرے خاندان میں کوئی بھی ڈائجسٹ نہیں پڑھتا صرف میں نے ان رسالوں سے سچی محبت کی اور ہمیشہ سینے سے لگا کر رکھا۔ ساس اور شوہر کی باتیں برداشت کیں مگر ڈائجسٹ کا ساتھ نہ چھوڑا یہ میرا اوڑھنا بچھونا ہے یہ میرا شوق اور جنون ہے کہانیاں پڑھنا اور اب لکھنا بھی۔

آپ کے رویے سے مجھے بہت بہت زیادہ دکھ ہوا ہے میرا دل بہت خفا ہے خیر میں کون سا آپ کی اکلوتی قاری ہوں جو آپ میرے خفا ہونے کا اثر لیں گی لیکن میری محبت کا اندازہ آپ کو تب ہوگا جب میری آپ سے ملاقات ہوگی فردوری کے شمارے پر تبصرہ کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر مجھے مجبور کیا آسیہ رئیس خان نے انہوں نے اتنا اچھا اور عمدہ لکھا کہ میں سمجھتی ہوں کہ ان کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ ویل ڈن آسیہ جی۔

پیاری عینا! آپ نے یہ سوچا بھی کیسے کہ آپ کسی کہانی پر تنقید کریں گی اور ہم ناراض ہوکر آپ کا خط شائع نہیں کریں گے۔ عزیز بہن یہ کالم کی آپ کی رائے کے لیے ہی ہے۔ تنقید ہو یا تعریف ہمیں اس سے فرق نہیں پڑتا۔ ہاں آپ کی ناراضی سے ضرور فرق پڑتا ہے بے شک خواتین ڈائجسٹ پڑھنے والے لاکھوں ہوں عینا عمر خان تو ایک ہی ہے نا۔

آپ کی کہانیاں لگ جائیں گی۔ تھوڑا انتظار کریں۔

☆☆

www.pklibrary.com

راحت جبین

# آنگنا پھول کھلیں گے

## سولہویں قسط

''امی! آپ سب مجھ سے کیوں ناراض ہیں۔''

''ہاں، ہمیں تو ناراض ہونے کا بھی حق نہیں ہے۔'' آسیہ کے لہجے نے تصدیق کی مہر لگائی۔ وہ واقعی میں بہت ناراض تھیں۔

''آپ نے رائے مانگی۔ میں نے رائے دے دی۔ اس میں اتنا خفا ہونے والی کون سی بات ہے۔ مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔'' ارم کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

''کیوں؟'' آسیہ نے فوراً پوچھا۔ عبیدا اٹھ کر صوفے پر جا بیٹھا ارم کے پاس جواب نہیں تھا۔

''مجھے معقول وجہ بتادو۔ تمہیں پڑھانے لکھانے کے بعد اب ہمارا یہی فرض ہے کہ وقت پر کوئی اچھا انسان دیکھ کر تمہاری شادی کر دیں۔ تمہیں شادی نہیں کرنی تو وجہ بتادو۔ تا کہ مجھے اس بات کا یقین ہو جائے کہ تم یہ وسیم کی وجہ سے نہیں کر رہیں۔''

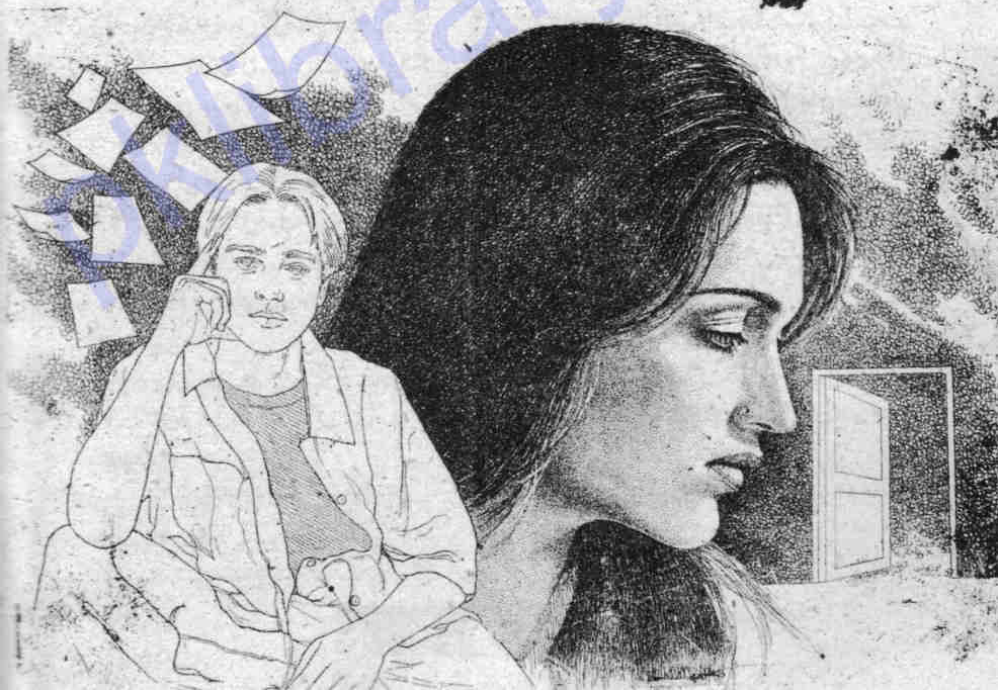

ارم نے بے یقینی سے ماں کو دیکھا وہ اتنی بڑی بات کیسے کہہ سکتی ہیں خود عبید کو بھی برا لگا۔
ارم کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ اس سے قبل کہ چھلک بھی جاتا وہ تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔
''امی؟ کیا ضرورت تھی اس سے یہ کہنے کی۔'' عبید نے جھنجلا کر کہا۔ آسیہ خاموشی سے کٹوری کے کنارے پر لگا تیل انگلی سے صاف کرتی رہیں۔ عبید اٹھ گیا۔
''تم ارم سے کوئی بات نہیں کرو گے۔'' آسیہ نے بے اختیار ٹوکا۔
''اور کیوں؟''
''کبھی کبھی کچھ چیزوں اور معاملات کو سامنے لانے کے لیے سختی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ وہ ذہن پہ سوار ہی رہتی ہیں۔ زندگی ماں کی گود ہے یا بچپن کا پالنا۔ جسے وہ جھولتی چلی جائے گی۔ زندگی ذمہ داریاں اٹھانے کا نام ہے۔''
آسیہ کا لہجہ سنجیدہ اور مدبر تھا۔
''وہ خود کو ابھی اس قابل نہیں سمجھ رہی۔''
''اسے اسی قابل تو بنا رہی ہوں۔'' انہوں نے خود کلامی کی۔ عبید کی کچھ سمجھ میں آیا یا نہیں مگر جھنجلا کر وہاں سے چلا گیا۔ آسیہ نے گہری سانس بھری۔ اور سامان سمیٹنے لگیں۔

☆☆☆

وہ کمرے میں داخل ہوئیں تو ارم بیڈ پر خاموش بیٹھی تھی ماں کو دیکھا تو کتاب اٹھالی۔ ''آج میرے منہ سے یہ بات سن کر بہت برا لگا نا تو کل کو کسی اور کے منہ سے سن کر کیسا محسوس ہوگا۔''

"کون کہے گا۔" ارم نے ناراضی سے ماں کو دیکھا۔
آسیہ پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ ارم کے ہاتھ سے کتاب لے کر سائیڈ پر رکھ دی۔
"کتابوں میں لکھی ساری باتیں سچ نہیں ہوتیں۔ کبھی کبھی ہم اپنی خواہش کے مطابق انجام بدل دیتے ہیں۔ آج۔ جو بات میں نے تم سے کہی ہے۔ کل کو بار بار ثانیہ کہے گی۔"
"ثانیہ کے ڈر سے میں کوئی بھی رشتہ قبول کرلوں۔" ارم کو غصہ آ گیا۔
"ہم کیا تمہیں اندھے کنوئیں میں دھکا دیں گے؟ ٹھیک ہے تمہیں یہ رشتہ پسند نہیں ہم کوئی اور دیکھ لیتے ہیں۔"
"مجھے شادی نہیں کرنی۔"
"کیوں؟"
"آپ لوگوں کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی۔" ہلکے سے تذبذب کے بعد ارم نے بولنا شروع کیا۔ "ساتھ رہنا چاہتی ہوں، آپ کا خیال رکھنا چاہتی ہوں۔"
"ہمارے پاس ہمارا بیٹا ہے۔"
"میں آپ کے معاملے میں ثانیہ اور عبید پر اعتبار نہیں کرسکتی۔" وہ دبے دبے لہجے میں چلائی۔
"اچھا۔ تو اس لیے ساری زندگی ہمارے ساتھ رہنا چاہتی ہو۔"
آسیہ نے حیرت سے اسے دیکھا تو اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ آسیہ کو ہنسی آ گئی۔
"جانتی تھی ایسی ہی کوئی بچکانہ وجہ ہوگی۔"
"آپ ہنس کیوں رہی ہیں۔"
"تمہاری بے وقوفی پر۔ ثانیہ اور عبید پر بھروسا نہیں۔ نہ سہی اللہ پر تو یقین رکھو۔ اور ہم کوئی اتنے بوڑھے تو ہیں نہیں کہ اپنا خیال خود نہ رکھیں۔ اللہ ہمارے ہاتھ پاؤں سلامت رکھے۔ تم ہماری زندگی میں اپنے گھر کی ہو جاؤ۔ ہمارے لیے اس سے زیادہ سکون اور خوشی کی بات ہو ہی نہیں سکتی۔" وہ ذرا سا رکیں۔
"کیونکہ خود اس بات پر غور کرو۔ جو بھائی اور بھابھی آج تمہارے نہیں ہیں۔ وہ کل کو تمہارے کیا ہوں گے۔"
وہ بہت دیر تک بیٹھی اسے زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتی رہیں۔ ارم قائل ہوئی یا نہیں۔ لیکن خاموشی سے سنتی ضرور رہی۔

☆☆☆

"اب بیڈ پر مت بیٹھنا۔ تیل کی آمیزش ہی نہیں جائے گی۔ اور بیڈ کراؤن بھی خراب ہوگا۔"
وہ بیڈ پر بیٹھنے ہی لگا تھا کہ ثانیہ نے ٹوک دیا۔ وہ رک سا گیا۔ گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ نکھری نکھری سی دل میں اتر گئی۔ وہ کرسی سے بیٹھ گیا۔
"کوئی بات نہیں کون سا تمہارے جہیز کا بیڈ ہے۔" عبید نے اپنے تئیں مذاق کیا تھا۔ ثانیہ کو سراسر طنز لگا۔
"بہت خوب آدھا دن اپنے گھر والوں کے ساتھ گزار کر جہیز کا طعنہ بھی دینے لگے۔"
"کیا ہو گیا۔ مذاق کر رہا تھا۔" عبید کو ہلکی سی شرمندگی ہونے لگی۔ "اب تو تمہیں میری ہر بات ہی بری لگنے لگی ہے۔"
"تم باتیں ہی ایسی کرتے ہو؟" عبید نے سنجیدگی سے اسے دیکھا؟
"کیوں دور دور رہتی ہو۔"

"میں دور رہتی ہوں یا تمہیں اپنے گھر والوں کا خیال زیادہ آنے لگا ہے۔ سارا سارا دن ان کے ساتھ لگے رہتے ہو۔"

"تم بھی تو پورا دن اپنے گھر میں ہوتی ہو۔"

"میں تو تمہیں اسپیس دے رہی تھی مجھ سے بور جو ہو گئے ہو۔"

"کوئی اتنی پیاری بیوی سے بور ہو سکتا ہے۔" عبید نے قریب ہونا چاہا چاہا۔ ثانیہ نے ناک چڑھالی۔ اسے تیل کی بو اچھی نہیں لگتی تھی۔

"چلو باہر چلتے ہیں۔ تمہارا موڈ بہتر ہو جائے گا۔"

"اس حلیے میں؟"

"شاور تو لینا ہی ہے۔"

"کھانا بھی باہر کھائیں گے۔" اس نے فوراً فرمائش جڑ دی۔ ثانیہ کا بس چلتا تو مہینے کے تیس دن کھانا باہر کھاتی۔

"کھانا۔" عبید تذبذب کا شکار ہوا۔ "یار باہر کا کھانا کھا کھا کر تو میرا پیٹ خراب ہو گیا ہے۔"

"میرا تو نہیں ہوتا۔ صاف کہہ دو کہ گھر میں فرمائش کی ہے۔"

"بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔" عبید نے بے چارگی سے کان کھجایا۔

"تو پھر جانے کی بھی کیا ضرورت ہے۔" وہ چڑ کر اٹھ گئی۔ عبید نے بے بسی سے اسے جاتے دیکھا۔

"کب سدھرے گی یہ لڑکی۔"

مگر وہ سدھرنے والی کہاں تھی۔ وہی روش۔ وہی روٹین۔ آسیہ کو سب سے برا تب لگتا جب وہ کچھ بھی بتائے بغیر گھر سے نکل جاتی۔ بس اس کی تیاری سے اندازہ ہوتا کہ وہ میکے جا رہی ہے یا کہیں اور تب ہی تو وہ ٹوکے بغیر رہ ہی نہ سکیں۔

"گھر کی بڑی ہونے کے ناتے مجھے اتنا تو پتا ہونا چاہیے کہ میری بہو کہاں جا رہی ہے۔"

سرخ اسٹائلش لباس میں ملبوس کہیں جانے کے لیے بالکل تیار ثانیہ کو تاؤ ہی آ گیا۔

"میرے شوہر کو پتا ہے۔ اب کیا سارے محلے کو پکڑ کر بتاؤں۔"

آسیہ کو چپ ہی لگ گئی۔ اس درجہ بدتمیزی پر ششدر۔ وہ تو کچھ بول ہی نہ سکیں۔ ارم سے برداشت ہی نہ ہوا۔

"امی سے کس لہجے میں بات کر رہی ہو۔"

"ایک تو یہاں ایک سے بڑھ کر ایک ناصح موجود ہے۔ اب تمہیں کیا تکلیف ہے۔" آسیہ کو احساس ہوا اس کا چپ رہنا زیادہ بہتر ہے۔ اس کی بدزبانی برداشت کرنا بہت مشکل۔

"بدتمیز تو پہلے ہی تھیں۔ یہ اندازہ نہیں تھا کہ بڑوں سے بات کرنے کی بالکل ہی تمیز نہیں ہے۔" برداشت تو ارم میں بھی نہیں رہی تھی۔

"تم سکھاؤ گی تمیز۔"

"بس کرو؟ کیا جاہلوں کی طرح لڑنے لگی ہو۔" آسیہ نے گھبرا کر دونوں کو ٹوکا۔

"آپ کی تربیت بول رہی ہے۔" ثانیہ نے دانت پیستے کہا۔

"منہ بند رکھو۔" ارم غصے سے چلائی۔ اس کا ماں سے اس لہجے میں بات کرنا برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

"تم میری خوشیوں سے جلتی ہو۔ خود تو تمہیں کوئی پوچھتا نہیں۔ تو اب میں اور میری خوشیاں برداشت نہیں

ہو رہیں۔" یہ بہت دنوں کا لاوا تھا۔ عبید کا اپنے گھر والوں کی طرف جھکاؤ۔ وہ اندر ہی اندر کڑھتی رہی تھی۔

"تمہاری ان گھٹیا باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ اور تمہاری خوشیوں کو جلانے کے لیے تمہاری حرکتیں ہی کافی ہیں۔" ارم کی زبان کی دھار بھی کافی تیز تھی۔

"اپنی حد میں رہو۔" ثانیہ چلائی۔ آسیہ ہکا بکا رہ گئیں۔ دونوں کو نجانے ایک دوسرے پر کس بات کا غصہ تھا۔

"بس کرو۔ ثانیہ جاؤ تم جہاں بھی جا رہی ہو۔" آسیہ نے جان چھڑانا چاہی۔

"ہاں مجھے بھیج دیں۔ اپنی لاڈو سے کچھ مت کہیں۔ عمر نکلی جا رہی ہے۔ کوئی رشتہ ملتا ہے تو بیاہ دیں۔ وسیم کے آسرے پر نہ رہیں۔"

اس کی سینڈل کی کھٹ کھٹ، تلخ الفاظ، ہتھوڑے کی طرح بہت دیر تک دونوں کی سماعتوں پر بجتے رہے۔

شکایت انہوں نے لگائی تھی۔ مگر رو رو کر حال سے بے حال ثانیہ ہو گئی۔

عبید تو ویسے بھی اس کے آنسوؤں پر پگھل جاتا تھا۔

اب اسے یہ تو نہیں پتا کہ بیوی میکے کے ساتھ سارا دن خوش گوار وقت گزارنے کے بعد اب رونے بیٹھی ہے اور نہ اس بات کی خبر تھی کہ ماں بہن نے سارا دن جلتے کڑھتے گزارہ تھا۔ آسیہ نے توفیق صاحب سے کہا تو انہوں نے مسکرا کر ارم کا پھولا ہوا منہ دیکھا۔ وہ غصے میں تھی اور چاہتی تھی کہ باپ ثانیہ کو ڈانٹے۔

"ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں دل پر لو گی تو سسرال میں کیسے گزارا کرو گی؟"

"یہ چھوٹی باتیں ہیں۔" ارم کے لہجے میں احتجاج تھا۔ "اس نے میرے ساتھ جو کیا اور اب جو کچھ سنا کر گئی۔ وہ"

"بیٹا!" انہوں نے نرمی سے بات کاٹی۔ "کوئی بھی انسان آپ کے ساتھ اس وقت تک برا نہیں کر سکتا جب تک رب نہ چاہے۔ ثانیہ کے اپنے تحفظات ہیں۔ آپ اس کی طرف سے دل صاف کر لیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کر لیتی ہوں۔ مگر ثانیہ کا دل کون صاف کرے گا جو کدورت سے بھرا ہوا ہے۔" ارم نے طنزیہ کہا۔ آسیہ دل گرفتہ سی خاموش تھیں۔

"آپ جانتے ہیں اس نے امی سے کتنی بدتمیزی کی ہے۔"

"اس کے لیے دعا کیا کرو کہ اللہ اس کے دل میں ہماری محبت ڈال دے کیونکہ کوئی بھی انسان نہ فرشتہ ہوتا ہے نہ شیطان۔ ہم ہمیشہ اچھائی اور برائی کے درمیان ڈگمگاتے رہتے ہیں اور یاد رکھو جیت ہمیشہ اچھائی کی ہوتی ہے۔"

ارم باپ سے کہنا چاہتی تھی۔ مگر احترام مانع تھا۔ بادل ناخواستہ چپ ہو رہی۔

"باقی رہی آپ کی امی سے بدتمیزی تو ظاہر ہے اس بات کی اجازت تو میں ہرگز نہیں دوں گا تم فکر نہ کرو۔ میں عبید سے بات کروں گا۔"

انہوں نے بیوی اور بیٹی کو تسلی دی۔

مگر عبید کی کوئی بھی تسلی ثانیہ کے دل کا مرہم نہ بن سکی۔

"تم تو یہی سوچتے ہو کہ میں سارا دن امی کی طرف گزار دیتی ہوں۔ تو یہی وجہ ہے۔ اس گھر میں کوئی مجھے کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ میں اپنی مرضی سے ایک کرسی تک ہلا نہیں سکتی۔ اپنی مرضی سے کچھ پکا نہیں سکتی۔ ہر بات کے لیے مجھے گھر والوں کی اجازت چاہیے۔ جب دل چاہتا ہے بے عزتی کر دیتی ہیں۔"

"ثانیہ۔ ثانیہ چپ کر جاؤ یار۔" عبید نے اپنے ہاتھوں سے اس کا چہرہ صاف کیا۔

اور چاہتیں کب یہ لوگ مجھے اپنا سمجھیں گے۔ کب یہ گھر میرا بنے گا۔"

"یہ تمہارا بھی گھر ہے ثانیہ۔ تمہارا جو دل چاہتا ہے کرو۔ کوئی تمہیں نہیں روکے گا۔ تم فکر مت کرو۔ میں ابو سے بات کروں گا۔"

"ہاں تم نے بات کی اور انہوں نے سمجھ لی۔" وہ روٹھ کر دور ہوئی۔

"جب تم اس طرح روتی ہو تو مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔" عبید نے اسے بازو کے گھیرے میں لے لیا۔

"تمہیں رلانے کے لیے نہیں لایا۔ تم خود کو گھر کے معاملات میں شامل کرنے کی کوشش کرو۔ باقی سب میں سنبھال لوں گا۔"

"سچ میں۔" اس نے ڈبڈباتی آنکھوں سے عبید کو دیکھا۔

"پاگل۔ ابھی بھی یقین نہیں ہے۔" وہ اس کی سمندر آنکھوں میں ڈوب گیا۔ اس نے باپ کی بات کو بے حد تحمل سے سنا۔

"ٹھیک ہے میں ثانیہ کو سمجھا دوں گا۔ وہ آئندہ امی سے بدتمیزی نہیں کرے گی۔"

توفیق صاحب کو خوشی ہوئی بیٹے نے بات کو سمجھا ہے۔

"لیکن آپ بھی امی اور ارم کو سمجھا دیں۔ اسے گھر کے کاموں میں حصہ ڈالنے دیں۔ کچھ اپنی مرضی سے کرے گی تو اسے بھی خوشی اور آزادی کا احساس ہوگا۔"

آسیہ کا تو سن کر ہی بی پی ہائی ہو گیا۔

"میں نے کس دن اسے گھر کے کاموں میں شامل ہونے سے روکا ہے۔"

"اس نے یہ نہیں کہا۔" توفیق نے سمجھانا چاہا۔

"مطلب تو یہی ہے۔" وہ ناراض ہوئیں۔

"امی بس کریں۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بی پی ہائی کریں گی۔ یہ تو روز کا تماشا ہے۔" ارم نے ماں کو تسلی دی۔ مگر طنزیہ انداز۔ توفیق پہلو بدل کر رہ گئے۔ اس گھر کے ہر فرد کا لہجہ بدل رہا تھا۔

☆☆☆

میٹھے شربتوں جیسے لہجے کڑواہٹ میں ڈھلنے لگے تھے۔

آسیہ نے بھی سوچ لیا اب دخل اندازی نہیں کریں گی۔

ارم کو بھی سمجھا دیا۔ وہ کان لپیٹ کر لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گئی۔

زندگی میں کرنے کے لیے اور بھی بہت کچھ تھا۔

مگر چنے کی دال دیکھ کر آسیہ پھر ٹوکے بغیر نہ رہ سکیں۔

"گھر میں چنے کی دال کون کھاتا ہے۔"

"میں۔" مسالاجات کا جائزہ لیتی ثانیہ نے ترنت جواب دیا۔

"اچھا ساتھ میں ایک سبزی بنالو۔ میں کاٹ دیتی ہوں۔" وہ سبزی کی ٹوکری کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ظاہر ہے گھر میں صرف ثانیہ نے تو کھانا نہیں کھانا تھا۔ گوشت ڈال کر کوئی سی بھی سبزی سب ہی شوق سے کھا لیتے۔

"میں دو دو ہانڈیاں نہیں بنا سکتی۔ سب یہی کھالیں گے۔" ثانیہ نے جواب دیا۔ یہ سراسر انہیں تاؤ دلانے والی بات تھی۔ مگر انہیں تحمل سے کام لینا تھا۔

"اچھا پھر رائتہ اور سلاد بنالینا اور ساتھ میں۔"

"آنٹی۔ پلیز آپ اپنے کمرے میں چلی جائیں۔ آپ اس طرح دخل دیتی رہیں گی تو مجھ سے کچھ نہیں

بنے گا۔"

اف۔ وہ کس قدر بدتمیز لڑکی تھی۔

آسیہ اپنا غصہ پیتی بے عزتی کا احساس لیے کچن سے چلی گئیں۔

"اف۔ جان چھوٹی۔"

عبید کے آنے تک اس نے کھانا بنالیا۔ آسیہ اور ارم نے کچن میں جھانکا تک نہیں مگر ثانیہ کے کچن سے نکلنے کے بعد انہوں نے تھوڑی سی سبزی بنالی۔ پتا تھا توفیق اور ارم دال نہیں کھائیں گے۔ کھاتا تو عبید بھی نہیں تھا۔ مگر آج کھالے گا۔ انہیں کامل یقین تھا۔

"آج کھانا میں نے بنایا ہے۔" ثانیہ نے آتے ہی عبید سے بھی کہہ دیا۔

"جلدی فریش ہو کر آجاؤ۔ آج کھانا میں نے بنایا ہے۔"

"ارے واہ۔" وہ اسی کی خاطر خوش ہوا۔ ورنہ سارا دن آفس میں سر کھپانے کے بعد اتنی بھوک لگی تھی صرف کھانے سے مطلب تھا۔ کس نے بنایا سے نہیں۔

"مگر آنٹی کو اچھا نہیں لگا۔ انہوں نے اپنے لیے علیحدہ سے ہانڈی بنالی۔" اس کی موہنی صورت پر افسردگی کے بادل چھائے۔

"کوئی بات نہیں۔ تم نے تو اپنا شوق پورا کرلیا۔" عبید نے محبت بھری تسلی دی۔

"اب سب کے سامنے نقص مت نکالنے بیٹھ جانا۔" ثانیہ نے کوٹ اتارنے میں مدد کی۔

"میری مجال۔ جو کچا پکا پکاؤ گی کھالیں گے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ پکاتی کم ہوں۔ مگر اچھا پکالیتی ہوں۔"

وہ مسکرا کر کوٹ الماری میں رکھ کر اسے جلدی آنے کی تاکید کرتی چلی گئی۔

دال دیکھ کر توفیق صاحب نے سوالیہ نظروں سے آسیہ کو دیکھا۔ تو انہوں نے سبزی گوشت کا سالن سامنے کردیا۔

"آپ یہ لے لیں؟"

تب ہی ثانیہ کبابوں سے بھری ڈش۔ رائتہ۔ سلاد لے کر آگئی۔

"انکل! مجھے پتا تھا آپ لوگ دال نہیں کھاتے۔ اس لیے میں نے کباب فرائی کرلیے تھے۔" کباب دیکھ کر عبید کو بھی حوصلہ ہوگیا۔ ارم نے خاموشی سے سبزی ڈال کر کھانا شروع کردیا۔

"تم نے بتایا ہی نہیں کہ کباب تلنے ہیں۔ میں نے خواہ مخواہ دوسرا سالن بنالیا۔" آسیہ نے کہا۔

"میں نے بتایا تو تھا کہ کھانا میں بناؤں گی۔ تو ظاہر ہے سب کی پسند کا خیال رکھوں گی۔ مگر آپ کو تو مجھ پر اعتبار ہی نہیں۔" ثانیہ نے دال پلیٹ میں نکال کر عبید کے سامنے رکھی۔

"امی! اب تو آپ ریسٹ کریں۔ کچن آپ کی بہو سنبھال لے گی۔"

عبید نے بات پٹخی۔ ارم کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری۔

"کباب اچھے بنے ہیں۔" آسیہ کے کچھ بھی بولنے سے پہلے توفیق صاحب نے تعریف کردی۔

"کباب میں نے بنائے تھے ابو ثانیہ نے صرف تلے ہیں۔" ارم نے کسی کی طرف دیکھے بنا کہا۔

"اچھی بات ہے۔ مل جل کر کام کرنے میں برکت ہے۔"

"دال بھی اچھی بنی ہے۔" عبید نے ثانیہ کا دل رکھنے کو تعریف کی۔ ورنہ روٹی تو کباب کے ساتھ ہی کھائی تھی۔

"آج کھانے کی میز کا رنگ، ماحول اور سب کا برتاؤ بہت عجیب ہے۔"
توفیق صاحب نے بمشکل نوالہ حلق سے اتارا۔

☆☆☆

"اماں ہم جارہے ہیں۔" آصفہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ رابعہ اور سہیل تیار کھڑے تھے۔ وہ کچھ لمحے رابعہ سے نظریں نہ ہٹا سکیں۔ بچوں کی پیدائش نے بھی اس کے وجود کو ڈھلکایا نہیں تھا۔ کہ گھر کے سارے کام تو اب بھی اسی کے ذمے تھے۔ بس آصفہ اتنا ضرور کرتیں کہ وہ مصروف ہوتی تو بچوں کو دیکھ لیتیں۔ مگر اصل چیز تو اس کے چہرے کی شگفتگی اور اعتماد کے رنگ تھے۔ اس کی آنکھوں کی تابناکی لبوں کی مسکان۔

انہیں خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ ان کی بھتیجی پلس بہو اتنی خوب صورت ہے۔ سی گرین اسٹائلش سے کام والے سوٹ میں اس نے آج بالوں کی چوٹی نہیں بنائی تھی۔ بال کھلے چھوڑ کر تھوڑے سے بالوں میں کچر لگایا تھا۔

ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

"کیا ہوا رو کیوں رہی ہیں؟" سہیل بے چین ہوا۔

"اپنے نصیبوں کو رو رہی ہوں۔ اکلوتے بھتیجے کی منگنی اور پھوپھی کو کسی نے جھوٹے منہ بھی نہیں پوچھا۔"

رابعہ خاموش رہی۔ سہیل نے ماں کے پاس بیٹھ کر بازو آصفہ کے کندھے پر پھیلایا۔

"کیا کریں اماں؟ حالات ہی ایسے ہیں۔"

"تو رابعہ کو بھیجو تم کیوں جارہے ہو۔ جب تمہاری ماں نہیں جارہی۔"

انہوں نے سہیل کا ہاتھ پکڑا۔ رابعہ نے بے چینی سے سہیل کو دیکھا۔

زندگی میں کتنے کم موقعے تھے جب اسے اس طرح تیار ہو کر سہیل کے ساتھ جانے کا موقعہ ملا ہوگا۔ سہیل نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

"اچھا ٹھیک ہے جاؤ۔ جورو کا غلام۔" آصفہ کو لگا روک بھی لیا تو وہ اسی طرح منہ پھلائے بیٹھا رہے گا۔ ایک بیٹا پہلے ہی دور تھا۔ دوسرے کو کیسے کرتیں۔

"ہم جلدی آجائیں گے۔" سہیل نے ان کی رسمی اجازت کو ہی بہت جانا۔ اور بیوی بچوں کے ساتھ کھسکنے کی۔

آصفہ نے سارا غصہ فرخ کو کال ملا کر نکالا۔ سب اسی کی وجہ سے تو ہوا تھا وہ گولی نہ چلاتا تو ابھی تک بازی ان کے ہاتھ میں ہوتی۔

وہ اپنے دکھڑے رونے لگا۔

انجان شہر پیسے کی کمی، ڈھنگ کی ملازمت بھی نہیں۔

"مجھے واپس بلالیں اماں۔"

"کیسے؟ وہ بھی بے بسی سے رونے لگیں۔

"عبید اور ثانیہ سے کہیں، مجھے معاف کردیں۔

وہ فرخ کی بات سن کے ہی سن ہوگئیں۔ اب زندگی نے یہ رنگ بھی دکھانا تھا۔

☆☆☆

ارم نے۔ "محبت گمشدہ میری۔" ڈرامہ سیریل کی قسط ختم کی۔ اور چائے بنانے کے ارادے سے کچن کی طرف آئی۔ تو لاؤنج میں بیٹھی آسیہ کو دیکھ کر چائے کا پوچھنے لگی۔ جو کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھی۔

"ہاں بنالو۔ ثانیہ اور عبید سے بھی پوچھ لو۔" انہوں نے کمرے سے نکلتے عبید کو دیکھا۔ پھر عقب میں آتی

ثانیہ کو۔ ویسے والے ڈریس میں ملبوس وہ ویسے ہی کی دلہن لگ رہی تھی۔
''تم کسی شادی میں جارہی ہو؟'' ارم ٹھٹھک کر رکی۔ ایک ہی گھر میں حالات جیسے بھی ہوں۔ بول چال بند تو نہیں کی جاسکتی تھی۔
''میں نے بتایا تو تھا کہ ایک سہیلی کی منگنی ہے۔'' اس نے بے نیازی سے بال جھٹکے۔ اب یہ توجہات ہی فضول تھی کہ کب بتایا تھا۔ وہ عبید کے سامنے آرام سے مکر جاتی تھی۔
''کون سی سہیلی؟'' ارم نے اچنبھے سے پوچھا۔ تو عبید چونکا۔
''ہاں بھئی تم دونوں کی تو ساری فرینڈز کامن تھیں۔ اس نے تمہیں نہیں بلایا۔''
''تمہاری کہاں کسی سے بات چیت ہوتی تھی۔ میری ہی فرینڈ ہے۔'' وہ رکھائی سے کہتی عبید کو خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔ ارما الجھی الجھی اسے جاتے دیکھتی رہی جبکہ آسیہ عبید سے پوچھ رہی تھیں۔
''تم ساتھ نہیں جارہے۔''
''میں وہاں کون سا کسی کو جانتا ہوں۔ ثانیہ نے تو کہا تھا میں نے ہی ٹال دیا۔'' عبید ماں کے پاس بیٹھا۔ پھر ارم کو دیکھ کر کہنے لگا۔
''اب چائے بنا بھی لو۔''
''کم از کم چھوڑنے چلے جاتے۔ اس طرح اکیلی جائے گی۔'' آسیہ نے پھر ٹوکا
''وسیم آیا ہوا ہے۔ اس نے کہا، میں چھوڑ دوں گا۔''
آسیہ خاموش ہوگئیں۔
''آپ نے دوبارہ ارم سے بات کی؟'' ارم کو کچن میں جاتے دیکھ کر اس نے مدھم لہجے میں ماں سے پوچھا۔
''نہیں۔ تمہارے ابو نے منع کر دیا تھا۔'' آسیہ نے بیزاری سے کہا۔ ان کا بس نہ چلتا کہ کب ارم ہاں کرے اور وہ جلد از جلد اسے رخصت کریں۔

☆☆☆

وہ ڈھلتی شام کے رنگ دیکھنے صحن میں آئی تھی۔ مگر بیل سے نیچے گرے چڑیا کے بوٹ کو دیکھ کر جان نکل گئی۔ اس نے تیزی سے سر اٹھا کر بیل کے پتوں میں کھوجا۔ گھونسلہ اپنی جگہ موجود تھا۔ نجانے بچہ کیسے گر گیا۔ ماں چڑیا بھی غائب تھی۔
''یا اللہ مر تو نہیں گیا۔'' ارم نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے انگلی سے ہلایا تو بچے نے تیزی سے گردن کو حرکت دی۔ ارم کو تسلی ہوئی۔ اس نے ننھی سی جان کو اٹھا کر ہتھیلی پر رکھا۔ اس کے جسم پر ننھے ننھے بال نکل رہے تھے۔
''گندے بچے، تمہیں اتنی جلدی تھی اڑان بھرنے کی۔''
گھونسلہ دسترس سے دور تھا۔ اس نے برآمدے میں سے کرسی کھینچ کر ستون کے پاس رکھی۔ ستون کا سہارا لے کر کرسی پر چڑھی۔ مگر ایڑیاں اٹھا کر بھی گھونسلہ ہاتھ بھر کے فاصلے پر تھا۔ شامت یہ ہوئی کہ اسی وقت ماں چڑیا بھی وارد ہوگئی۔ اس کے ننھے سے شور نے آسمان سر پر اٹھالیا۔
''کچھ نہیں کر رہی تمہاری اولاد ہی واپس رکھ رہی ہوں۔'' ارم جھنجلا گئی۔ مگر اس کا بس نہ چلتا تھا کہ ارم کے سر پر ٹھونگے ہی مار دے۔ ادھر سے ادھر اڑتی چلاتی اپنی جان ہلکان کرتی رہی۔
تب ہی باہر بیل ہوئی۔

''اللہ کرے۔ابو یا عبید ہی آ گئے ہوں۔'' ارم نے جلدی سے نیچے چھلانگ لگائی۔ بچے کو احتیاط سے کرسی کی گدی پر رکھا۔اور بھاگ کر دروازہ کھولا پھر ٹھٹک گئی۔

دروازے کے عین سامنے سیاہ بڑی سی گاڑی کھڑی تھی۔دہلیز پر ایک بڑا سا بیگ نما بند شاپر۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے بیل سے ہاتھ ہٹایا۔اور سامنے آیا۔

مانوس سا اجنبی تھا۔پہچان میں نہیں آیا۔وہ الجھ کے پہچان کا مرحلہ طے کرتی رہی۔

سامنے والا بھی نجانے کیوں خاموش سا کھڑا رہا۔

''اس لڑکی کی باطنی خوب صورتی اس کے چہرے سے چھلکتی ہے۔اس کو دیکھو گے تو نگاہ نہ ہٹا پاؤ گے۔''

ماں نے کہا تھا۔انہوں نے کبھی ارم کے خدوخال کی تعریف نہیں کی تھی۔ہمیشہ اس کے اندر کی خوب صورتی اور خوب سیرتی کی تعریف کرتیں۔

''آپ تو یوں کہتی ہیں جیسے اس سے بہت ملی ہو۔''

وہ چڑ جاتا۔

''جو بھی اس سے ملتا ہے یہی کہتا ہے۔'' وہ مبہم سا مسکراتیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ جسے بہو بنا کر اپنے گھر میں لانے والی تھیں اس کے بارے میں پوری معلومات نہ رکھتی ہوں۔

''یہ کچھ سامان ہے۔ہو سکے تو پہنچا دو۔'' وہ گھر سے نکلنے ہی والا تھا جب انہوں نے حکم صادر کیا۔

''ڈرائیور کے ہاتھ بھیج دیں۔'' عفان کو اپنے کسی کام سے جانا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ماں کا جنازہ پڑھنے کے لیے بھی ڈرائیور کو بھیج دینا۔دفن بھی نوکر ہی کر دیں گے۔''

''اف۔'' ایک تو وہ جذباتی بہت جلد ہو جاتی تھیں۔اب اتنے کاری وار کے بعد وہ مزید انکار کیسے کرتا۔

''ٹھیک ہے کہاں بھجوانا ہے۔''

''بھجوانا نہیں خود دینے جانا ہے۔''

''مادام! میں وہی پوچھ رہا ہوں۔'' سر تسلیم خم کرنے کے سوا چارہ ہی کوئی نہ تھا۔پتا سنتے ہی وہ چونک گیا۔مشکوک نظروں سے ماں کو دیکھا۔''کرنا کیا چاہتی ہیں؟''

''فکر نہ کرو۔وہیں پکڑ کر تمہارا نکاح نہیں پڑھوائیں گے۔ان کی بیٹی ان پر اتنی بھاری نہیں ہے۔''

آج تو ان کی زبان دودھاری تلوار بنی ہوئی تھی۔

ایک ہلکی سی سوچ نے عفان کے اندر انگڑائی لی۔اس کی آنکھوں سے چھلکتی سوچ نے ہاجرہ بیگم کو فوراً ہی الرٹ کر دیا۔

''خبردار جو تم نے وہاں جا کر کوئی بھی بات کی۔جو بھی بات ہوگی۔میں کروں گی۔''

''آپ تو بہت ہی جینئس ہیں خاتون۔'' وہ ان کے انداز کی درستگی پر مسکرایا۔

''فرمائیے۔'' ارم کی ہلکی عجلت بھری آواز پر چونکا۔سفید اور لیمن کنٹراسٹ کے سوٹ میں ملبوس کھلتی ہوئی رنگت والی لڑکی کچھ عجلت میں دکھائی دی۔

''والدہ نے یہ سامان بھیجا ہے۔''

''والدہ؟'' ارم نے استفہامیہ انداز میں دریافت کیا۔

''میری والدہ۔'' کیا جواب تھا۔

''آپ کون؟'' اب وہ یہی پوچھ سکتی تھی۔ورنہ دل تو چاہ رہا تھا کہ پوچھے کہ آپ کی والدہ اس ملک کی پرائم منسٹر ہیں۔جو بنا نام جانے بوجھ لے گی۔

''عفان۔'' عفان کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ''میری والدہ ہاجرہ بیگم نے یہ کچھ سامان بھجوایا ہے۔''

''ارم! مہمان کو اندر لے آؤ۔'' آسیہ نے برآمدے سے ہی آواز لگائی۔ انہیں ابھی ابھی ہاجرہ بیگم کی کال آئی تھی۔

''ملتان سے کچھ کڑھائی والے کرتے اور کھسے منگوائے تھے۔ امید ہے آپ کو اور ارم بیٹی کو پسند آئیں گے۔''

ارم کے دماغ نے ان ناموں کو کھنگالا تو فوراً ہی رستہ چھوڑ دیا۔ وہ اندر آ گیا۔ آسیہ کے ساتھ سلام دعا ہوئی۔ سامان حوالے کیا۔ ارم نے دروازہ بند کیا اور سر پر چیختی چلاتی چڑیا کو بے بسی سے دیکھا۔

عفان کا ارادہ یہیں سے واپسی کا تھا۔ مگر آسیہ اصرار کرنے لگیں۔ عفان کا ایک ہاتھ کرسی پر ٹکا تھا۔

اگر اس نے بے دردی سے کرسی کھینچ دی۔ اگر بچہ نیچے گر گیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی۔

تب ہی عفان کی نگاہ بچے پر گئی اور توجہ چڑیا کے شور پر۔

ارم نے جلدی سے بچے کو اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس سے قبل عفان نے بچے کو چٹکی سے پکڑ کر اٹھالیا۔

''یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔'' وہ تقریباً چلا اٹھی۔

عفان نے ایک نگاہ اس پر ڈالی۔ جس کے چہرے پر سراسیمگی چھائی تھی جیسے وہ بچے کو پھینکنے والا ہو۔

دوسرے لمحے وہ ایک پاؤں کرسی پر رکھ کر بلند ہوا۔ (اور ارم کی گردن اس کے ساتھ) اور سہولت سے بچے کو گھونسلے میں رکھ دیا۔

ارم کی جان میں جان آئی۔

وہ پاس اترا تو نگاہ ارم کی حیران نگاہ سے الجھ گئی۔

''کیا میں نے کچھ غلط کر دیا۔''

''ن۔نہیں۔ شکریہ آپ کا۔'' وہ سٹپٹائی۔

آسیہ مسکرا کر عفان کو اندر لے گئیں۔ وہ جو باہر سے پلٹ جانے کا ارادہ لے کر آیا تھا۔ ارم کے ہاتھ کی چائے پی کر ہی گیا۔

☆☆☆

روشنیوں اور رنگوں کا خوب صورت امتزاج۔ نتاشا کے گھر کا لان تقریب کی مناسبت سے بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ دادی کی تو آنکھیں خیرہ ہو کر تھکنے لگیں۔ وسیم نے ان کے لیے وہیل چیئر کا بندوبست کیا تھا۔ وہ تو پہلے بیٹھنے سے ہی انکاری ہو گئیں۔

''میں کیا معذور ہوں۔''

''تو اب کیا دو بندے کندھوں پر سوار کرا کر لے جائیں گے۔'' نادرہ چڑ گئیں۔ ''دو قدم چلنا محال ہے۔ ابھی معذوری میں کوئی کسر ہے۔''

''تمہارا بس چلے تو چار کندھوں پر سوار کرا کے قبرستان ہی بھیج دو۔''

''اے کاش!'' نادرہ نے یہ الفاظ منہ میں دبا لیے۔

یہ مرحلہ طے ہوا تو وہ پھر اینٹھ گئیں۔

''میری بیٹی کے بغیر یہ منگنی کیسے ہو سکتی ہے اکلوتی پھوپھی ہے۔''

''تو آپ بھی بیٹی کے ساتھ ہی رہ لیں۔ اکلوتی پھوپھی نے جو چن چڑھائے تھے۔ وہ ساری دنیا کو نظر آتے

ہیں۔"

دادی کا پورا ارادہ شادی میں ناراض رشتے دار کا کردار نبھانے کا تھا۔ مگر اب نادرہ شیرنی بنی تھیں۔ دادی کو پسپا ہونا ہی پڑا۔ اب وہ ایک کونے میں بیٹھی رابعہ کے کان کھا رہی تھیں۔ کہ کون لڑکی کا کیا لگتا ہے۔ پتا تو کسی کو بھی نہ تھا۔ ان سب کو ایک طرف بٹھا کر فل پروٹوکول دیا گیا تھا۔ مگر یہ پروٹوکول محض اسی ٹیبل تک محدود تھا۔

اسٹیج پر وسیم اور نتاشا موجود تھے۔ ان ہی کے گرد سب گھوم رہے تھے۔ یا پھر ثانیہ تھی جو پورے لان میں پورے طمطراق سے گھومتی سب سے مل رہی تھی۔ جب دل چاہتا اسٹیج پر چڑھ جاتی۔ نادرہ تو ویسے ہی اتنے لوگ۔ ان کا ٹھاٹھ باٹھ اور پہناوے دیکھ کر دبک گئیں۔

"اوئی ماں۔ دیکھنا اس عورت کے تو بازو ہی نہیں ہیں۔"

دادی کی بات پر مارے ہمدردی سب کی نظریں اس خاتون کی طرف اٹھیں۔

"دادی قمیض کے بازو نہیں ہیں۔" رابعہ بڑبڑائی۔

"توبہ۔ توبہ۔ چٹا چاٹا اور حرکتیں دیکھو۔"

"اے لو۔ اس کے تو گٹے" (ٹخنے) بلکہ آدھی ٹانگ ہی ننگی ہے۔ اللہ اللہ۔

قیامت قریب ہے۔ اللہ اس کو ہدایت دے۔ ایسی بے حیائی۔"

رابعہ کو لگا ثانیہ نے ٹھیک انہیں اس کونے میں بٹھایا ہے۔ دادی کے تبصرے سن سن نادرہ کا بی پی ہائی ہونے لگا۔

"تیرے پرس میں کوئی ٹیپ ہے؟

"نہیں۔" رابعہ نے حیران ہو کر ماں کو دیکھا۔

"گونگے کا گڑ ہی رکھ لیتی۔" نادرہ نے دانت پیسے۔

رابعہ نے بمشکل ہنسی دبائی۔

"تم یہاں کیوں بیٹھی ہو جاؤ ثانیہ کے پاس۔" اسٹیج پر براجمان ثانیہ کو دیکھ کر نادرہ نے رابعہ کو ٹہوکا دیا۔

"میں ٹھیک ہوں امی!" وہ کیمرہ۔ مووی کا سامنا کرنے سے گھبرا گئی۔

وسیم کی سرگوشیاں۔ نتاشا کی ہنسی۔

"تم دونوں کو ملانے کے لیے میں نے کیا کچھ کیا ہے۔ کتنی قربانی دی ہے بھول مت جانا۔ سمجھو اپنا گھر داؤ پر لگا دیا تھا۔ ثانیہ نتاشا کے کان پر جھکی۔

"فکر نہ کرو۔ مجھے یہ بات ہمیشہ یاد رہے گی۔" نتاشا مسکرائی۔ "اور تمہیں اس کا صلہ بھی خوب ملے گا۔"

"بالکل ایسی نند نصیب والوں کو ملتی ہے۔" ثانیہ فخر سے مسکرائی۔ اور اس کی بات پر نتاشا کو ہنسی آ گئی۔

ایک بھید بھری ہنسی۔ جس کا مطلب صرف نتاشا سمجھتی تھی۔ اور یہ بھید بہت خاموشی سے کھلا تھا۔ ارم پر۔

☆☆☆

وہ سونے کی تیاری میں تھی۔

دھیان تو آج کی شام کے کسی کونے میں اٹک گیا تھا۔

"جو چڑیا کے بچے کے لیے درد رکھتا ہے۔ سوچو تمہیں کتنا سنبھال کر رکھے گا۔"

موبائل کی بار بار میسج ٹون نے آسیہ کی بات کو دبا دیا۔

موبائل کو اٹھاتے اس کا دھیان پھر بھٹکا۔

("کیا؟ میں نے کچھ غلط کر دیا۔)

"یا اللہ ہم لڑکیوں کا دھیان اتنی جلدی کیوں بھٹک جاتا ہے۔" خود کو سرزنش کرتی ارم نے موبائل اٹھایا۔
واٹس ایپ پر ایک کے بعد ایک تصویریں کھلنے لگیں۔
وہ مانند بت ٹکر ٹکر ان تصویروں کو دیکھتی رہی۔ آنکھ حیران تھی کہ پلک جھپکنا بھول گئی۔
عبید کو نہ جانے اس سے کون سا کام آن پڑا تھا جو پکارتے ہوئے اندر آ گیا۔ ارم نے بہت ہی بے توجہی سے اس کی بات سنی۔ وہ ٹھٹکا پھر قریب آیا۔
"تم ٹھیک ہو۔"
ارم نے خاموشی سے موبائل کا رخ عبید کی طرف کیا۔
وہ ششدر سا رہ گیا۔
ارم ایک کے بعد ایک تصویر سوئپ کرتی گئی۔
"تمہاری آنکھیں اس دن کھلیں گی۔ جس دن نتاشا اور وسیم کی منگنی ہو گی۔ اس نے نتاشا کے ساتھ مل کر میرا تماشا بنا دیا۔ مگر تمہیں کوئی فرق نہیں پڑا۔"
ہر تصویر میں ثانیہ نمایاں تھی۔ عبید کی آنکھوں میں نمی اتری۔
"میرا اعتبار لوٹا دو۔ جو ایک بھائی کو اپنی بہن پر تھا کہ میں جھوٹ بھی کہوں گی تو وہ نبھائے گا۔ تم نے تو میرے سچ کو ہی جھوٹا بنا ڈالا۔" اس سے قبل کہ بہن کا شکوہ آنکھ سے ٹپک جاتا۔ عبید پلٹا۔
"لیکن......" وہ ارم کی آواز پر رکا...... "اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مجھے وسیم کی منگنی کا دکھ ہے۔"
اس نے موبائل بند کیا۔
"میں صرف اپنی سچائی ثابت کرنا چاہتی تھی۔"
عبید نے قریب آ کر دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھے۔ اس کے ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ۔
وہ جیسے پھر سے بھائی کے حصار میں آ گئی تھی۔ جیسے تپتی زمین پر کسی نے چھایا کر دی ہو۔
ارم نے سکون سے ٹیک لگائی۔ باپ نے کہا تھا۔ "کبھی کبھی اللہ دوسروں کے شر میں ہمارے لیے خیر رکھ دیتا ہے۔ اس لیے ان کے حق میں ہمیشہ دعا کرنی چاہیے۔"
وہ مسکرائی اور آنکھیں موند لیں۔
"شکریہ ثانیہ تمہاری اس حرکت نے مجھے میرا بھائی واپس کر دیا۔"

☆☆☆

خالی گھر کے در و دیوار پر خاموشی کا راج تھا اور اندر سوچوں کا اژدھام اودھم مچا رہا تھا۔
اپنی کوتاہیوں کا احساس تھا۔
یا ماضی کی غلطیوں کا پچھتاوا۔
رشتوں کے بغیر رہنا اتنا مشکل، وہ رشتے جنہیں خود انہوں نے اپنے لیے آزار بنا لیا تھا۔
وہی رشتے طاقت تھی۔ زندگی کی روانی۔ احساسات و جذبات کی گرمائش لیے۔
انہیں ماں یاد آئی اور بھائی۔
اعصاب جھنجھنا سے گئے۔ خون کی روانی میں توازن نہ رہا۔ دھڑکن بے ترتیب ہوئی۔ انہیں تو لگا وہ آج خالی گھر میں تنہا بے یار و مددگار ہی مر جائیں گی اور صبح لوگ ان کی اکڑی ہوئی لاش برآمد کریں گے۔
مگر کسی مہربان ہاتھ نے انہیں تھام کر سہارا دے دیا۔ رشتے اسی لیے بنائے گئے ہیں نا کہ کدورتیں پالنے کے لیے انہیں ہوش ہسپتال میں آیا۔

ایک طرف بھتیجی کھڑی تھی تو دوسری طرف بھائی۔ بیٹا ڈاکٹروں کے پاس بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔
وہ رو ہی پڑیں۔
''آپا مت روئیں۔'' شبیر نے ان کے آنسو صاف کیے۔
''تمہیں کیا پتا میرے دل میں کیا کیا خیال آ رہے تھے۔ میں مر جاتی تو اکیلا سہیل کیا کیا کرتا۔ فرخ بھی یہاں نہیں اور تمہارا کیا پتا میرے جنازے کو کندھا دینے بھی نہ آتے۔''
''پھوپھو، ایسی باتیں مت کریں۔'' رابعہ نے نرمی سے ٹوکا۔ شبیر بھی سر جھکا کر آنکھیں صاف کرنے لگے۔
''شکر ہے اللہ کا تمہاری صورت دیکھ لی۔ اماں کو بتایا؟''
''نہیں آپا، وہ پریشان ہو جاتیں۔''
''ہر کسی سے غلطی ہوتی ہے۔ ہم سے بھی ہو گئی۔ معاف کر دو۔'' انہوں نے ہاتھ اٹھانا چاہا۔ شبیر نے روک دیا۔ ڈرپ لگی تھی۔
''سب کچھ بھول کر آیا ہوں آپا! بڑی بہن نہیں ہمیشہ ماں سمجھا ہے۔''
''اب آ گئے ہو تو ایک اور مان رکھ لو.....''
''آپا! حکم کریں۔''
''عبید اور ثانیہ سے بھی کہو کہ میرے فرخ کو معاف کر دیں۔ پرائے شہر میں ٹھوکریں کھا رہا ہے، نوکری بھی نہیں مل رہی۔''
''سہیل تو بھائی ہے۔ کئی بار پیسے بھی بھجوا چکا ہے۔'' شبیر نے رابعہ کو دیکھا۔ رابعہ کو سمجھ میں نہ آیا کیا کہے۔
''ٹھیک ہے آپا، اس سے کہیں واپس آ جائے۔ بس ثانیہ اور عبید کے راستے میں نہ آئے۔'' شبیر نے گہری سانس لے کر کہا۔
''ان کے ساتھ کوئی واسطہ نہ رکھے۔''
''بالکل نہیں رکھے گا۔'' وہ روتے روتے ہنس پڑیں۔
دل و دماغ سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا۔

☆☆☆

دادی تو بہت ہی بدمزہ ہو کر گھر لوٹیں۔ انہیں کچھ بھی متاثر نہ کر پایا۔
''سب دکھاوا لگتا تھا نئی نئی دولت ہاتھ لگی ہے۔''
انہیں اسی بات کا قلق تھا۔ کسی نے لفٹ نہیں کروائی۔
''لڑکے والوں کو ایک کونے میں کھڈے لین لگا دیا۔ انگوٹھی لڑکے لڑکی نے خود ہی ایک دوسرے کو پہنا دی۔ کسی نے اسٹیج پر بلایا تک نہیں۔''
دادی کی بات پر کسی نے کان نہ دھرے۔ سب دوسری طرف سے ملے تحائف دیکھ رہے تھے۔ پھر وسیم اپنا موبائل لے کر چھت پر کھسک گیا۔ شبیر نجانے کہاں غائب تھے۔ ثانیہ اور نادرہ تنہا رہ گئیں۔
''تم تو کہہ رہی تھیں بہت امیر کبیر لوگ ہیں۔ مگر گھر اور کاروبار میں نتاشا کے چچا اور تایا کا بھی حصہ ہے۔'' کچھ نہ کچھ سن گن تو مل ہی گئی تھی۔
''اماں! اب یہ باتیں وسیم بھائی کے سامنے نہ کر دینا۔ اتنے ارب پتی ہوتے تو کیا وسیم کو پسند کرتے۔ پھر بھی ہم سے لاکھ درجے بہتر ہیں۔ جہیز سے گھر بھر جائے گا۔ وسیم بھائی کو گاڑی مل جائے گی۔ ساری عمر وسیم بھائی

کو سپورٹ رہے گی۔ آپ کی طرح بیٹی کو خالی ہاتھ رخصت نہیں کریں گے۔" ثانیہ نے چڑ کر تقریر جھاڑی۔

"ہاں اب یہی طعنے دیتی رہنا۔ تمہارے باپ کے پاس کیا تھا۔"

"اچھا چھوڑیں گفٹ کتنے قیمتی ملے ہیں۔" ثانیہ نے دھیان ہٹایا۔

"سارا پیسہ کپڑے جوتے پر ہی لگا دیا۔ اس کی جگہ سونے کی بالیاں بن جاتیں۔" انہوں نے بے زاری سے بکھرے سامان کو دیکھا۔

"گولڈ بھی ملے گا مگر شادی پر کہہ دوں گی۔ ہمارے ہاں ساس کو سونے کا سیٹ ڈالتے ہیں پھر وہ مجھے دے دینا۔" اس نے مشورہ دے کر سامان سمیٹنا شروع کیا۔ ماں کو بریندز کی کیا سمجھ سب کچھ اسی کے پاس جانا تھا۔

"اب عبید کو کب بتاؤ گی؟"

"بس ارم کی کہیں بات طے ہو جائے تو بتا دوں گی۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

تب ہی شبیر چلے آئے۔

"ابا! آپ کہاں چلے گئے تھے۔"

"تمہاری پھوپھی کو مٹھائی دینے گئے ہوں گے۔" نادرہ نے ٹھٹھا اڑایا۔

"ہاں وہیں تھا۔" وہ کہہ کر ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھ گئے۔ نادرہ نے بولنا شروع کر دیا۔ اگلے پچھلے سارے گناہ گنوا دیے۔ وہ منہ لٹکائے بیٹھے رہے۔ آخر ثانیہ کو ہی ٹوکنا پڑا۔

"بس کریں اماں!"

"میں نے کہا اب پٹاری کا منہ کھول بھی دو۔ جو سانپ چھپا کر لائے ہو۔ اب کس کو ڈسے گا۔ اب گئے تھے تو صلح نامہ تو لکھ کر ہی آئے ہوں گے۔"

"وہ بہت بیمار ہے۔"

"ڈاکٹر نے جواب دے دیا؟" اس عورت کی زبان، شبیر نے غصے سے بیوی کو دیکھا۔

"نہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں آپ اور آپ کی بیٹی جتنی چاہیں خدمتیں کریں۔ بس مجھے جانے کو نہ کہنا۔" نادرہ نے لہجہ بدلا۔ پھر منہ میں بڑبڑائیں۔ "مری کو بخشوں تو بڑی بات ہے۔"

"مریں آپا کے دشمن۔"

"کیوں؟ میرا قصور کیا ہے۔" وہ تنک کر گویا ہوئیں۔

"اماں....." ثانیہ کو ہنسی آ گئی۔

"سمجھاؤ اپنی ماں کو۔ اپنوں کے درمیان بہت باتیں ہو جاتی ہیں اور معاف بھی کر دی جاتی ہیں اور اب تو وہ کچھ مانگ بھی نہیں رہی۔"

"مطلب کچھ مانگ لیا۔" نادرہ نے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

"معافی..... معافی مانگ رہی ہے۔" شبیر نے دانت پیسے۔

"میں نہ کرنے لگی معاف..... بھری برادری میں تماشا بنا دیا۔ میری بیٹی کو جان سے مارنے کی کوشش کی۔"

"تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔" وہ غصے سے اٹھ گئے۔

"اب مروڑ اٹھ رہے ہیں۔ اس گھر کی خبریں وہاں جو نہیں پہنچتیں۔" نادرہ تلملائیں۔ "اب نہ اس کی دال گلنے دوں گی۔"

"بالکل۔" ثانیہ کھڑی ہوئی۔ "میں سونے جا رہی ہوں۔ بہت تھکن ہو رہی ہے۔"

"عبید کو بتا دیا یہاں رک رہی ہو۔"

www.pklibrary.com

''بتادوں گی۔''

☆☆☆

عبید نے سلگتی آنکھوں سے میسج کو دیکھا اور موبائل رکھ دیا۔

بے یقینی اتنی تھی کہ وہ کچھ سوچ بھی نہیں پا رہا تھا۔

جن سے محبت کی جاتی ہے ان کی ہر غلطی ادا لگتی ہے۔ نظر انداز ہو جاتی ہے۔ معاف کی جا سکتی ہے۔ مگر اپنی ذات تک۔ جب محبوب کی غلطیاں آپ کے پیاروں کی خوشیاں نگلنے لگیں تو۔ وہ اپنی ہر خوشی ثانیہ کی ہر غلطی پر وار سکتا تھا۔

مگر وہ ثانیہ کی یہ غلطی معاف نہیں کر سکتا تھا۔ جس نے اس کی بہن کی خوشیاں کھالی تھیں۔ دل کسی نے مٹھی میں بھینچ رکھا تھا۔

عبید نے بے اختیار سینے پر ہاتھ رکھا۔

جہاں پہلے محبت دھڑکتی تھی۔ وہاں اب درد تھا۔

☆☆☆

دکھ سے آسیہ کا دل پھٹ رہا تھا۔ ارم کہتی رہی سب نے اسے ہی جھٹلا دیا۔ مگر وہ سچی تھی۔ اس دن گھر میں جو تماشا ہوا سب ثانیہ کی ملی بھگت سے ہوا۔ کاش وہ جاہل سی عورت ہوتیں تو اسی وقت ثانیہ کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دیتیں۔

''حوصلے سے کام لیں۔'' توفیق نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

''اس لڑکی کو سب کچھ بھول کر پورے خلوص سے سیاہ کر لائی تھی۔ اس لیے کہ وہ میری بیٹی کے خلاف سازشیں کرے۔'' وہ جذباتی ہو رہی تھیں۔

عبید نے شرمندگی کے ساتھ سر جھکا لیا۔

''اچھا بس اس نے اپنی سوچ کے مطابق جو کرنا تھا کر لیا۔ عبید جانتا ہے اسے کیسے ہینڈل کرنا ہے۔'' عبید نے سر اٹھا کر باپ کو دیکھا جنہوں نے آہستگی سے گیند اس کے کورٹ میں ڈال دی تھی۔

''لیکن ہماری ارم کے لیے بہت اچھا ہو گیا۔ مجھے وہ گھرانہ ارم کے لیے ویسے بھی پسند نہیں تھا۔ اللہ نے ہماری بیٹی کا نصیب بہت اچھی جگہ کھولا ہے۔''

''اب اس بات کو یہیں ختم کرو۔ ارم کو بھی بلا لو۔ مجھے سب سے ضروری بات کرنا ہے۔''

☆☆☆

پورے بنگلے میں گویا ایمرجنسی نافذ تھی۔ چوکیدار مالی بنا ہوا تھا۔ اس کی بیوی صفائی ستھرائی میں لگی تھی۔ مسرت کچن میں مصروف تھی۔ اگرچہ کھانا آرڈر کر دیا گیا تھا۔ بی بی جان کی اسٹک آج پورے گھر میں کھلی کھیل رہی تھی۔ نہ تھکاوٹ تھی نہ بیماری کا احساس بلکہ آج میں اوپر آسمان نیچے والی سچوئشن تھی۔

''کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ ہر چیز پرفیکٹ ہو۔''

وہ سانس لینے کو کچن میں آ ٹھہریں۔

''بی بی جان، ایک بار جا کر لڑکی سے مل تو لیتیں۔ تصویر دیکھ کر کیا اندازہ ہوتا ہے۔ بولتی کیسا ہے۔ چلتی کیسے ہے یونہی رشتہ ڈال دیا۔'' مسرت کو سو اعتراض تھے۔

''سب پتا ہے مجھے تم فکر نہ کرو۔'' وہ مطمئن تھیں۔

''انہوں نے بھی صاحب سے ملے بغیر ہاں کر دی۔'' اس نے اگلا اعتراض داغا۔

''لڑکی والے ہتھیلی پر سرسوں نہیں جماتے جب سے رشتہ گیا ہے۔ خوب چھان پھٹک کروائی ہوگی تب ہاں کی ہوگی۔ میں تو شکر کر رہی ہوں انہوں نے اس گدھے کو پسند کر لیا اور اسے بھی لڑکی پسند آ گئی۔''

انہیں اچھی طرح یاد تھا جب چند دن پہلے عفان ارم کے گھر سے ہو کر آیا تھا۔

''کیسی تھی؟''

''اچھی تھی گریس فل سادہ رکھ رکھاؤ والی خاتون تھیں۔'' عفان کی بات پر ان کا منہ کھل گیا۔

''میں نے تمہارے لیے کوئی خاتون تو پسند نہیں کی۔''

''اچھا تو آپ لڑکی کا پوچھ رہی ہیں؟'' اس کا لہجہ سنجیدہ مگر اندر کہیں ہلکی سی شرارت چھلکتی تھی۔ وہ جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ وہ جواب گم ہو گئی تھی۔

''نہیں اس کی ماں کا پوچھ رہی ہوں۔'' وہ کلس کر گویا ہوئیں۔

''میں بھی تو ان ہی کا بتا رہا ہوں۔'' اس نے حیرت سے بھنویں اچکائیں۔

پھر دونوں کو ہنسی آ گئی۔ انہیں یاد بھی نہ تھا کہ آخری بار وہ ماں بیٹا کب ایک ساتھ ہنسے تھے۔ وہ لڑکی اس گھر کی خوش نصیبی بن کر آ رہی ہے۔ انہیں یقین ہونے لگا۔

''وہ اچھی ہے بی بی جان۔ اس میں بناوٹ نہیں ہے۔'' چند ثانیے کے بعد عفان نے ایمان داری سے بتایا۔

''مجھے لگا یہی وہ لڑکی ہے جس کے ساتھ دکھ سکھ کی سانجھ کا رشتہ قائم ہو سکتا ہے۔'' تب سے وہ محو دعا تھیں۔

''یا اللہ اس لڑکی کو عفان کا نصیب بنا دے۔''

اور جب توفیق صاحب نے کال کر کے ہاں کی۔ انہوں نے فوراً سب کو ڈنر پر انوائیٹ کر لیا۔ وہ بات کو جلد از جلد پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتی تھیں۔

''ہمارے چھوٹے صاحب ہیں ہی اتنے پیارے کوئی بھی دیکھے گا پسند ہی کرے۔'' مسرت کہہ رہی تھی۔

''صرف صورت کو کیا کرنا ہے زبان تو انگارے چباتی ہے۔'' انہوں نے منہ بنایا۔

''فکر نہ کریں بھابھی آئیں گی تو زبان بھی میٹھی ہو جائے گی۔''

''ان شاء اللہ۔''

''بی بی جان!'' مسرت نے گلاس خشک کر کے ٹرے میں رکھے۔ اور مڑی لہجے میں تشویش در آئی تھی۔

''اگر انہیں پتا چلا کہ مانی.....''

''السلام علیکم۔'' عفان کی اچانک آمد پر اس نے گھبرا کر رخ ہی پھیر لیا۔

''شکر ہے وقت پر آ گئے ہو۔'' اسے کال کرنے کے باوجود انہیں ڈر تھا وہ کہیں مصروف نہ ہو جائے۔ عین وقت پر کہیں ارادہ نہ بدل جائے۔

''آپ کا حکم جو تھا۔'' اس نے احسان دھرا۔

''ہاں اتنے تم باادب۔'' بی بی جان کی آنکھوں میں سکون اور لہجے میں خود ساختہ طنز تھا۔

''آپ کی تو شکایتیں ہی ختم نہیں ہوتیں۔'' پھر مسرت کی طرف متوجہ ہوا جو ہنوز منہ موڑے کھڑی تھی۔

''تمہیں کیا ہوا؟'' اس نے فرض کر لیا کہ وہ کسی اور سے مخاطب ہے۔

''بی بی تم سے پوچھ رہا ہوں۔ کوئی کام نہیں ہے جو اس طرح ہاتھ لٹکائے کھڑی ہو۔''

عفان کی بلند آواز پر وہ آہستہ سے مڑی۔

''صبح سے کام ہی کر رہی ہوں۔''

''لگتا ہے کچھ زیادہ ہی کرلیا ہے۔'' وہ طنزیہ کہہ کر مڑا۔ ''مانی کو دیکھ لوں۔''

بی بی جان اور مسرت نے بے ساختہ ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر اس کے متوقع ردعمل کے پیش نظر ہاجرہ نے مضبوط لہجے لیکن دبی آواز میں بتایا کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔

''گھر پر نہیں ہے کیا مطلب؟'' سوال متوقع تھا۔ مسرت نے جلدی سے مڑ کر دھلے ہوئے گلاسوں کو پھر سے دھونا شروع کر دیا تھا۔

''زارا کے ساتھ گیا ہے۔''

''کیا؟'' اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

''اس کی ماں آئی تھی۔ ساتھ لے گئی اور مانی کچھ دن اپنی ماں کے ساتھ ہی رہے گا۔'' یہ وضاحت نہیں بم تھا جو اس کے سر پر پھوڑا گیا ہے۔ اور ردعمل میں میز پر پڑے کانچ کے برتن زمین بوس ہو گئے۔ فرش پر کانچ ہی کانچ بکھر گیا۔ وہ کانچ جو زارا ان کی زندگیوں میں بچھا کر گئی تھی۔ اور یہ خیال صرف عفان کا تھا ہاجرہ کی نگاہ میں تو زارا معصوم ہی تھی۔

''تمہارا دماغ ٹھیک ہے انسان ہو یا جانور۔''

مسرت توڑ کر کونے میں دبک گئی۔ دروازے میں عفان نہ حائل ہوتا تو شاید بھاگ ہی جاتی۔

''آپ کیسے مانی کو اس گھٹیا عورت کے حوالے کر سکتی ہیں۔''

''گالی مت دو۔'' وہ غرائیں۔

''تو کیا پھولوں کا ہار پہناؤں۔ میں جا رہا ہوں۔ اور اسی وقت مانی کو واپس لاؤں گا'' عفان نے میز پر ہاتھ مارا۔

''تم ایسا ہرگز نہیں کرو گے۔'' انہوں نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔ ''یہ میرا گھر ہے اور یہاں وہی ہوگا جو میں چاہوں گی۔''

عفان کے لب بھنچ گئے۔

''آپ کی اسی حاکمیت پسندی کی وجہ سے کسی اولاد نے آپ کے ساتھ رہنا گوارا نہیں کیا۔'' آہ بیٹے کے الفاظ۔

''اور تمہاری اسی شدت پسندی کی وجہ سے خاندان میں کوئی تمہارے قریب نہیں آتا۔'' بی بی جان نے ہارنا نہیں سیکھا تھا۔ وہ حاکمیت پسند نہیں تھیں۔ مگر جو بات انہیں حق لگتی اس پر ڈٹ جاتی تھیں۔

عفان نے غصے سے کچن چھوڑ دیا۔

مسرت کی رکی سانس بحال ہوئی۔

ہاجرہ بیگم نے چہرہ جھکا لیا۔ دکھ تکلیف، مایوسی ان کے چہرے پر ہر رنگ نمایاں تھا۔ مسرت نے خاموشی سے آ کر ان کے کندھے دبانے شروع کر دیے۔

☆☆☆

وہ مانی کے کاٹ کے پاس کھڑا تھا۔ ایک ہاتھ اس پر رکھے ہلکے میوزک کے ساتھ اس پر لگے کھلونے ست روی مگر دلکش انداز میں محو حرکت تھے۔ مانی اب اس میں بہت کم سوتا وہ زیادہ تر اس کے ساتھ بیڈ پر ہوتا۔

اس کی آنکھوں کی رنگت کھلونوں سے پھوٹتی ہلکی نیلی روشنی میں ڈھل رہی تھی۔ مگر اس کا تاثر ایک ہی تھا۔

غصہ..... دکھ..... مایوسی۔

وہ شام آج بھی اس کے اندر گزر کر رہ گئی تھی۔

جب وہ آفس سے واپس آیا تو بی بی جان اسی کاٹ کے پاس کھڑی سوئے ہوئے مانی کو دیکھ رہی تھیں۔ اور آنسو چہرے کی جھریوں میں ڈھل رہے تھے۔

"کیا ہوا؟" انہوں نے جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے آنسو صاف کرنے لگیں۔

عفان کو گھر میں چھائی بے تحاشا خاموشی کا احساس ہوا۔

"زارا..... زارا چلی گئی۔"

اس کے لہجے سے بے یقینی مترشح تھی۔ آج دوپہر وہ زارا کو سارے آپشنز اور فیصلے کا اختیار دے کر گیا تھا۔

ہاجرہ نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

عفان کی جیسے جان مٹھی میں آ گئی۔ مطلب اس نے سارے آپشنز ٹھکرا دیے تھے۔ یعنی کہ مانی کو بھی مقام حیرت۔

عفان نے بے اختیار مانی کو اٹھا کر سینے میں بھینچ لیا۔

"وہ مر گئی ہمارے لیے بھی اور مانی کے لیے بھی۔"

ہاجرہ نے تڑپ کر عفان کو دیکھا۔

"وہ اس کی ماں ہے عفان۔ وہ بچے کو میرے پاس امانتاً چھوڑ کر گئی ہے۔"

عفان نے آتشیں نگاہوں سے ہاجرہ بیگم کو دیکھا۔

"میں اپنے الفاظ دوبارہ نہیں دہراؤں گا۔"

آج وہ اپنی امانت لینے آئی تھی اور بی بی جان نے اس کی امانت واپس کر دی۔

مگر عفان کے دل میں وہ شام نیزے کی انی کی طرح گڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

"اٹھ جا میں نے کہا گھوڑے گدھے سب بیچ کر سوتی ہو۔" نادرہ کے جھنجھوڑنے پر ثانیہ نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔ تھکاوٹ ہی اتنی ہو رہی تھی۔

"گھر نہیں جانا؟"

"چلی جاؤں گی۔ عبید تو اب آفس چلا گیا ہوگا۔" اس نے مندی مندی آنکھوں سے وال کلاک پر نگاہ دوڑائی۔

"اچھا یہ تو بتاؤ جو ننھا شا کے گھر سے مٹھائی کی ٹوکریاں ساتھ آئی ہیں ان کا کیا کروں ہائے نصیب بیٹے کی منگنی کی مٹھائی بھی نہیں بانٹ سکتی۔"

نادرہ کو کئی فکریں لاحق تھیں شکر ہوا کہ رات کو دیر سے واپسی ہوئی۔ ورنہ اب تک تو محلے میں ڈنکا بج جاتا۔

"گھر کے لیے رکھ کر وسیم بھائی سے کہیں۔ باقی کسی یتیم خانے میں دے آئیں۔" اس نے کروٹ بدلنا چاہی۔

"اچھا رابعہ کو دے آؤ....."

"اماں! میں اچھی لگوں گی۔ یوں گلی میں مٹھائی لے کر جاتے۔" وہ جھنجھلا گئی۔

"تو کیا دوسری گلی میں جانے کے لیے ہیلی کاپٹر منگوا کر دوں۔" وہ چڑ کر بولیں۔

"ہاں اتنی ہماری اوقات۔" نیند تو اچاٹ ہو ہی گئی تھی۔ اب اٹھے بنا چارہ بھی نہ تھا۔

"ساتھ وہاں کی سن گن بھی لے لینا..... اور کیا پتا کہیں دیکھ کر تمہاری پھوپھی پیر ہی پکڑ لے۔" یہ تصور اتنا کیف آگیں اور مسرور کر دینے والا تھا کہ وہ فوراً تیار ہو گئی۔

☆☆☆

دروازہ کھلا تو وہ متحیر سی دروازے میں ہی ساکت رہ گئی۔

وہ جس کے لیے معافی مانگی جا رہی تھی۔ وہ دروازے پر ہاتھ رکھے خاموشی سے اسے گھور رہا تھا۔

''تم.....'' فرخ کی آنکھوں کا تاثر عجیب سا تھا جسے سمجھ کر ثانیہ کو ڈر لگا۔
''اس طرح کیوں گھور رہے ہو۔'' اس نے گھبرا کر گھنٹی پر ہاتھ رکھا۔ تاکہ اندر سے کوئی اور باہر آ جائے۔
''تم نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔''
''تمہارا اپنا کیا سامنے آیا۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔'' ثانیہ نے خود کو سنبھالا۔
''تم تو شکر کرو واپس آ گئے ہو میں نے معاف کر دیا ورنہ ڈر کے مارے وہیں چھپے رہتے۔''
''میں کسی سے نہیں ڈرتا۔'' وہ غرایا۔
''تو پھر فیس کرتے بھاگ کیوں گئے۔'' ثانیہ کا ڈر زائل ہونے لگا۔
''تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔'' فرخ نے دانت پیسے۔
''کبھی اس شکل پر مرتے تھے۔''
''عقل ٹھکانے آ گئی ہے۔''
''وہ تو آنی ہی تھی۔''
''لگتا ہے عبید کے ساتھ کچھ زیادہ ہی خوش ہو۔'' فرخ نے اسے سرتاپا دیکھا۔
''دشمنوں کی نظر نہ لگے۔ اب راستہ دو۔''
فرخ ایک طرف ہو گیا۔
ثانیہ اندر داخل ہوئی۔ ابھی چند قدم ہی اٹھے تھے کہ عقب سے فرخ کی آواز نے قدم جکڑ دیے۔
''گھر میں کوئی نہیں ہے۔''
ثانیہ کے وجود میں سردی لہر اٹھی۔ گھر میں کوئی نہ تھا اور وہ گھر کے اندر داخل ہو چکی تھی۔

☆☆☆

دستک دے کر اجازت ملنے کے بعد وہ ڈرتے ڈرتے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بیڈ پر نیم دراز پیشانی مسل رہا تھا۔ یہ اس کے تذبذب اور الجھاؤ کی نشانی تھی۔ جیسے وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ پا رہا ہو۔
اس نے ہاتھ روک کر مسرت کو دیکھا اور خالی ہاتھ دیکھ کر اس کا پارہ مزید ہائی ہو گیا۔
''وہ۔'' مسرت کا حلق خشک ہو گیا۔
''میں نے چائے کا کہا تھا۔''
''بیگم صاحبہ نے کہا ہے چائے مہمانوں کے ساتھ آ کر پی لیں۔''
''کون سے مہمان؟''
''آپ کی سسرال والے آئے ہیں۔ مطلب ہونے والی۔''
''آؤٹ۔'' وہ دھاڑا اور مسرت نے دوڑ لگا دی۔
ڈرائنگ روم میں خوش گوار ماحول میں بات چیت جاری تھی۔ کھانا پینا چل رہا تھا۔ توفیق صاحب تو ماضی میں ان سے ملے تھے مگر آسیہ اور عبید کی پہلی ملاقات تھی۔
بی بی جان کا رکھ رکھاؤ، گفتگو، گھر بار، حاصل شدہ معلومات سب متاثر کن تھیں عبید صرف اب عفان کا منتظر تھا۔
''اکیلی رہتی ہوں۔ اس لیے چاہتی ہوں جلد از جلد بیٹے کی شادی کر دوں تاکہ میرے گھر میں رونق ہو جائے۔''
''ماشاء اللہ آپ کا گھر بہت خوب صورت بنا ہے۔'' آسیہ نے توصیفی انداز میں کہا۔
''عفان کے ابو نے بہت چاؤ سے یہ بڑا سا گھر بنایا تھا کہ سارے بچے مل کر رہیں گے۔ مگر روزگار جس کو جہاں لے جائے۔''

www.paksociety.com

''بے شک۔'' توفیق صاحب نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

''آپ لوگوں کے گھرانے کا بہت سنا ہے۔ خاص طور پر آسیہ کے بارے میں کہتے ہیں بھولانی ہو تو اس کی ماں کو دیکھو..... اور دنیا گواہی دیتی ہے کہ آسیہ گھر بنانے والی اور رشتے نبھانے والی خاتون ہیں۔ اور ظاہر ہے بیٹی بھی ایسی ہی ہوگی اس لیے میں نے سوچنے میں زیادہ وقت نہیں لگایا۔'' ہاجرہ مسرت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

''روایتی باتوں میں نہیں پڑوں گا۔ جب رشتہ آیا تب ہی استخارہ کر لیا تھا۔ اللہ کی رضا شامل حال ہے۔'' توفیق نے کہا تو وہ خوش ہو گئیں۔

''بہو کو بھی ساتھ لے آتے۔''

عبید کے چہرے پر ہلکی سی سنجیدگی و تاسف کی لہر ابھری۔

''اس کے بھی بھائی کی منگنی کا سلسلہ چل رہا تھا تو وہاں مصروف تھی۔ ان شاء اللہ پھر کبھی چکر لگا لے گی۔'' آسیہ نے بروقت بات کو سنبھالا۔

تب ہی مسرت کسی سائے کی طرح دروازے میں آ کھڑی ہوئی اور لگی اشارے کرنے۔ انہیں اٹھ کر دروازے تک آنا پڑا۔

آنکھ کے اشارے سے پوچھا کیا ہوا؟

اس نے بھی اشارے سے بتایا نہیں آ رہے۔

ہاجرہ بیگم کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اندر تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ وہ جانتی تھیں یہ لڑکا انہیں طرح ستائے گا۔ مگر جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ بھی ان کے لیے ممکن نہ تھا۔

''کچھ دنوں کی بات ہے۔ وہ واپس آ جائے گا۔''

آنکھوں پر بازو رکھے عفان نے ان کی اسٹک کی ٹھک ٹھاک سن لی تھی۔ تب بھی بازو نہ ہٹایا تو ہاجرہ بیگم کو کہنا پڑا۔

''میں بات کرنا نہیں چاہتا۔'' بیٹے کے لہجے میں سختی تھی۔ باوجود غصے کے ماں نے کوشش کی لہجہ نرم ہی رہے۔

''وہ اپنے شوہر کے ساتھ شادی جا چکی ہے گی۔ اس لیے بس کچھ دن اپنے بیٹے کے ساتھ گزارنا چاہتی ہے۔ اور میں اتنی سنگ دل نہیں بن سکی کہ ایک ماں کو.....'' عفان نے بازو ہٹا کر ناراض نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

''آپ نے یہ سب جس وجہ سے کیا ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ مگر یاد رکھیں آپ کو اس سب کا کوئی فائدہ نہیں ہونے والا۔''

''میں نے یہ سب کچھ تمہارے لیے کیا ہے؟'' ان کی آواز میں اداسی اور مایوسی تھی۔

''بہت شکریہ۔ لیکن کیا ہی اچھا ہو کہ آپ میرے لیے کچھ نہ کریں۔'' بے مروتی کی انتہا تھی۔

''غلطی ہو گئی۔ آئندہ سے نہیں کروں گی لیکن اب تو.....'' انہوں نے غصہ ضبط کیا۔

''مجھے آپ کے مہمانوں میں کوئی انٹرسٹ نہیں کانڈلی جائیں یہاں سے۔''

''ٹھیک ہے جو دل میں آئے کرو۔ آج کے بعد میرا تمہارے کسی بھی معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس سے تو اچھا تھا باقیوں کی طرح تم بھی مجھے چھوڑ کر امریکہ ہی چلے جاتے۔''

وہ بہت غصے میں اور تیز قدمی سے کمرے سے باہر نکلیں۔ مگر اس عمر میں اتنی تیزی حق میں کہاں تھی۔ دھڑام کی آواز اور ہاجرہ بیگم کی تیز چیخ۔

وہ تیر کی طرح اٹھ کر باہر بھاگا۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

www.pklibrary.com

راضیہ سید

# پردیس

الاسکا میں بہت سردی ہے۔ گزشتہ آٹھ سال سے میں یہاں مقیم ہوں لیکن آج بہت خوش ہوں کیونکہ اتنے عرصے میں پہلی بار مجھے اپنے ملک پاکستان واپس جانا ہے۔ ہم تارکین وطن کے ساتھ ایک بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے ملک میں رہتے ہوئے ہمارے ٹیلنٹ کی، کوئی قدر نہیں کرتا اور بیرون ملک اپنے پیاروں کی زندگی سنوارنے کے چکر میں ہم کب تنہائی اور جدائی کے من چکر میں پھنس کر رہ جاتے ہیں یہ پتا بھی نہیں چلتا۔

میں اپنا نام تو بتانا بھول ہی گیا، میرا نام حسن ہے اور میں اپنی شادی کے چند دن بعد ہی، نئی نویلی دلہن کو الوداع کہہ کر آ گیا تھا اور لگتا تھا کہ میرا دل وہیں کہیں رہ گیا تھا۔ جدائی کے وقت اس کی آنکھوں میں نمی تھی مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ شاید، وہ مجھ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی لیکن جوائنٹ فیملی سسٹم کی وجہ سے اپنے لب سیے ہوئی تھی۔

سچ پوچھیں تو میں پاکستان سے جانا نہیں چاہتا تھا اور خاص طور پر شادی کے بعد تو بالکل نہیں لیکن ایک طرف میری دو کنواری بہنیں تھیں، تو دوسری طرف چھوٹے بھائی کی پڑھائی جاری تھی۔ والد ریٹائرڈ ہو چکے تھے اور بیمار بھی تھے۔ والدہ ان کی ہی دیکھ بھال میں لگی رہتی تھیں۔ اس گھر کو پیسے کی ضرورت تھی یہ مجھے بار بار باور کروادیا گیا تھا کہ تمہیں،

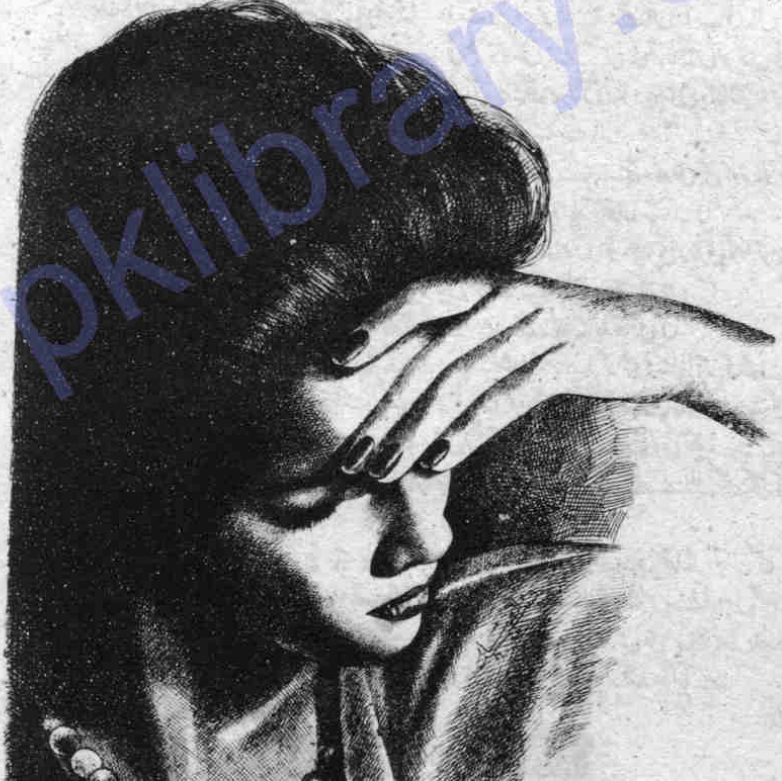

اعلیٰ تعلیم دلوائی ہی اس لیے گئی ہے کہ تم باقیوں کا سہارا بنو۔ ایئر پورٹ پر، میرے چھوٹے بھائی نے خوشی خوشی مجھے ریسیو کیا لیکن سب کے چہروں پر، اس وقت بہت اداسی چھا گئی جب میں نے یہاں مستقل رہنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

"بیٹا تمہاری زندگی تو وہیں اچھی تھی، یہاں تو وہی غربت، بے روزگاری اور سب سے بڑھ کر پڑھے لکھے بندے کی قدر ہی نہیں ہے، مانا کہ بہنوں کی تم نے شادی کردی لیکن ابھی احمر کی پڑھائی باقی ہے۔ اس گھر کو نئے سرے سے بنانا ہے۔ اس کے لیے سرمایہ درکار ہے وہ کہاں سے آئے گا ہم سب تو تمہارے آسرے پر ہی ہیں۔" ابا نے میرا بازو دباتے ہوئے کہا۔

"اماں نیناں نظر نہیں آرہی۔" میری نگاہیں اپنی بیوی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

"ہاں وہ شاید تمہارے لیے کچھ خاص بنا رہی ہے تم اسے چھوڑو یہ بتاؤ بہنوں کے لیے کیا تحائف لائے ہو۔" اور پھر اسی ادھیڑ بن میں شام ہوگئی۔

نیناں اب تک میرے سامنے نہیں آئی تھی میں تو اسے بتانا چاہتا تھا کہ اس کے لیے الگ مکان خریدوں گا، جہاں صرف میں اور وہ ہوں گے اور ایک نئی زندگی کی ابتدا کریں گے، جہاں ہم دونوں ہمیشہ ساتھ رہیں گے لیکن نیناں نے جب سب سنا تو اس کی آنکھوں میں، میں نے خوشی کی کوئی رمق نہیں دیکھی۔ وہ ایسے بت بنی بیٹھی تھی، جیسے میں اس کے اور اپنے نہیں بلکہ کسی اور کے بارے میں بات کررہا ہوں۔ "کیا بات ہے نیناں، تمہیں اس بات سے کوئی خوشی نہیں ہوئی؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں مجھے خوش بھی ہونا چاہیے یا نہیں ہماری زندگی اب اس نہج پر آگئی ہے حسن، کہ جہاں کچھ مل بھی جائے تو بھی لاحاصل کا دکھ باقی رہتا ہے۔ اس لاحاصل کا دکھ کہ جب میں آپ سے بات کرنا چاہتی آپ کی ماں میری نگرانی کرنے لگیں۔ آپ کو ہر طرح کی فرمائشیں نوٹ کروائی جاتیں۔ کبھی نندوں کی باتیں سنتی تو سب کی خدمتیں کرتی میری جوانی تو گزر گئی۔ آٹھ سال آپ کے بنا یوں گزار دیے جیسے میں خدانخواستہ سہاگن نہیں ہوں۔

کوئی اولاد کوئی آس نہیں تھی میرے پاس، صرف اور صرف تنہائی میرا مقدر بنادی گئی تھی۔ اب میں الگ گھر لے کر بھی کیا کروں، آپ کا ساتھ پاکر بھی کیا کروں؟"

"لیکن نیناں! تم سوچو میں نے بھی تو تنہائی برداشت کی تم سب گھر والوں کے لیے، ہمارے گھر کے لیے سب آسائشوں کے لیے، میں بھی تو پردیس کی سختیاں جھیلتا رہا۔"

میں نے بھی اپنی صفائی پیش کرنا چاہی۔

"حسن! میں یہ نہیں کہتی کہ اکیلا سب میں نے برداشت کیا لیکن کم از کم آپ کچھ پیسے جمع کرکے مجھے وزٹ ویزا پر تو بلا سکتے تھے ناں، آپ کی ماں بہنوں کی طرح میں نے کفش کی فرمائشیں تو نہیں کی تھیں ناں آپ مجھے میرا حق تو دیتے ناں، کیا میں اس لائق بھی نہ تھی۔"

نیناں میرے سامنے رو رہی تھی اور میں اسے چپ بھی نہیں کروا پا رہا تھا۔

"لیکن اب بھی تو ہم اپنی زندگی کو بہتر بنا سکتے ہیں صرف اپنے لیے سوچ سکتے ہیں۔"

میرے لہجے میں التجا تھی۔

"شاید ہم ایسا کرسکیں لیکن آپ مجھ سے نئی نویلی سہاگن جیسی کوئی توقعات وابستہ مت کیجیے گا۔ میں کوشش کروں گی کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچے لیکن خدمت کو، محبت میں ڈھالنے کے لیے مجھے بھی مجبور نہ کیجیے گا۔"

نیناں نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر یوں محسوس کیا کہ میں، اب تک الاسکا میں ہی موجود ہوں اور وہاں کی جمی سے میرا وجود جم کر منجمد ہوگیا ہے۔

☆☆

عارفہ فضل شاہ

# راہ کے ستارے

"بھئی میں تو کہتی ہوں خدا کسی دشمن کو بھی بڑی بہو نہ بنائے۔ نہ دن کا چین، نہ رات کا سکون۔ دیور صاحب کے فرمائشی پروگرام الگ تو نند کے مطالبے الگ اوپر سے ساس سسر کا خیال رکھنے کی تاکید کے علاوہ تو مجازی خدا کو کچھ سوجھتا ہی نہیں۔"

گجریلا بناتے وقت اریبہ کی سوچ کے گھوڑے سرپٹ دوڑتے جا رہے تھے۔ کٹ کٹ میوہ جات کاٹتے ہوئے تو اس کا بس نہیں چل رہا تھا گھر والوں کی فرمائشیں بھی چھری کے نیچے رکھ کر کاٹ ڈالے۔ گردنیں کاٹنے کا خیال ابھی نہیں آیا تھا۔ بھئی اب اتنی بھی تو پتھر دل نہیں تھی وہ۔

"واہ بھابھی! دل خوش کر دیا۔ کیا خوشبو ہے۔ اللہ آپ کو یہاں سدا آباد رکھے ورنہ میری لذت دہن کا خیال کون رکھے گا۔" عمر کو گجریلے کی خوشبو لاؤنج سے کچن تک کھینچ لائی تھی۔

"لذت دہن کا خیال کون رکھے گا تم جانو اور تمہاری مستقبل کی دلہن جانے۔ میری جان چھوڑو۔"

اریبہ سوچ ہی سکی، کہہ نہیں سکتی تھی۔ اس نے مصنوعی مسکراہٹ سے عمر کو نوازا اور میوے ڈال کر آنچ بند کر دی۔

☆☆☆

اتوار کی صبح کا آغاز معمول کے دنوں سے ہٹ کر ہوا تھا۔ لاؤنج میں خوب رونق تھی۔ عمر گھوڑا بنا ہوا تھا اور صارم کو چکر پہ چکر دلا رہا تھا۔ ریحان کے قہقہے

میں سدرہ کا موبائل تھا۔ وہ کوئی گیم کھیل رہا تھا۔ ابا جی اخبار کے مطالعے میں گم تھے مگر ایک نظر بچوں پہ بھی ڈال لیتے۔ امی اریبہ کے ساتھ کچن میں مصروف تھیں۔ آج فرمائشی پروگرام زیادہ ہی لمبا ہو گیا تھا اریبہ کے ناتواں کندھے اکیلے بوجھ اٹھانے سے قاصر تھے لہٰذا امی کی مدد لازم و ملزوم تھی۔ آج سب کی چھٹی تھی لہٰذا سب حلوہ پوری کا ناشتہ کرنا چاہتے تھے۔ اریبہ سے پوری کبھی بھی نرم نہیں بنتی تھی اکثر کرخت ہو جاتی تھی۔ امی نرم و گداز سی پوریاں نکالتی جا رہی تھیں۔ اریبہ نے چائے کو دم دیا، حلوہ تیار ہو چکا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اس نے ناشتہ ٹیبل پہ لگایا تو خوشبو سارے میں پھیل گئی۔ سب ہی نے فوراً اپنے معمولات ترک کیے اور ٹیبل کے گرد اکٹھے ہو گئے

"جیو پیاری ماں! دل کرتا ہے ہاتھ چوم لوں۔" عمر نے پوری اپنی پلیٹ میں رکھتے ساتھ ہی ہانک لگائی۔

"ساس بہو کی جوڑی زندہ باد۔" سدرہ نے ناشتے سے انصاف کرتے ہوئے امی اور بھابھی کی تعریف کی۔

ناشتہ خوش گوار ماحول میں کیا گیا مگر اریبہ کا ذہن بار بار بھٹک کر علی کی طرف جا رہا تھا۔ کراچی گئے اسے دو ماہ ہونے والے تھے۔ ابھی تک اس نے لاہور کا چکر نہیں لگایا تھا، البتہ فون پہ سب سے بات ہوتی رہتی تھی۔ اریبہ کو شوہر کے بغیر ساری رونق پھیکی پھیکی لگ رہی تھی۔

☆☆☆

اریبہ کی شادی کو چھ سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ سسرال میں ساس، سسر ایک دیور اور ایک نند تھی۔ علی ایک خیال رکھنے والا شوہر تھا۔ اللہ نے دو بیٹوں سے نوازا تھا۔ سسرال میں بظاہر اریبہ خوش باش تھی مگر دل کے کچھ ارمان ہنوز باقی تھے۔ دیور اور نند کوئی نہ کوئی فرمائش کرتے رہتے تھے لہٰذا اس کا کافی وقت کچن میں گزرتا تھا۔

کچھ عرصہ پہلے علی کا ٹرانسفر ہوا تھا، وہ روشنیوں کے شہر روانہ ہوا تو اریبہ کی آنکھوں کی لو مدھم ہو گئی۔ عمر اور سدرہ تھے جو اریبہ کے کان کھائے رکھتے تھے۔ ساس ہاتھ بٹا دیتی تھیں مگر اُن کے گھٹنوں میں درد رہتا تھا تو زیادہ تر مدد کرنے سے قاصر رہتی تھیں۔ اریبہ کا دل کبھی کبھی اچاٹ ہو جاتا تھا۔ علی جب کراچی گیا تو اس کے دل میں امید جاگی کہ وہ بھی چلی جائے گی۔ اس کا بھی ایک آشیانہ ہوگا۔ اپنے بچوں اور شوہر کے ساتھ وہ اپنا گھر اپنی مرضی سے سجائے گی۔ مگر جب علی اس سے خواہش کا اظہار کیا تو اس نے سنتے ہی منع کر دیا۔

"حد کرتی ہو اریبہ۔ امی اکیلی رہ جائیں گی۔"

"علی! امی کے پاس سدرہ ہے، عمر ہے اور ابو بھی ہیں ناں" اریبہ نے کوشش جاری رکھی۔

"سدرہ کالج جاتی ہے۔ ابو اور عمر کی اپنی اپنی مصروفیات ہیں۔ امی گھر کی ذمہ داری اٹھانے کے قابل نہیں ہیں۔ تمہارا مطالبہ غلط نہیں۔ عمر کی شادی ہو گئی تو سوچا جا سکتا ہے۔ مگر فی الحال ناممکن ہے"

اریبہ نے کچھ کہنا چاہا مگر علی نے سختی سے ٹوک دیا۔ وہ دل مسوس کر رہ گئی۔ دل اداس تھا اور ایک پھانس سی محسوس ہو رہی تھی مگر کیا ہو سکتا تھا، لہٰذا چپ بیٹھ گئی

☆☆☆

موسم اچانک ہی ابر آلود ہو گیا تھا۔ بارش کے امکان نظر آ رہے تھے۔ اریبہ نے کپڑے استری کرنے تھے لہٰذا جلدی جلدی سنبھالنے لگی۔ بچوں نے لاؤنج میں کھلونوں کا انبار جمع کیا ہوا تھا۔ کپڑے الماریوں میں ہینگ کر کے کھلونے ٹھکانے لگائے اور دروازے کھڑکیاں بند کرنے لگی۔ ہوا اگر آندھی کی شکل اختیار کر لیتی تو سارے کمرے اور کچن گرد سے اٹ جاتا۔ بچے عمر کے ساتھ دکان گئے تھے، کچھ ہی

دیر میں لوٹ آئے۔ سدرہ کا ٹیسٹ تھا، وہ پڑھ رہی تھی۔ آج بلاوجہ ہی دل تنگ پڑ رہا تھا لہٰذا سارا غصہ برتنوں پر نکالا۔

"کیا تھا جو علی مجھے ساتھ لے جاتے ان مفت کی خدمتوں سے تو جان چھوٹ جاتی۔"

وہ بے دلی سے کام میں مصروف ہوگئی۔

☆☆☆

عشاء کے بعد اریبہ نماز پڑھ کر لیٹنے ہی لگی تھی کہ چھوٹی بہن کی کال آگئی۔ امی کی طبیعت خراب تھی اور وہ اسے یاد کر رہی تھیں۔ اریبہ کا دل ہی بیٹھ گیا۔ معاملہ سیریس ہی تھا ورنہ اس کو کبھی بھی پریشان نہیں کیا جاتا تھا۔ اب نیند آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسی ٹینشن میں رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ صبح صبح وہ عمر کے ساتھ اسلام آباد روانہ ہوئی۔ میکے پہنچ کر امی کو دیکھا۔ وہ زیادہ ہی کمزور ہوگئی تھیں۔ اریبہ نے تو ان کو دیکھتے ہی رونا شروع کردیا۔ بہن بھائیوں نے تسلی دی اور امی نے سمجھایا تو آنسوؤں میں کمی آئی۔ عمر دوسرے دن واپس چلا گیا لیکن اریبہ نے امی کے پاس ہی رکنے کا فیصلہ کرلیا۔ بچوں کی طرف سے وہ بے فکر تھی۔ ماں سے زیادہ تو وہ پھپھو، چاچو اور دادو سے مانوس تھے۔ دو ہفتے امی کی خوب خدمت کی اور وہ پہلے سے بہتر ہوگئیں تو فوراً اریبہ کے پیچھے پڑ گئیں کہ اب اسے واپس جانا چاہیے۔ ایسی ہی تو ہوتی ہیں مائیں۔ بیٹیوں کو اپنے گھر ہی آباد دیکھنے کی خواہش رکھنے والی۔ کچھ دن مزید رک کر اریبہ نے واپسی کا ارادہ کرلیا۔

☆☆☆

جب وہ بھائی کے ساتھ واپس آئی تو مغرب کا وقت تھا۔ عمر نے تو اسے دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔

"شکر ہے، بھابی واپس آگئیں۔ سدرہ کے ادھ جلے کھانے کھانے سے بچ جاؤں گا۔"

اریبہ مسکرادی اور صارم اور ریحان کو خود میں بھینچ لیا۔ امی، ابو اور سدرہ سے مل کر اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ اس پہ آگہی کا در وا ہو چکا تھا کہ یہ پیارے رشتے ہی تو اس کا ساتھ دیتے تھے۔ اگر وہ علی کے ساتھ ہوتی تو اتنے دن بچوں کو چھوڑ کر امی کے پاس رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سدرہ انہیں ہوم ورک کرائی تھی۔ صاف ستھرا رکھتی تھی۔

عمر اسکول چھوڑ کر آتا تھا۔ دھیان رکھتا تھا۔ پارک لے جاتا۔ ہر کام وہ بغیر ناک بھوں چڑھائے کرتا تھا۔ دادا دادی کی تو بچوں میں جان تھی۔ سب سدرہ کی قدر کرتے تھے۔ اس کی رائے کو اہمیت دیتے تھے۔ اس کا فرض تھا کہ وہ بھی ان سے محبت کرتی۔ رات کا کھانا امی اور اریبہ نے بنایا اور اسے زبردستی آرام کرنے کو بھیج دیا کیونکہ وہ سفر کر کے آئی تھی۔ عمر اور ابو اریبہ کے بھائی کو کمپنی دے رہے تھے۔

☆☆☆

اگلے دن کا سورج معمول سے زیادہ روشن اور چمک دار تھا۔ اریبہ آج خوشی خوشی کاموں میں مصروف تھی۔ دل سے ہر بدگمانی اور غبار چھٹ گیا تھا۔ مثبت سوچنا شروع کردیا تھا تو اپنا آپ ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا۔ سکون محسوس ہو رہا تھا۔ نہ تھکاوٹ ہوئی نہ ہی دل بھاری ہوا۔ کام تو وہ پہلے بھی کرتی تھی لیکن چڑچڑا پن، بے دلی اور تھکاوٹ رہتی تھی۔ آج ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے عمر اور سدرہ کی پسند کا کچ نیار کیا اور انہیں آواز دی۔ رونق تھی، خوشیاں تھیں۔ ہر طرف محبت رقصاں تھی۔

سسرال میں کبھی کبھی ہم بھی زیادتی کر جاتے ہیں۔ اپنے کیے گئے کاموں کو یاد رکھتے ہیں، دہراتے ہیں، احسان جتاتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ دوسرے ہمارے کتنا کام آتے ہیں۔ ساتھ رہنا ہی ہے تو کیوں نہ دل سے رشتہ نبھایا جائے۔ نیت صاف ہوگی تو اجر بھی تب ہی ملے گا۔

☆☆

راشدہ رفعت

# چاہے تمہیں

تحریم بھابھی کو ان کے خاندان کا حصہ بنے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ انہوں نے اسے اپنے خاندان کا حصہ بنانے کی تجویز پیش کردی تھی۔ روشانے کو کشف کی زبانی پتا چلا کہ تحریم بھابھی نے بڑے ابو اور بڑی امی سے مشورہ کیا ہے کہ وہ اپنے بھائی کے لیے روشانے کا رشتہ پیش کرنا چاہتی ہیں۔

بڑے ابو کو تو بہو کا لائق فائق بھائی پہلے سے ہی بہت پسند تھا بڑی امی کی نگاہ میں بھی یہ ہر لحاظ سے آئیڈیل رشتہ تھا۔ تحریم بھابھی کے مزاج اور عادتوں کی وجہ سے سب ہی انہیں پسند کرنے لگے تھے۔ ان کا بھائی بھی یقیناً ان ہی جیسا ہوتا تھا سو کسی کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔

ممی، پاپا، تو ہر معاملے میں بڑے ابو کی طرف دیکھتے تھے۔ وہ خاندان کے بڑے تھے ان کے پیش نظر سب کی بھلائی ہوتی، جب یہ رشتہ بڑے ابو نے او کے کردیا تو سمجھو پکا ہی ہوگیا۔ کشف بڑے پرجوش طریقے سے روشانے کو گھر کے بڑوں کے درمیان پکنے والی کھچڑی کی بابت بتارہی تھی۔

"کل ابو جی نے بڑی اور چھوٹی پھوپھو کو بلایا ہے۔ رسمی طور پر اس خاندانی میٹنگ میں یہ رشتہ پیش کیا جائے گا بس پھر سمجھو تم آفیشلی سعدون احمد کی بن جاؤ گی۔"

"مطلب کیا ہے تمہارا۔ یوں اچانک پلک جھپکتے میں کیسے؟" روشانے کا تو صحیح معنوں میں دم خشک ہوگیا تھا، روایتی لڑکیوں کی طرح اسے بھی منگنی، شادی کا بہت شوق تھا لیکن جب وہ مرحلہ پیش آنے لگا تو وہ بری طرح حواس باختہ ہوگئی۔

"اور وہ تحریم بھابھی کا بھائی، وہ تو شکل سے ہی بہت اکھڑ، مغرور اور سنجیدہ مزاج لگتا ہے۔ یاد نہیں بھابھی کی شادی کی تقریبات میں وہ خوف ناک حد تک سنجیدہ تھا ہم نے تو یہ بات آپس میں ڈسکس بھی کی تھی اور تم ایسے آدم بیزار شخص کے رشتہ آنے کی خبر مجھے خوشی خوشی دے رہی ہو۔ اس کی شکل یاد کرکے ہی میرا دم خشک ہورہا ہے خدانخواستہ رشتہ وشتہ پکا ہوگیا تو کیا بنے گا میرا۔" روشانے مضطرب ہوگئی تھی۔

"اتنا ڈیشنگ ہے بھابھی کا بھائی تھوڑا سا سڑیل ہے تو کیا ہوا، تمہاری صحبت میں رہے گا تو خود بخود خوش مزاج ہوجائے گا۔ اتنا اچھا رشتہ آنے پر تمہیں تو خوشی سے چھلانگیں مارنی چاہئیں، میں تو یہ خبر سنتے ہی دوڑی دوڑی تمہارے پاس آئی تھی۔ تم نے اتنا ٹھس رسپانس دے کر مجھے سخت مایوس کیا ہے لڑکی۔" کشف کا جوش بھی ماند پڑنے لگا تھا۔

"ویسے تحریم بھابھی کو مجھ میں نظر کیا آیا جو انہوں نے ایک دم سے میرا رشتہ ہی مانگ لیا۔" روشانے نے کشف کی بات پر دھیان ہی کب دیا وہ تو اپنی ہی سوچوں میں گم تھی۔

"کیا مطلب ہے کیا نظر آیا۔ اتنی پیاری ہو تم، خوش مزاج، خوش لباس پھر گزارے لائق حد تک سلیقہ مند بھی ہو، میرا مطلب ہے چھوٹی مما کی ڈانٹ ڈپٹ پر مارے باندھے گھر کے کام بھی کرلیتی ہو۔ آج کل کی لڑکیوں والی تیزی طراری بھی نہیں اور کیا چاہیے تحریم بھابھی کو۔" کشف نے اپنا ماہرانہ تجزیہ پیش کیا تھا۔

"یہ سب خصوصیات مجھ سے زیادہ تمہارے اندر پائی جاتی ہیں پھر تحریم بھابھی کو اپنی سگی نند کے

بجائے رشتے کی تندہی کیوں پسند آئی۔'' روشنا نے نے نیا نکتہ نکالا اس بات پر کشف نے اسے کھانے والی نگاہوں سے دیکھا۔

''کیسی سہیلی ہو، دوست کے دل کا حال جانتے ہوئے بھی ایسی بات کردی۔'' کشف کا صدمہ فطری تھا۔

''میں دوست ہوں ناں مجھے خوب پتا ہے تمہارے دل کا حال، تحریم بھابھی کو تو نہیں پتا ناں۔ آخر ان کے دل میں تمہارا خیال کیوں نہ آیا؟'' روشنا نے پرسوچ انداز میں گویا ہوئی۔

''اچھا ہی ہے نہیں آیا ان کے دل میں کوئی ایسا ویسا خیال۔'' کشف کو اس خیال سے ہی جھرجھری آگئی تھی۔

بڑی پھوپھو کے دیور کا بیٹا ایاز جو کشف کا کلاس فیلو بھی تھا۔ کشف کو پسند کرتا تھا ایک طویل عرصے تک

## مکمل تاول

اس نے کشف کو چپکے چپکے چاہا تھا لیکن چند ماہ پہلے اس نے کشف کو اپنی دلی واردات سے آگاہ کر دیا تھا۔

کشف دل ہی دل میں تو خوب مسرور ہوئی لیکن ایک مشرقی لڑکی ہونے کی حیثیت سے، اس نے بہت سنجیدگی سے ایاز کو باور کروا دیا تھا کہ یہ فیصلے اس کے والدین کے کرنے کے ہیں۔

"بس میرے ہاتھ میں ڈگری آجائے تو امی ابا کو تمہارے گھر بھیجتا اچھا بھی لگوں گا۔ تمہیں حفظ ماتقدم کے طور پر بتا دیا ہے کہ لڑکیوں کے رشتے ہوئے دیر نہیں لگتی اگر مجھ سے پہلے کوئی اور امیدوار سامنے آگیا تو پلیز مجھے انفارم کر دینا بس تم سے اتنی سی فیور درکار ہے۔" ایاز خود یونی ورسٹی میں راہ و رسم بڑھانے کے حق میں نہ تھا۔

کشف نے اس کی بات سن کر اقرار میں سر ہلا دیا تھا۔ اسے اپنا وقار عزیز تھا اور ایاز کو یہ پروقار سی لڑکی، سو اس دن کے بعد بات بظاہر ختم ہو گئی تھی لیکن یونیورسٹی کی پروقار سی لڑکی اپنی ہم جولی کے سامنے حال دل کھول کر رکھ دیتی تھی۔ ایاز اگر اس کے عشق میں گوڈے گٹوں تک مبتلا تھا تو اس کا روم روم بھی ایاز ایاز پکارتا تھا۔ روشانے چھیڑ چھیڑ کر اس کا نام کرناک میں دم کر دیتی تھی، کیا خبر تھی کہ جلد ہی کشف کو بھی اسے چھیڑنے کا معقول بہانا مل جائے گا۔

☆☆☆

اگلے دن، چھوٹی پھوپھو اور بڑی پھوپھو دونوں خاندانی میٹنگ میں شریک ہونے پہنچ گئی تھیں۔ بڑی پھوپھو گرلز کالج کی پرنسپل تھیں۔ ویسی ہی شخصیت کی مالک تھیں۔ پروقار مگر بے تحاشا سنجیدہ۔ تین بیٹیوں کی ماں اور تینوں ہی خیر سے شادی شدہ تھیں۔

کشف اور روشانے کی بے تکلفی چھوٹی پھوپھو سے تھی۔ ان کے گولو مولو سے دو بیٹے ریان اور فاران ننھیال میں سب کے لاڈلے تھے اور خاص طور پر اپنی آپیوں کے، کشف اور روشانے دونوں ہی ان کے خوب لاڈ اٹھاتی تھیں۔

روشانے بھی پاپا کی اکلوتی اولاد تھی۔ ماں، باپ کی لاڈلی تو تھی ہی بڑی امی اور بڑے ابو یعنی تایا، تائی بھی اس کو اپنی اکلوتی بیٹی کشف جتنا ہی چاہتے تھے یہ ہی وجہ تھی، جب ان کی بہو نے اپنے لائق فائق بھائی کے لیے روشانے کا رشتہ مانگا تو بڑی امی اور بڑے ابو کے دل میں ایک لمحے کو بھی یہ خیال نہ آیا کہ تحریم نے روشانے کے بجائے کشف کا نام کیوں نہ لیا۔

تحریم کو خاندان کا حصہ بنے چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ وہ بڑی امی کی پسند تھی۔ سادہ مزاج اور ہنس مکھ سے اویس بھائی نے شادی کا شعبہ، کلی طور پر ماں کے سپرد کر رکھا تھا۔ روشانے کو تو اویس کشف جتنا ہی چاہتے تھے۔ ایک بار بڑی امی نے بیٹے کے سامنے سرسری سا ذکر کر دیا کہ گھر کی بچی گھر میں ہی رہ جائے تو اس میں کیا قباحت۔ اویس اس تجویز پر اس بری طرح بگڑے کہ بڑی امی کو اپنے الفاظ واپس لینے پڑے۔

بہو کی تلاش شروع کی تو احساس ہوا کہ یہ کام ہرگز بھی اتنا آسان نہیں۔ آپ کی اگلی نسل بہو سے پروان چڑھتی ہے، بہو کا تعلق ایسے گھرانے سے ہو جو ظاہری علم کے علاوہ شعور کی دولت سے مالا مال ہو۔ بڑی امی کو آج کل کی لڑکیوں میں وہ متانت، ٹھہراؤ اور وقار نظر ہی نہ آتا جس کی وہ متمنی تھیں۔ انہیں نہ دولت سے سروکار تھا نہ بے تحاشا حسن رکھنے والی لڑکی درکار تھی، جو خصوصیات انہیں درکار تھیں۔ وہ رشتہ کروانے والیوں کی سمجھ میں نہ آتیں۔

گھر گھر جا کر لڑکیاں دیکھنا اور رد کرنا ان کے نزدیک انتہائی قبیح فعل تھا، ایسے میں اویس کی شادی مسئلہ بن چکی تھی۔ پھر چھوٹی پھوپھو کی مہربانی سے یہ معرکہ سر ہوا۔

تحریم ان کے گولو مولو کی ٹیچر تھی۔ ریان اور فاران جیسے شرارتی بچے جو کسی کلاس ٹیچر کے قابو میں نہ آتے تھے تحریم کی کلاس میں آئے تو چند دنوں میں ہی ناقابل یقین حد تک سدھر گئے، پڑھائی میں تو بہتری آئی سو آئی، وہ تمیز اور تہذیب بھی سیکھ گئے تھے اور یہ سارا کریڈٹ ان کی پیاری ٹیچر تحریم کے سر جاتا تھا۔

ایک بار پیرنٹس ٹیچرز میٹنگ سے واپسی پر امینہ (چھوٹی پھوپھو) کے زرخیز ذہن میں خیال آیا کہ اس

کامنی سی لڑکی کا بائیو ڈیٹا معلوم کرنے میں کیا حرج ہے اگر کہیں، بات وات پکی نہ ہوئی ہو تو ان کے شہزادوں جیسے بھتیجے کے ساتھ کیا زبردست جوڑ بنے گا اس کا۔ بس یہ آئیڈیا دماغ میں آنے کی دیر تھی۔ وہ اپنے مشن پر جت گئیں۔

تحریم کے والدین حیات نہ تھے۔ ایک بڑی بہن شادی شدہ اور بیرون ملک مقیم تھی۔

تحریم اپنے بھائی کے ساتھ رہتی تھی بھائی جو اس سے ڈیڑھ دو برس بڑا ہی ہوگا۔ وہ بھی تاحال غیر شادی شدہ تھا۔

بڑی امی نے تحریم کو دیکھا تو پہلی ہی نگاہ میں قبولیت بخش دی۔ رشتے کے معاملات طے کرنے کے لیے تحریم کی ایک خالہ اور ملائیشیا میں مقیم اس کی بڑی بہن سے ویڈیو کال پر رابطہ رکھا گیا، یہاں اویس میں بھی کس چیز کی کمی تھی، ان لوگوں نے دل کی تسلی کے لیے ہر ممکن تحقیق کروائی اور پھر خوش دلی سے رشتہ قبول کرلیا۔

آگے کے مرحلے اس سے بھی زیادہ برق رفتاری سے طے ہوئے اور بہت جلد تحریم اویس کے سنگ رخصت ہوکر یہاں آن بسی۔ روشانے اور کشف نے بھائی کی شادی میں اپنے خوب ہی ارمان نکالے۔

شادی کے بعد تحریم سے ان کا دوستانہ تعلق استوار ہوگیا۔

تحریم کا مزاج اور عادتیں ہی اتنی اچھی تھیں کہ وہ بہت جلد، ہر دل عزیز بہو اور بھابھی کے رتبے پر فائز ہوچکی تھی اسی لیے تو جب اس نے اپنے بھائی کا رشتہ روشانے کے لیے پیش کیا تو خاندانی میٹنگ میں غور وخوض کے بعد خوش دلی سے یہ رشتہ قبول کرلیا گیا۔ فقط چھوٹی پھوپھو جنہوں نے سرسری انداز میں لڑکے کی سنجیدگی کی طرف توجہ مبذول کروانا چاہی تھی۔

''ہماری روشانے بہت ہنس مکھ اور زندہ دل ہے جبکہ سعدون شکل سے ہی بہت سنجیدہ اور بردبار لگتا ہے کہیں بعد میں مزاجوں کا یہ فرق شادی شدہ زندگی کو متاثر نہ کرے۔'' انہوں نے دل میں آئے خدشے کا اظہار کیا۔

''مرد کو میچور اور سمجھ دار ہی ہونا چاہیے۔'' بڑے ابو نے ہنکارا بھر کر کہا تھا۔

''ویسے تو تحریم اور اویس کی شادی کے موقع پر ہم سب، سعدون سے کئی بار ملے ہیں لیکن اب وہ باضابطہ طور پر ہماری فیملی کا حصہ بننے جارہا ہے تو اسے لنچ یا ڈنر پر انوائٹ کرنا چاہیے۔ اس کے بعد اقرار کریں گے اور پھر شادی کے متعلق جو بھی معاملات ڈسکس کرنے ہوں گے وہ تو تحریم کے ذریعے ہی طے ہوجائیں گے۔''

بڑی پھوپھو اپنے مخصوص نپے تلے انداز میں گویا ہوئیں۔

بڑوں کی میٹنگ اختتام پذیر ہوئی تو کشف اور روشانے اندر کی معلومات کے حصول کے لیے چھوٹی پھوپھو کے سر ہوگئیں۔

''ہم سب دل وجان سے اس رشتے پر متفق ہوگئے ہیں بس اگلے ہفتے لڑکا بردکھوے کے لیے آرہا ہے وہ ایک رسمی کارروائی ہوگی یوں سمجھو رشتہ تقریباً طے ہوگیا ہے۔'' چھوٹی پھوپھو نے مسکراتے ہوئے لاڈلی بھتیجوں کو آگاہ کیا۔ کشف اپنی ہونق شکل بنائے سہیلی سے لپٹ کر اسے چھیڑنے لگی تھی۔

☆☆☆

اگلے روز یونی ورسٹی میں ایاز موقع پاکر اس کے پاس چلا آیا۔

''پلیز صرف پانچ منٹ دے دیجیے کشف!''

اس نے ملتجیانہ انداز اختیار کیا۔

''جی کہیے!'' کشف اس کے انداز پر حیران ہوئی تھی۔

''میری ممی آج تائی اماں سے میرے اور آپ کے متعلق بات کرلیں گی اور ہوسکتا ہے کل ہی ممی، بابا آپ لوگوں کے گھر آجائیں بس آپ سے فقط یہ شکوہ ہے کہ آپ نے مجھے بروقت آگاہ نہ کیا۔'' وہ بہت شاکی لہجے میں مخاطب تھا۔

کشف نے ناسمجھی سے اسے دیکھا، بڑی پھوپھو اس کی تائی اماں تھیں تو یعنی اس نے اپنی ممی کو

اپنی پسند بتادی اور اس کی ممی نے اپنی جیٹھانی سے بات کرلی یہاں تک تو بات سمجھ آگئی لیکن اس کا شکوہ؟

''کل تائی اماں آپ لوگوں کی طرف آئی تھیں کہہ رہی تھیں بھتیجی کے رشتے کا معاملہ ہے، میں تو سنتے ہی ٹینس ہوگیا تھا، فوراً ممی کو اعتماد میں لیا ممی تو۔''

ایاز جانے آگے کیا کہہ رہا تھا کشف کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی معاملہ سمجھ میں آگیا۔

''کل بڑی پھوپھو واقعی ہماری طرف آئی تھیں اور معاملہ ان کی بھتیجی کے رشتے کا ہی تھا لیکن اتفاق سے وہ بھتیجی میں نہیں بھی روشانے، میری کزن، آپ جانتے ہیں ناں۔ انگلش ڈپارٹمنٹ میں ہوتی ہے اس کا پروپوزل زیر غور تھا۔''

کشف نے تفصیلی وضاحت دی، ایاز نے شکر کا کلمہ پڑھا، اس کے حواس بحال ہوئے تھے۔

''چلیں خیر، میری ممی بابا تو اب آپ کے گھر ایک، دو دن میں آرہے ہیں۔ ڈگری اور نوکری کے انتظار کی حماقت نہیں کرنے والا۔ کل کلاں کو کوئی آپ کا رشتہ لے کر بھی آسکتا ہے۔ جب تک مجھے من پسند جاب نہیں ملتی، میں بابا کے کام میں ہاتھ بٹانا شروع کردوں گا اور تائی اماں کا ووٹ تو یقیناً میری طرف ہی ہوگا امید تو یہ ہی ہے کہ آپ کے گھر والوں کو ناچیز کو مسترد کرنے کا کوئی جواز نہ ملے گا آگے میری قسمت۔''

ایاز دھیمی مسکراہٹ لبوں پر سجاتے ہوئے بولا۔

کشف نے بھی مشکل سے مسکراہٹ چھپائی ذرا دیر پہلے ''ناچیز'' کی جس طرح ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں اب وہ خاصا پراعتماد لگ رہا تھا۔

☆☆☆

اس کے کہے کے مطابق دو دن بعد ہی، اس کے والدین رشتہ لے کر آن پہنچے تھے اگر سعدون کا رشتہ گھر کی بات تھی تو ایاز کا تو بالکل ہی گھر کی بات تھی۔ وہ بڑی پھوپھو کے دیور کا بیٹا تھا۔ بالکل دیکھا بھالا خاندان۔ خود ایاز کے متعلق پھوپھو کی رائے بہت مثبت تھی اور جس کی وہ تعریف کریں تو وہ بندہ واقعی تعریف کے ہی لائق ہوتا تھا۔

گھر کے جملہ بڑے، بہت مطمئن اور خوش تھے۔

بچیوں کے رشتے ڈھونڈنے کا جو مرحلہ اس زمانے میں بہت مشکل تصور کیا جاتا ہے، وہ اتنی آسانی سے نمٹے گا یہ اس رب کی کرم نوازی کے سوا اور کیا تھا۔

بڑی امی اور ممی تو شکرانے کے نفل ادا کررہی تھیں خوش تو کشف بھی بہت تھی۔ ایاز اور اس کی خاموش مگر پروقار سی محبت رنگ لائی اور وہ دونوں ایک معتبر رشتے میں بندھ گئے۔

ایاز کی ممی نے تو رشتہ پیش کرتے کے ساتھ ہی کشف کی انگلی میں، اپنی خاندانی انگوٹھی بھی پہنادی تھی۔ بڑی امی تو جواب کے لیے رسمی مہلت لینا چاہ رہی تھی لیکن جب شوہر نے خوش دلی سے، رشتہ قبول کرنے کا عندیہ دے دیا تو انہوں نے بھی مزید پس وپیش کرنا کفران نعمت جانا اور ایاز کی ممی کو اپنی خواہش پوری کرلینے دی۔

''کشف! آپ لوگوں کے گھر ہماری امانت ہے جب آپ لوگ حکم کریں گے ہم اپنی امانت لینے آجائیں گے۔'' ان کی خوشی کا عجب ہی عالم تھا۔

''سچی بات تو یہ ہے کہ فائقہ، کہ ہمیں کشف کی شادی کی تو کوئی جلدی ہی نہیں تھی۔

سعدون اکیلا ہے۔ تحریم کی شادی کے بعد وہ بے چارہ گھر سنبھالنے کی کوشش میں ہلکان ہوا رہتا ہے۔ دو، تین مہینے بعد روشانے کی شادی کا ارادہ ہے۔ اب دونوں بچیوں کی اکٹھی شادی تو ہمارے لیے مشکل مرحلہ ہوگی۔ ہمارا تو گھر ہی سونا ہوجائے گا۔'' بڑی امی نے دل کی بات کی۔

''فاطمہ باجی! سچ پوچھیں تو ہمیں بھی ایاز کی شادی کی بہت جلدی ہے۔ ایاز ہمارا اکلوتا بیٹا ہے۔ پڑھائی کا سلسلہ تو تقریباً ختم ہونے والا ہے، ایاز کے بابا کی تو ہمیشہ سے ہی یہ خواہش ہے کہ وہ خاندانی کاروبار میں ہاتھ بٹائے۔ آپ لوگ جانتے ہیں ماشاء اللہ چلتا ہوا کاروبار ہے ہمارا۔ اگر آپ لوگ روشانے بیٹی کے ساتھ ہی ہماری کشف بھی ہمیں دے دیں تو ہم ممنون —— ہوں گے۔''

www.pklibrary.com

ایاز کی ممی تو واقعی ہتھیلی سرسوں جمانے کی خواہش مند تھیں، پھر باہمی مشورے سے چار ماہ بعد شادی کی تاریخ ٹھہرا دی گئی۔

☆☆☆

اب لڑکیوں کا پڑھائی میں جی خاک لگتا تھا، زور و شور سے شادی کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔

روشانے نے بھی بھابھی کے کھڑوس سے بھائی کو قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا۔ سچ تو یہ تھا کہ دل کا کاغذ جو پہلے بالکل کورا تھا اب اس پر سعدون کا نام نقش ہو گیا تھا۔

لیکن سعدون کے کھڑوس ہونے میں اب بھی کوئی شبہ نہ تھا۔

جب سے دونوں کی بات باضابطہ طور پر طے ہوئی تھی، بڑی امی اور ممی اسے دامادوں والا پروٹوکول دینا شروع ہو گئی تھیں۔ انہیں "بے چارے بچے" پر ترس بھی بہت آتا تھا جو زندگی کے دن تنہا کاٹ رہا تھا خیال رکھنے کو گھر میں کوئی ماں یا بہن نہ تھی۔ اکثر اتوار کو ممی کچھ اچھا پکاتیں تو تحریم سے کہتیں کہ وہ بھائی کو بھی کھانے پر مدعو کر لے، ایک دو بار کشف کو بھابھی کی ٹیلی فونک گفتگو سننے کا اتفاق ہوا، تو یک طرفہ گفتگو سے اندازہ ہو گیا کہ موصوف ان زبردستی کی دعوتوں سے ٹھیک ٹھاک عاجز آئے ہوئے ہیں تحریم بھائی کی منت کرتی کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی پر آجائے۔

"تحریم بھابھی پر مجھے تو بہت ترس آتا ہے۔ بے چارے کو اپنے بھائی کی اتنی منت کرنی پڑتی ہے پھر وہ آنے پر راضی ہوتے ہیں۔ چھوٹی ممی کو انہیں روز، روز نہیں بلانا چاہیے۔" کشف نے روشانے کو مخاطب کیا۔

"تو یہ بات اپنی چھوٹی ممی کو سمجھاؤ ناں۔" روشانے کے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ ابھی دس دن پہلے ہی سعدون کو قیمہ بھرے کریلے کھانے کے لیے مدعو کیا تھا۔

ممی شوہر کی فرمائش پر قیمہ بھرے کریلے بنا رہی تھیں اور تحریم بھابھی کے منہ سے نکل گیا کہ یہ سعدون کی فیورٹ ڈش ہے، ممی کی ممتا، جوش میں آئی، سعدون کو کھانے پر بلا لیا یہ اور بات کہ روشانے کو بھی کچن میں کھپنا پڑا اور چکن ہانڈی کے ساتھ ویجیٹیبل رائس اور فیرنی بھی بنانی پڑی۔ اتفاق سے چھوٹی پھوپھو بھی میکے آئی ہوئی تھیں۔

کھانے کے بعد، جب سعدون معزز خواتین یعنی بڑی امی، ممی اور چھوٹی پھوپھو کے نرغے میں تھا روشانے اور کشف اپنے دل پسند مشغلے یعنی چپکے چپکے تانک جھانک میں مصروف تھیں۔ چھوٹی پھوپھو کے ریان کو، پیاری آپیوں کے یوں باہر کھڑے رہنے پر بڑا ترس آیا۔

"مما! آپ لوگ روشنی آپی اور کشف آپی کو بھی اندر بلوا لیں ناں کب سے وہاں کھڑی جھانک رہی ہیں۔"

ریان نے انتہائی معصومیت سے ماں کو مخاطب کیا۔ چھوٹی پھوپھو سٹ پٹا کر ریان سے قاران کے متعلق دریافت کرنے لگیں۔ روشانے اور کشف بھی بوکھلا کر وہاں سے ہٹی تھیں لیکن روشانے اس گھبراہٹ کے عالم میں بھی، سعدون کے چہرے کے تاثر جانچے بنا نہ رہ پائی۔ کوئی اور ہوتا تو منگیتر کی اس معصوم ادا پر زیر لب مسکرا ہی دیتا لیکن اس کا چہرہ سپاٹ کا سپاٹ ہی رہا تھا۔

اس دن کے بعد، اس نے سعدون کی موجودگی میں کبھی تانک جھانک کی کوشش نہ کی تھی۔

پتا نہیں یہ شخص اتنا مغرور اور بے نیاز کیوں دکھتا تھا۔ سب بڑے اس کی متانت اور بردباری پر فدا تھے اور روشانے کو یہ سنجیدگی بے زاری لگتی تھی۔ شادی کی تیاریوں میں تحریم بھابھی اس کی پسند ناپسند کو بھرپور اہمیت دے رہی تھیں۔ ملائیشیا میں مقیم تمکنت باجی کا اتنی جلد، دوبارہ پاکستان آنا ممکن نہ تھا لیکن وہ بھی ٹیلی فون پر مستقل رابطے میں تھی اور روشانے پر واری صدقے ہوتی رہتی تھیں۔

نکہت خالہ جو بھابھی کی سگی خالہ تھیں جس طرح بھانجی کی شادی میں پیش پیش تھیں، اب بھانجے کی

شادی میں بھی اتنی ہی دل جمعی سے حصہ لے رہی تھیں۔ سب کے سب بہت پرخلوص اور ملنسار لوگ تھے، جانے سعدون اپنے گھر کی جملہ خواتین سے اتنا مختلف کیوں تھا۔

☆☆☆

پھر ایک دن نگہت خالہ کے ساتھ ان کی بیٹی بھی آئی اس طرح دارحسینہ کو روشانے تحریم بھابھی کی شادی میں بھی ایک دو بار دیکھ چکی تھی۔ وہ بلا کی حسین تھی۔ مناسب دلکش سراپے اور دراز قد کے ساتھ وہ سحر انگیز شخصیت کی مالک تھی۔ اس کی ڈریسنگ بھی لاجواب ہوتی تھی۔ کشف کو تو وہ کوئی ماڈل گرل ہی لگتی تھی۔

عنبر کو بھی شاید اپنی خوب صورتی اور سحر انگیز شخصیت کا بھرپور ادراک تھا، اس لیے اس پر ''خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے۔'' والی کہاوت فٹ بیٹھتی تھی، نگہت خالہ جتنی وضع دار اور ملنسار خاتون تھیں بیٹی ماں کے بالکل برعکس، کشف اور روشانے کو تو حیرت ہوئی تھی جب انہوں نے نوٹ کیا کہ تحریم بھابھی کے ساتھ ان کی کزن کی بے تکلفی نہ ہونے کے برابر ہے۔

تحریم بھابھی نے خالہ کے ساتھ عنبر کو دیکھا تو ان کے چہرے پر سرد مہری سی چھا گئی تھی عنبر کو اس سرد مہری سے کوئی سروکار ہی نہ تھا، وہ بہت گہری نگاہوں سے روشانے کو دیکھنے میں مصروف تھی۔

''ماشاء اللہ بہت پیاری ہے ہماری بیٹی، خیر سے کہیں بات وات طے ہے؟'' بڑی امی نے ذہن میں کلبلاتا سوال پوچھ لیا۔

''آئی ایم اٹیچڈ آنٹی! آپ اطمینان رکھیں۔'' جواب نگہت خالہ کے بجائے عنبر نے خود دیا تھا اور اس جواب پر ڈرائنگ روم میں ایک لمحے کو خاموشی چھا گئی۔

''خالہ! آپ چائے لیں ناں ٹھنڈی ہو جائے گی۔'' تحریم نے اس بوجھل خاموشی کو توڑا، تیکھی نگاہ عنبر پر بھی ڈالی جو محظوظ مسکراہٹ لبوں پر سجائے بیٹھی تھی۔ شرمندہ شرمندہ سی نگہت خالہ نے بھی شادی کی تیاریوں کے حوالے سے کوئی بات چھیڑ کر گفتگو کا موضوع بدلا تھا۔

مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد روشانے اور کشف اسی مغرور سی لڑکی کو ڈسکس کر رہی تھیں۔

''اتنی خوب صورت لڑکی ہے عنبر۔ تحریم بھابھی نے بھائی کے لیے اسے کیوں نہ چنا؟ روشانے نے الجھن سہیلی سے شیئر کی۔

''یہ کیا احمقانہ سوال ہے روشانے! خود سوچو جب ہم اویس بھائی کا رشتہ مانگنے گئے تھے تو تمہیں دیکھ کر کسی نے کیوں نہ پوچھا کہ اتنی خوب صورت لڑکی کے ہوتے ہوئے باہر رشتہ کیوں دیکھا جا رہا ہے۔ کزنز میں فقط دوستی یا بھائی بہن والا رشتہ بھی تو ہو سکتا ہے ناں۔ ضروری تو نہیں ایک عمر کے لڑکا، لڑکی خاندان میں ہوں تو کزن میرج ہی کی جائے۔'' کشف نے روشانے کا واہمہ ہوا میں اڑا دیا۔

''اور ویسے بھی یہ لڑکی تو شکل سے ہی اتنی مغرور سی لگ رہی تھی۔ تحریم بھابھی وغیرہ پاگل تھے جو اکلوتی بھابھی اسے بناتے۔ تم نوٹ نہیں کیا بھابھی تو اسے بالکل لفٹ بھی نہیں کروا رہی تھیں۔ انہیں تو اس کی آمد ہی ناگوار لگ رہی تھی۔ تم نے ان کے چہرے کے تاثرات دیکھے نہیں تھے۔''

کشف کے کہنے پر روشانے نے ہنکارا بھرا تھا۔ ''ہاں شاید تم ہی ٹھیک ہو۔''

کشف کی بات سے اتفاق کے باوجود اس کا دل کچھ بے چین سا ہو گیا تھا اور آئندہ آنے والے وقت نے اس کے خدشات کو سچا ثابت کر دیا تھا۔

☆☆☆

ایاز نے کشف کی سالگرہ پر قیمتی پرفیوم اور پھول بھجوائے تھے۔ اب جب شادی میں چند دن ہی رہ گئے تھے بڑی امی کو تحفہ بھیجنا مناسب نہ لگا تھا۔

''اس لڑکے میں تو متانت نام کو نہیں۔ ابھی ہفتہ پہلے روشانے کی سالگرہ بھی تو گزری ہے سعدون چاہتا تو وہ بھی تو تحریم کے ہاتھ تحفہ بھجوا سکتا تھا مگر بہت ہی سلجھا ہوا بچہ ہے۔ ایک یہ ایاز ہے، سونیا کے ہاتھ تحفہ بھجوایا۔ تہمینہ و علم ہوگا تو کیا سوچے گی۔'' وہ

خفگی کا اظہار کر رہی تھیں۔

تہمینہ یعنی بڑی پھوپھو کی بڑی بیٹی سونیا باجی ایاز کا گفٹ لے کر آئی تھیں۔ بے چارہ اس زمانے میں اس سے زیادہ، بشرطی لڑکا ہونے کا کیا ثبوت دیتا دونوں کے بیچ ٹیلی فونک رابطہ تک نہ تھا۔ اپنی بہنوں جیسی سونیا آپی کے توسط سے گفٹ بھیجنے میں کامیاب ہوا تھا اور بڑی امی کی نکتہ چینی کشف کو ٹھیک سے خوش بھی نہ ہونے دے رہی تھی۔

"کیا تھا جو سعدون بھائی بھی تمہیں کوئی تحفہ بھجوا دیتے۔ امی کو تو ہر معاملے میں وہ ہی حد سے زیادہ شریف، سمجھ دار اور بردبار لگتے ہیں۔ ایاز نے فقط برتھ ڈے گفٹ ہی تو بھجوایا ہے اور امی اتنی خفا ہو رہی ہیں۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

روشانے کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ اس کی اور کشف کی سالگرہ آگے پیچھے آتی تھیں ابھی پچھلے ہفتے اس کی سالگرہ گزری تھی۔ تحریم بھابھی نے اسے بہت خوب صورت برانڈڈ جوڑا گفٹ کیا تھا۔ ملائیشیا میں مقیم تمکنت باجی نے بھی نہ صرف فون کر کے سالگرہ کی مبارک باد دی تھی بلکہ تحریم کے ذریعے اپنا تحفہ بھی بھجوایا تھا، اس سب کے باوجود وہ دل سے خوش نہ ہو پائی، دل میں موہوم سی امید تھی کہ سعدون خود نہ سہی بہن کے ہاتھ اسے فقط برتھ ڈے کارڈ ہی بھیج دے۔

ایسی بھی کیا متانت اور بردباری جس میں کسی کے جذبات واحساسات کی پروا ہی نہ کی جائے۔

روشانے کو یہ بردباری، سراسر سرد مہری لگتی تھی گھر والے جانے کیوں اس کے سن گائے جاتے تھے۔ اب اس کی وجہ سے بے چاری کشف کی خوشی بھی کرکری ہو رہی تھی۔ روشانے کے چہرے پر چھائی افسردگی کشف کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہ پائی۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

"اچھا یار، اب چھوڑو ادھر ادھر کی باتیں۔ امی نے ہمیں ایک ہفتے کا ٹائم دیا ہے ساری شاپنگ فقط اسی ہفتے میں نمٹانی ہے پھر امی اور چھوٹی ممی ہمیں گھر سے قدم باہر نہیں نکالنے دیں گی۔ آؤ اپنی شاپنگ لسٹ کو فائنل ٹچ دیتے ہیں، ابھی تو اتنی ڈھیر چیزیں رہتی ہیں اف کیسے ہوگی سب تیاری۔"

کشف نے افراتفری مچا کر اس کا دھیان بٹانا چاہا اور اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب بھی ہوگئی تھی۔

☆☆☆

وقت کو واقعی گویا پر لگ گئے تھے۔ وہ دن بھی بہت جلد آن پہنچا تھا۔

بارات کو مختصر تھی کہ ان کے زیادہ تر دھیالی رشتہ دار بیرون ملک مقیم تھے فقط نگہت خالہ، قریبی رشتہ دار تھیں کچھ دور پار کے احباب اور کچھ سعدون کے کولیگز اور ان کی فیملیز۔

مہمانوں کی اکثریت، رخصتی کے بعد اگلے روز ولیمے کی تقریب میں ملنے کا کہہ کر اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر اپنے اپنے گھر روانہ ہوگئے۔ تحریم بھابھی اسے رخصت کروا کر گھر لے گئی تھیں۔ وہ بھائی کی شادی پر اپنے سارے ارمان پورے کر رہی تھیں۔ نگہت خالہ سے پوچھ پوچھ کر ساری خاندانی رسمیں ادا کی جا رہی تھیں۔

ویڈیو کال پر تمکنت باجی بھی اس تقریب میں بھرپور شرکت کر رہی تھیں۔ ان کے بچے بھی اتنی پیاری مامی کو دیکھ کر بہت پرجوش ہو رہے تھے۔

"ماموں پہلے شادی پر مان جاتے ناں تو تحریم آنی کے ساتھ ہی ان کی بھی شادی ہو جاتی۔ ہم یہ ٹینشن مس تو نہ کرتے۔" عینا کا جی کر رہا تھا کہ پر لگا کر اڑتی آئے اور اس تقریب میں شامل ہو جائے۔

"سعدون پہلے مان جاتا تو تمہیں اتنی پیاری مامی کیسے ملتی بیٹا جی۔ یہ تو تمہاری تحریم آنی نے اپنی شادی کے بعد ہی ڈھونڈی ہے ناں۔" نگہت خالہ اس پر پیار بھری نگاہ ڈالتے ہوئے مسکرا کر بولی تھیں۔

"دیٹس رائٹ، روشانے مامی آپ واقعی بہت کیوٹ بہت سوئیٹ ہیں۔ سچ بتاؤں تو میں نے آج سے پہلے اتنی خوب صورت برائیڈ نہیں دیکھی۔"

عینا اپنی مامی پر فریفتہ ہوئے جا رہی تھی۔ تمکنت باجی بھی تحریم بھابھی سے اس کی نظر اتارنے کا کہہ رہی

تھیں، اتنی تعریف سن کر روشانے محجوب ہوئے جارہی تھی۔

"سعدی تم کہاں ادھر ادھر پھر رہے ہو۔ اپنی دلہن کے ساتھ دو چار یادگار پکس ہی بنوالو۔"

ذرا دیر بعد جٹ تحریم بھابھی اور نگہت خالہ منظر نامے سے ہٹیں تو کافی دیر سے خاموش بیٹھی عنبر نے سامنے سے گزرتے سعدون کو پکارا۔

"نہیں یار تھک گیا ہوں اس فوٹو سیشن سے۔" وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ دونوں کا طرز تخاطب ان کی گہری بے تکلفی کو ظاہر کررہا تھا۔

"آجاؤ فوراً نخرے نہ کرو، اس یادگار موقع کی میرے پاس بھی تو کوئی پک (تصویر) ہونی چاہیے ناں۔" وہ دھونس بھرے انداز میں بولی۔

"او کے بھائی اب تم رہ گئی ہو تم بھی فوٹو گرافر بننے کا شوق پورا کرلو۔" وہ مسکراتے ہوئے روشانے کے پہلو میں آن بیٹھا تھا۔

"بہت خوب تو یہ شخص مسکراتا بھی ہے۔" اس مسکراتے لہجے نے روشانے کے لبوں سے مسکراہٹ چھین لی تھی۔ عنبر نے کھٹا کھٹ ان کی کئی تصویریں بنالی تھیں۔

"تم کب سے اسٹیچو بنی ہوئی ہو ریلیکس ہوجاؤ روشانے!" عنبر اس سے بظاہر بڑی اپنائیت سے بولی تھی۔ روشانے خاموشی سے اسی پوزیشن میں بیٹھی رہی۔

"ویسے سچی بات ہے مجھے تو پاکستانی دلہنوں پر بہت ترس آتا ہے۔ اتنا ہیوی ڈریس، ہیوی جیولری، ہیوی میک اپ تو یہ، کسی عجوبے سے کم نہیں ہوتی ہیں بے چاریاں پھر کئی گھنٹوں تک کسی سنگی مجسمے کی طرح ساکت بیٹھے رہو۔ فقط آنکھیں سپٹپٹانے کی اجازت ہوتی ہے۔"

عنبر کا مسخرانہ لہجہ روشانے کو بری طرح سلگا گیا تھا اس نے چند لمحوں تک انتظار کیا کہ پہلو میں بیٹھا شخص اس لڑکی کو ٹوک دے گا مگر شاید اسے اس کی بات اتنی پسند آئی تھی کہ وہ مسکرادیا تھا۔ اب "سنگی مجسمے" میں مزید برداشت کی تاب نہ تھی۔

"پاکستانی دلہنیں اتنے بھاری بھرکم لباس اور وزنی زیورات میں عجوبہ لگتی ہوں گی لیکن انتہائی دلکش عجوبہ اسی لیے تو لوگوں کا دیکھ دیکھ کر دل نہیں بھرتا۔ ہاں بے چارے دولہا کا معاملہ مختلف ہے۔ کلاہ اور شیروانی میں اکثر دولہا کسی ہوٹل کے دربان لگتے ہیں پھر بھی بڑے شوق سے یہ سب زیب تن کرلیتے ہیں۔" وہ شرم سے جھک بالائے طاق رکھتے ہوئے بول پڑی تھی، عنبر کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"تمہاری دلہن کے منہ میں زبان بھی ہے سعدی! جان کر اچھا لگا۔" وہ لطف لیتے ہوئے بولی تھی۔

"تمہاری تصویریں ہوگئیں۔ اب میں جاؤں۔" وہ خفگی بھرے لہجے میں بولا اور پھر واقعی اٹھ کر چلا گیا۔ روشانے کے دل پر بوجھ پڑ گیا شاید اسے برداشت سے کام لینا چاہیے تھا۔

اس کے شوہر کی نگاہوں میں اس کا پہلا تاثر ایک زبان دراز لڑکی کے طور پر نہیں جانا چاہیے تھا وہ کیوں اپنی ماں کی تربیت اور نصیحت کو فراموش کر بیٹھی تھی۔

بڑی امی اور ممی نے کشف اور اسے کتنی ڈھیر ساری نصیحتوں کے ہمراہ رخصت کیا تھا لیکن کیا وہ اپنی بے عزتی چپ چاپ برداشت کرکے اس لڑکی کو اور شہ دے دیتی۔ وہ جس کی بے تکلفی اور اپنائیت بھرے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ سعدون کی زندگی میں خاص مقام رکھتی ہے۔

ہم عمر کزنز کی روایتی بے تکلفی سے الگ، یہ کوئی اور ہی چیز تھی جو روشانے کو کھٹک رہی تھی۔

تحریم بھابی اندر آئیں تو روشانے کو دیکھ کر ٹھٹکی تھیں۔ اس کے چہرے پر یقیناً کچھ ایسا تھا جو انہیں چونکا گیا تھا۔

"تم تھک گئی ہوگی روشانے، آؤ چلو تمہیں بیڈ روم میں چھوڑ آؤں۔ دلہن بننا آسان کب ہوتا ہے۔"

وہ اس کا بھاری بھرکم لہنگا سنبھالتی اسے بیڈ روم میں لے جانے لگیں۔ نہ انہوں نے عنبر سے مدد چاہی نہ ہی عنبر نے اپنی خدمات پیش کیں، وہ مزے سے

ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھی رہی۔ تحریم اسے نفاست سے سجے بیڈروم میں لے آئی تھیں۔

''اب تم ریلیکس کرو چندا! میں سعدی بھائی کو بھیجتی ہوں۔'' وہ اسے پیار سے کہہ کر چلی گئی تھیں۔

روشانے ان کے کمرے سے نکلتے ہی اٹھی تھی۔ ذرا دیر پہلے اس کے شوہر کے سامنے اسے عجوبہ ڈیکلیئر کیا گیا تھا اور اس کی مسکراہٹ نے اس بیان کی تائید کی تھی، وہ اب مزید عجوبہ بنی نہیں رہنا چاہتی تھی۔

سعدون کافی دیر بعد جب بیڈروم میں آیا تو وہ دلہنا پے والے روپ سے چھٹکارا پا کر سادہ سوتی لباس میں ملبوس تھی۔ سعدون نے اس بارے میں کوئی استفسار تک نہ کیا اس کے طرز عمل سے صاف ظاہر تھا کہ اسے نہ تو نئی نویلی دلہن سے کوئی سروکار ہے نہ ہی وہ اس سے اس عمل کی وضاحت کا طلب گار ہے۔ وہ ہی ازلی بے نیاز، سرد سپاٹ سا انداز۔

اپنی اس بے توقیری پر روشانے کی آنکھیں پانیوں سے لبریز ہوگئیں۔ یعنی اس کے دل کی گواہی سچی تھی۔ سعدون کی بے نیازی اس کی شخصیت کا حصہ نہیں بلکہ اس بندھن سے بے زاری تھی۔

روشانے کی انا نے اس کے التفات کی بھیک مانگنا گوارا نہ کیا تھا۔

اس رات اس کی سماعتوں نے نہ تو شوہر کی کوئی پیار بھری سرگوشی وصول کی تھی نہ کوئی ستائش بھرا جملہ، مستقبل میں ساتھ نبھانے کا وعدہ، نہ کوئی اور قول اقرار، اس کے نصیب میں جذبات واحساسات سے عاری انسان لکھا گیا تھا اور نصیب سے بھی کوئی لڑ سکا ہے۔

☆☆☆

صبح سویرے سعدون کے مسلسل بجتے موبائل سے روشانے کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ جب تیسری بار فون بجا تو اس نے سعدون کو کندھا پکڑ کر ہلایا۔ اتنے میں فون بج کر خاموش ہو چکا تھا۔

''آپ کے موبائل پر بار بار کسی کی کال آرہی تھی۔'' سعدون نے مندی مندی آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تو اس نے فوراً جگانے کی وجہ بیان کر ڈالی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل سے موبائل اٹھایا اتنے میں ہی فون دوبارہ بجا تھا۔

''کیا مصیبت ہے تحریم! کیوں صبح سویرے جگا رہی ہو۔'' وہ خفگی بھرے انداز میں مخاطب ہوا تھا۔

''ہاں بھئی، جانا ہے تو جاؤ، میں کب روک رہا ہوں۔'' وہ بیزاری سے گویا ہوا، دوسری جانب تحریم نے جانے کیا کہا تھا۔

''تو ٹھیک ہے یار! جاؤ تم اپنی نند کے ہاں ناشتا لے کر۔ میں تو تمہیں رات کو بھی کہہ رہا تھا کہ تمہارے گھر کو تمہاری ضرورت ہے اپنی وہاں کی ذمہ داری نبھاؤ، بلاوجہ کی ٹینشن لے کر ادھر سے ادھر چکر کاٹ رہی ہو۔''

وہ اب رسانیت بھرے انداز میں گویا ہوا تھا۔ تحریم نے آگے سے کوئی اور بات کی تھی جس کے جواب میں وہ مزید جھنجلایا تھا۔

''ارے بابا! کہا ہے ناں تم یہاں کی ٹینشن نہ لو۔ نہ ہی یہاں دوبارہ ناشتا لے کر آنے کی ضرورت ہے تم جانتی ہو میں ناشتے میں فقط دو سلائس اور چائے کا ایک کپ لیتا ہوں۔ روز بناتا ہوں آج بھی بنالوں گا۔

نہیں، میں نے کہہ دیا۔ دوبارہ آنے کی زحمت نہ کرنا، آج ویسے بھی تمہاری سخت روٹین ہوگی شام کو تمہاری نند کے ولیمے کا فنکشن ہے کل ہمارا ولیمہ ہوگا۔ کل بھلے سے صبح سویرے پہنچ جانا۔ اب خود بھی سکون کرو اور مجھے بھی سکون کرنے دو۔ ارے ہاں بابا، فریج میں پڑا ہے سب کچھ۔ روشانے کا جو جی کرے گا کھالے گی ورنہ میں بازار سے لادوں گا۔ بس یا اور کچھ؟'' وہ چڑ کر بولا تھا۔

تحریم نے فون بند کیا تو وہ پھر سے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ روشانے کی نیند اڑ چکی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ فوراً کمرے سے نکلے اور تحریم بھابھی کے ساتھ ہی گھر چلی جائے۔

''تحریم ناشتا لانے کا کہہ رہی تھی میں نے منع کردیا۔ حماقت ہی ہے بجائے اس کے کہ یہاں ناشتا تیار کر کے چلی جائے۔ واپس اپنے گھر جائے گی اور وہاں سے ناشتے کے لوازمات لے کر آئے گی۔''

سعدون نے اسے مخاطب کر کے گفتگو کا خلاصہ سنایا تھا۔

"یہ حماقت نہیں ہے، اسے رسم کہتے ہیں۔ ناشتا میکے سے آتا ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں کہے بنا نہ رہ پائی تھی۔

"کیا رکھا ہے ان فضول کی رسموں میں اگر تمہارا دل اپنے میکے کا ناشتا کرنے کو کر رہا ہے تو میں تحریم کو روکتا ہوں۔ فٹافٹ تیار ہو کر اسی کے ساتھ چلی جاؤ، شام کو تمہاری کزن کا ولیمہ ہے میں بھی ڈائریکٹ وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

سعدون کے زرخیز ذہن سے کیا آئیڈیا برآمد ہوا تھا۔ روشانے نے تائید و تردید کے بجائے خاموش رہنے کو ترجیح دی تھی، اسے جواب کا کب انتظار تھا کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

"تم بھی سو جاؤ، اتنی جلدی جاگ کر کیا کرو گی۔" وہ شاید سونے کا بہت شوقین تھا جب ہی اسے بھی مفت مشورے سے نوازا۔

"گھر میں کوئی اور ہے، میرا مطلب ہے مہمان وغیرہ۔" روشانے نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"مہمان تو کل بھی کب تھے بس خالہ اور عنبر تھیں۔ ان کا بھی ڈرائیور لینے آ گیا تھا۔ تحریم بلاوجہ رکی تھی حالانکہ میں تو اسے بھی کہہ رہا تھا کہ چلی جائے رات چلی جاتی تو اب صبح صبح نیند تو خراب نہ کرتی۔"

"توبہ ہے اب بندہ ایسا بھی نیند کا کیا رسیا۔" روشانے نے دل میں سوچا تھا۔

"عذرا داس، گیارہ بجے سے پہلے نہیں آتی اس کے دروازہ بجانے سے پہلے کوئی اور ڈسٹرب نہیں کرے گا۔ سو جاؤ سکون سے۔" وہ آنکھیں موندے اسے بھی سونے کی برابر تلقین کر رہا تھا۔

"کون عذرا؟" نیا نام سن کر روشانے کو دریافت کرنا ہی پڑا تھا۔

"ہماری ملازمہ اور کون یار؟" اب وہ قدرے جھنجلا گیا تھا۔

روشانے ایک پل کو خاموش ہو گئی۔ وہ محبت بھرے انداز میں نہ سہی جھنجلائے ہوئے انداز میں ہی سہی بے تکلفی برت گیا تھا۔

"آپ سو جائیں سکون سے میں فریش ہو کر باہر جا رہی ہوں ویسے بھی میری ایک بار آنکھ کھل جائے تو دوبارہ نیند نہیں آتی۔" روشانے رسانیت بھرے انداز میں کہتی اس کے پاس سے اٹھ گئی تھی۔

سعدون نے تو یقیناً سکون کا ہی سانس لیا ہوگا۔

وہ تازہ دم ہو کر کمرے سے باہر نکلی۔ گھر میں واقعی کوئی نہ تھا۔ تحریم جا چکی تھی۔ پتا نہیں تحریم بھابھی کو لینے اویس بھائی آئے ہوں گے یا بڑی امی نے ڈرائیور بھیجا ہوگا۔

اسے اس پل سب گھر والے بڑی شدت سے یاد آئے تھے گھر میں بھی تو ان دونوں کی کمی کتنی شدت سے محسوس کی جا رہی ہوگی۔

وہ اور کشف، بڑے ابو کے بقول گھر کی ساری رونق ان دونوں کے دم سے ہی تھی اور یہ وقت گھر میں ویسے ہی بڑی رونق والا ہوتا تھا۔ ناشتے کی میز پر سب اکٹھے ہوتے تھے بڑے ابو اخبار کی سرخیاں باآواز بلند پڑھتے تھے، پھر سب گھر والوں کے تبصرے ہوتے تھے۔

گھر میں سیاسی وابستگی رکھنے والے دو گروپ تھے۔ بڑے ابو، ڈیڈی اور روشانے ایک سائیڈ پر ہوتے تھے جبکہ ممی، بڑی امی اور اویس بھائی دوسری طرف۔

کشف کو سیاست اور حالات حاضرہ سے خاص دلچسپی نہ تھی وہ صرف دل جمعی سے ناشتا کرتی، روشانے کا معاملہ مختلف تھا اسے بڑے ابو اور ڈیڈی کی دیکھا دیکھی کم عمری سے ہی اخبار بینی کا چسکہ لگ گیا تھا۔ اس کی دلچسپی اور رجحان کی حوصلہ افزائی بڑے ابو نے کی تھی، ان کی اسٹڈی میں چڑیا کو بھی پر مارنے کی اجازت نہ ہوتی لیکن روشانے کے لیے اس اسٹڈی روم کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے، وہ خوش ہو کر کہتے کہ روشانے کی شکل میں انہیں اس ادبی، عملی خزانے کا وارث مل گیا ہے نصابی کتابوں کے ساتھ

ساتھ روشانے کے سرہانے ملکی یا غیر ملکی ادب کا کوئی شاہکار ضرور موجود ہوتا۔

بڑے ابو اپنی عزیز از جان بھتیجی کے ساتھ علمی ادبی بحث کرتے، ہاں ناشتے کی میز پر فقط ملک کے سیاسی حالات زیر غور آتے اور سب ہی شریک گفتگو ہوتے۔ لطیف پیرائے میں ایک دوسرے کی سیاسی وابستگیوں پر طنز کیے جاتے لیکن سب کچھ ہنستے مسکراتے ہوتا اور کتنا مزہ آتا جب سب مل بیٹھتے تھے۔

روشانے کو اس پل سب اتنی شدت سے یاد آئے کہ آنکھیں بھیگ گئیں اتنے میں پیچھے سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ چونک کر مڑی۔ سعدون تھا جو ذرا بیزاری سے اس کی طرف اس کا موبائل بڑھا رہا تھا۔

"یہ تم بیڈ روم میں بھول آئیں شاید تمہارے گھر سے فون آرہا تھا۔"

روشانے نے بے قراری سے دیکھا۔ ممی کے نمبر سے دو مسڈ کالز تھیں اس نے فوراً کال ملائی۔ سلام دعا کے تبادلے کے بعد ممی نے چھوٹتے ہی ناشتے کا پوچھا۔

"اویس اور تحریم کشف کے ہاں ناشتا لے کر گئے ہیں۔ تمہاری چھوٹی پھوپھو، پھوپھا تمہاری طرف آرہے ہیں۔ تم لوگ جاگ گئے ہو ناں؟" وہ پوچھ رہی تھیں۔

روشانے نے موبائل کان سے ہٹا کر دھیرے سے سعدون کو مخاطب کیا۔

"ممی کہہ رہی ہیں چھوٹی پھوپھو ناشتا لے کر آرہی ہیں۔" اور اس ذرا سی بات پر ہی موصوف کے پہلے سے بگڑے تیور مزید بگڑ گئے تھے۔

"حد ہوتی ہے بھئی، لگتا ہے ناشتے کے سوا دنیا میں کوئی دوسرا مسئلہ ہی نہیں۔" وہ بڑبڑایا تھا ساتھ ہی ہاتھ کے اشارے سے منع بھی کردیا۔

"ممی! ناشتے کا تکلف رہنے دیں۔ سعدون نے مجھے ناشتا کروادیا ہے۔" اس نے فراٹے سے جھوٹ بولا پھر ایک دو باتیں مزید کر کے انہیں مطمئن کیا۔ سعدون کی پیشانی کے بل کم ہوئے تھے۔ کال منقطع ہوئی تو اس نے کچن کی سمت اشارہ کیا۔

"ہاں کچن میں ہر چیز موجود ہے، اپنی مرضی کا ناشتا کرو میں سونے جارہا ہوں اور ہاں آئندہ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے اپنا سیل فون ہمراہ رکھا کرو۔"

"مطلب کیا ہے آپ کا کہ میں سونے جارہا ہوں۔ میں ایک دن بلکہ ایک رات کی دلہن ہوں خود ناشتا بناؤں گی کیا؟" روشانے نے حیرت سے آنکھیں پھاڑی تھیں۔ اپنی قسمت پر رونا بھی آیا پر اس شخص کے تیور دیکھ کر دل میں تہیہ کرلیا تھا کہ بھلے سے محبت ملے، نہ ملے لیکن وہ ہر پل، ہر گھڑی اسے اپنی موجودگی کا احساس دلوائے گی۔

"نئی نویلی دلہن اگر بریڈ پر جیم لگا کر کھالے گی تو اس کے دلہناپے کو ہرگز کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔" وہ تیکھے تیوروں سے گویا ہوا۔

"جیم بریڈ میرے حلق سے نیچے نہیں اترتا۔ میں پراپر بریک فاسٹ کی عادی ہوں۔" اس کے تیکھے تیوروں سے خائف ہوئے بنا وہ مزے سے بولی تھی۔

"اور یہ پراپر بریک فاسٹ کیا ہوتا ہے بائی داوے" وہ خشمگیں انداز میں بولا۔

"آملیٹ، پراٹھا اور ساتھ کڑک سی چائے، میرا مطلب ہے اسٹرانگ ٹی اور ہاں ہماری فیملی میں کوئی بھی نیند کا دھنی نہیں، سب ہی صبح سویرے اٹھنے کے عادی ہیں اور بس جب ایک بار اٹھ گئے تو اگلا کام مزے دار ناشتے کا ہی ہوتا ہے اور میں تو بھوک کے معاملے میں ویسے ہی بہت کچی ہوں اور اس وقت بھی مجھے زور۔۔۔ کی بھوک لگ رہی ہے پلیز ناشتا جلدی بنایے۔"

"مطلب کیا ہے تمہارا؟" سعدون تو اس فرمائش پر ہکابکا ہی رہ گیا تھا۔

"مطلب تو مجھے آپ سے پوچھنا ہے اگر آپ نے مجھے ناشتا نہیں کروانا تو میرے گھر والوں کو ناشتا

لانے سے کس خوشی میں منع کیا، میں ممی کو کہتی ہوں وہ چھوٹی پھوپھو کے ہاتھ بھجوا دیتی ہیں ناشتا۔" روشانے نے موبائل والا ہاتھ اوپر کیا۔

"مجھے پراٹھا ورا ٹھا نہیں پکانا آتا۔ آملیٹ بنا دیتا ہوں اور توس سینک دیتا ہوں۔" وہ نروٹھے پن سے بولا۔

"ایک کپ چائے بھی۔" روشانے نے پراٹھے پر اصرار مناسب نہ جانا تھا۔ وہ اسے کھانے والی نظروں سے گھورتا کچن کی طرف بڑھ گیا تھا۔ روشانے لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی پندرہ منٹ بعد پٹخنے کے انداز اس کے سامنے ناشتے کی ٹرے رکھی گئی تھی۔

"یہ صرف آج کے لیے تھا۔ کل سے ناشتا کرو، نا کرو یہ تمہارا دردِ سر ہوگا میرا نہیں۔" ساتھ ہی باور بھی کروا دیا گیا تھا۔

"جیسا آپ کا مزاج ہے ناں جلا بھنا سا ویسا ہی آپ نے آملیٹ بنایا ہے۔ میں آج تو زہر مار کر رہی ہوں مگر آئندہ آپ کے ہاتھ کا بنا ناشتا کرنے کا سوچوں گی بھی نہیں۔ سو بے فکر ہو جائیں۔"

روشانے نے اس کے رعب میں نہ آنے کا تہیہ کرلیا تھا۔ وہ اسے گھورتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ روشانے چند لمحے خاموشی سے بیٹھی رہی۔

خود ساختہ ہمت اور اعتماد بس اتنی ہی دیر کے لیے تھا۔ اب ہاتھ پاؤں عجیب ٹھنڈے ٹھنڈے سے ہو رہے تھے، بھوک کا قطعاً کوئی احساس نہ ہوتے ہوئے بھی اس نے ٹرے اپنی جانب کھسکائی۔ تو یہ تھی اس گھر میں اس کی شادی شدہ زندگی کی پہلی صبح۔

آنکھوں کا فرش گیلا ہونے لگا تھا پھر گہرا سانس کھینچتے ہوئے اس نے خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کی اور ناشتا کرنے لگی تھی۔

☆☆☆

رات کشف کا ولیمہ تھا۔ شرمائی لجائی سی کشف پر عجیب ہی روپ چڑھا تھا۔ ایاز کی والہانہ نگاہیں بھی مسلسل اس کا طواف کر رہی تھیں۔

ان دونوں کو دیکھ کر روشانے کو عجیب کم مائیگی کا احساس ہوا۔ اس نے دل ہی دل میں خود کو سرزنش کی کہ وہ جان سے پیاری بہن کو خوش دیکھ کر جیلس ہو رہی ہے، مگر اندر سے جواب آیا کہ وہ تو اپنی بہن کی دائمی خوشیوں کے لیے صدق دل سے دعا گو ہے، یہ عجیب بے بس کرنے والی کیفیت تو سعدون کے رویے کی وجہ سے ہے۔

آج تحریم بھابھی نے اسے شہر کے مشہور پارلر سے تیار کروایا تھا آخر وہ بھی ایک دن پرانی دلہن تھی۔ ولیمے کا فنکشن کل منعقد ہوا تھا لیکن کشف کے سسرال میں بھی، سب اسے دیکھنے اور ملنے کے متمنی تھے۔

ہر کسی نے اس کے لباس اور اس کی تیاری کو کھلے دل سے سراہا تھا۔ سب کے بقول وہ بے تحاشا حسین لگ رہی تھی لیکن جن نگاہوں میں وہ اپنے لیے ستائش دیکھنے کی متمنی تھی وہ نگاہیں اس کی جانب متوجہ ہی نہ تھیں۔

وہ جانے کس سے اپنے سیل فون پر محوِ گفتگو تھا لبوں پر دھیمی مسکان بھی بکھری تھی۔ روشانے کا دل کلس کر رہ گیا۔ فنکشن اختتام پذیر ہوا تو بڑی امی اور ممی نے خاندانی رواج کے مطابق، کشف کو ساتھ لے جانے کی بات کی۔

ایاز نے نگاہوں ہی نگاہوں میں ماں کی منت کی اس کی ممی نے بڑی پھوپھو کی سفارش کا سہارا لیا۔ طے یہ پایا کہ اگلے دن دولہا خود اپنی نئی نویلی دلہن کو لے کر سسرال پہنچ جائے گا۔

"اگر تمہارا موڈ ہے اور تم اپنے گھر جانا چاہو تو جا سکتی ہو۔" سعدون نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"رواج کے مطابق ولیمے کے بعد دلہن اپنے دولہا کے ہمراہ میکے جاتی ہے اور ہمارا ولیمہ کل ہے میں کل گھر جاؤں گی اور آپ کو ساتھ لے کر جاؤں گی۔ تیاری رکھیے گا۔"

جب اس نے روشانے کا جی جلایا تو وہ کیوں اس کا دم خشک نہ کرتی، خفگی بھرے انداز میں وہ منہ

پھیر کر کھڑا ہوگیا۔ روشانے کشف سے الوداعی معانقہ کرنے کے لیے آگے بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

ولیمے کی تقریب میں، عنبر کی سج دھج دیکھنے کے لائق تھی۔ روشانے نے نوٹ کیا کہ پوری تقریب میں اس کے علاوہ، اگر کوئی عنبر سے خائف ہے تو وہ تحریم بھابھی ہیں۔

سعدون ذرا دیر کے لیے ہی عنبر کے پاس کھڑا ہوا تھا لیکن تحریم بھابھی نے، فوٹو سیشن کا بہانہ بنا کر بھائی کو پھر سے اسٹیج پر گھسیٹ لیا۔

مہمانوں کی موجودگی کے لحاظ میں، وہ تحریم کی بات ماننے پر مجبور تھا اور پھر تحریم بھابھی خود سارا وقت اسٹیج پر بھائی کے گرد منڈلاتی رہی تھیں۔ عنبر تقریب ادھوری چھوڑ کر چلی گئی تو انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ روشانے کی زیرک نگاہیں سب محسوس کررہی تھیں۔

تقریب کے اختتام پر روشانے گھر جانے کے لیے بے قرار ہوگئی، اس کی بلا سے سعدون جاتا یا نہیں بس وہ اب اپنوں کے درمیان جانا چاہتی تھی۔

اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب، واپسی کے سفر میں سعدون بھی بنا کہے اس کے ہمراہ تھا۔

ایسے ہی تو وہ بڑی امی اور ممی کی گڈ بکس میں شامل نہ تھا۔

مہذب، وضع دار اور فرماں بردار داماد، وہ اس کے خوب واری صدقے جارہی تھیں لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ اس مہذب اور فرماں بردار شخص کے تیکھے تیور ان کی لاڈلی کو تنہائی میں برداشت کرنے پڑتے ہیں۔

"کیا اسٹوپڈ رسمیں ہیں، دولہا کو بھی سسرال میں رات گزارنی ہے، میں ان لیٹ نائٹ فنکشنز کی وجہ سے پہلے ہی بہت تھکا ہوا ہوں اور اجنبی جگہ پر مجھے ویسے ہی نیند نہیں آتی۔"

"تو کس نے کہا تھا ساتھ آئیں۔ چلے جاتے اپنے گھر، میں بھی اپنے گھر سکون حاصل کرنے آئی تھی، کیا خبر تھی، یہاں بھی آپ کے نخرے برداشت کرنے پڑیں گے۔" روشانے تنک کر بولی تھی۔

"تمہاری تحریم بھابھی کی کارفرمائی ہے، میری فقط یہ مجبوری ہے کہ میری بہن کا سسرال ہے یہ۔ مروت نبھانی پڑتی ہے لیکن مروت نبھا نبھا کر عاجز آگیا ہوں میں۔"

وہ تنی سے کہتا کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ روشانے اپنی جگہ ساکت بیٹھی تھی۔ چند لمحوں بعد، اجنبی جگہ پر نیند نہ آنے کا دعویٰ کرنے والا گہری نیند سو چکا تھا۔ جبکہ روشانے کی رات آنکھوں میں کٹی تھی۔

☆☆☆

شادی کے بعد دعوتی سیریڈ شروع ہو چکا تھا، میکے کی طرف سے بہت سی دعوتیں کشف کی وجہ سے التوا کا شکار تھیں کہ کشف اور ایاز جنی مون کے لیے شمالی علاقہ جات گئے ہوئے تھے۔

وہ لوٹے تو دعوتیں پھر سے شروع ہوگئیں۔ سعدون ان دعوتوں سے اکتایا ہوا تھا لیکن غنیمت تھا کہ یہ دعوتیں، اٹینڈ کررہا تھا اور میزبانوں کے گھر جاکر مصنوعی خوش دلی کا اظہار بھی کرلیتا۔

ہاں آج کا ڈنر نگہت خالہ کی طرف تھا اس کے مزاج میں خود بخود ہی، بشاشت در آئی تھی یہ اور بات کہ روشانے کا وہاں جانے کا قطعی موڈ نہ تھا۔ سادہ، پر خلوص اور ملنسار سی نگہت خالہ سے تو اسے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ وہ تو اسے خاصی اچھی لگنے لگی تھیں۔ جانے ان کی مغرور اور بدلحاظ سی بیٹی، مزاج اور عادتوں میں ماں سے اتنی مختلف کیوں تھی۔

آج اپنی تیاری پر اس نے معمول سے زیادہ توجہ دی تھی۔ پتا نہیں وہ عنبر کے بے پناہ حسن سے خائف تھی یا شوہر کی نگاہوں میں اسے دیکھ کر، جو چمک ابھرتی وہ اسے عدم تحفظ میں مبتلا کردیتی تھی۔

وہ آج کی دعوت میں عنبر کے سامنے پھیکا نہ پڑنا چاہتی تھی، اپنے جہیز کا سب سے قیمتی اور مہنگا لباس زیب تن کرکے اس نے نہایت سلیقے سے میک اپ کیا تھا، آئینے نے گواہی دی تھی کہ وہ عنبر سے زیادہ نہ

سبھی تو کم حسین بھی نہ لگ رہی ہے۔ سعدون نے البتہ اس تیاری کا کوئی نوٹس تک نہ لیا تھا۔

"جلدی کرو بھئی ہم خاصے لیٹ ہو گئے ہیں۔" روشانے جو اس کی جانب سے کسی ستائشی جملے کی منتظر تھی اس کی نگاہوں تک میں ستائش نہ پا کر بجھ سی گئی۔

نگہت خالہ کے گھر پہنچیں تو انہوں نے پرتپاک استقبال کیا لیکن اس وسیع و عریض شان دار سے گھر میں، ان کے علاوہ ملازموں کی فوج تھی اور کوئی بھی نہ تھا۔ سعدون نے چھوٹتے ہی عنبر کا پوچھا تھا۔

"اپنی کسی دوست کے گئی ہے۔ دیکھو، کب تک واپسی ہو۔" انہوں نے دھیرے سے بتایا تھا۔

سعدون کی آنکھوں کی جوت بجھی تھی لیکن روشانے نے دل ہی دل میں شکر کیا تھا۔ ڈنر ٹیبل پر ذرا سی دیر کے لیے خالہ کے شوہر بھی تشریف لائے تھے۔

روشانے نے انہیں پہلی بار دیکھا تھا، حیرت کی بات تھی کہ وہ شادی کے کسی بھی فنکشن میں شامل نہ ہوئے تھے، سوٹڈ بوٹڈ سے حبیب انکل خاصی رعب دار پرسنالٹی کے مالک لگ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر روشانے کو اندازہ ہو گیا کہ عنبر نے یہ بے پناہ حسن اور مزاج کہاں سے مستعار لیا ہے، رسمی سی دو چار باتیں کر کے انہوں نے باقی ڈنر کے دوران خاموشی اختیار رکھی اور ڈنر کرتے ہی رخصت ہو گئے۔

نگہت خالہ البتہ خوب آداب میزبانی نبھا رہی تھیں۔ انہوں نے روشانے کی ڈھیروں تعریفیں کر کے اسے محجوب بھی کر ڈالا۔ جاتے سمے عنبر کی آمد ہوئی تھی۔

"تم بھی کمال کی لڑکی ہو۔ کبھی کوئی ایسی دعوت دیکھی ہے جس میں میزبان ہی غائب ہو۔" سعدون نے اسے بے تکلفی سے لتاڑا تھا۔

"تم سے کس نے کہا کہ آج کی دعوت کی میزبان میں تھی۔ یہ تمہاری خالہ کی طرف سے دیا گیا ڈنر تھا۔ میرا ڈنر ابھی ڈیو ہے۔" وہ مسکرا کر مخاطب تھی۔

"تو جناب، آپ کب ڈنر پر انوائیٹ کر رہی ہیں۔" اس سے بات کرتے ہوئے سعدون کے لہجے سے شہد ٹپکنے لگتا تھا۔

"میری طرف سے کل ہی آ جاؤ لیکن گھر پر نہیں۔ ڈیسائیڈ کر کے کہیں باہر ملتے ہیں۔" دونوں نے گفتگو میں روشانے کو بالکل نظر انداز کیا ہوا تھا۔ وہ شدید ہتک کے احساس سے دوچار تھی۔

"ٹھیک ہے پھر کل ملتے ہیں۔" سعدون نے فوراً پروگرام ڈن کیا۔

"لیکن کل تو چھوٹی پھوپھو کے ہاں ڈنر ہے۔" روشانے کو نہ چاہتے ہوئے بھی مداخلت کرنی پڑی۔

"ان کا ڈنر کینسل کروا دو، میرا مطلب ہے کہ کل کے بجائے کوئی اور دن رکھ لیں۔ اس میں کیا مسئلہ ہے؟"

سعدون بے نیازی سے بولا۔ روشانے نے بہت مشکل سے ضبط کیا، جانتی تھی کہ اپنی بات پر اصرار کا مطلب، مزید ہتک اور بے عزتی، سعدون اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹنے والا، فی الوقت خاموشی میں ہی عافیت تھی۔ عنبر البتہ اس کے چہرے کے تاثرات بغور جانچ رہی تھی اور محظوظ مسکراہٹ لبوں پر سجائے ہوئے تھی۔

واپسی کے سفر میں روشانے نے دل کی بھڑاس نکالی تھی۔

"کتنے مزے سے کہہ دیا آپ نے چھوٹی پھوپھو کی دعوت کینسل کر دیں، ان بے چاری نے آدھی تیاری تو کر بھی لی ہوگی صرف میری آپ کی دعوت تھوڑی ہے۔ کشف، ایاز ہوں گے، ممی ڈیڈی وغیرہ سب کو انوائیٹ کیا ہوا ہے، دعوت سے ایک دن پہلے ہم جانے سے انکار کر دیں کتنا برا لگے گا اور عنبر کی دعوت قبول کرتے ہوئے یہ بھی نہ سوچا کہ آج ہم ان کے ہاں ڈنر کر چکے ہیں وہ اتنی ال مینرڈ لڑکی کہ اپنے گھر آئے مہمانوں کے استقبال کو گھر میں موجود نہ تھی۔ واپسی پر چند منٹوں کے لیے شکل دکھائی، کھڑے کھڑے کل کی دعوت دی اور آپ نے ایسے

جھٹ سے قبول کرلی۔ جیسے کب سے اس دعوت کی انتظار میں تھے اور پھر اس ایمرجنسی کی دعوت کے پیچھے میری پھوپھو کی دعوت کو منسوخ کروا رہے ہیں۔" وہ نروٹھے پن سے بولی۔

"منسوخ نہیں کروا رہا فقط ایک دن آگے کروا رہا ہوں اور تم ٹینشن نہ لو۔ میں تحریم سے کہوں گا۔ وہ میری آفس مصروفیت کا بہانہ بنا کر پھوپھو سے خود بات کرے گی۔"

سعدون کے پاس ہر مسئلے کا حل تھا۔ روشانے نے مزید بحث نہ کی، ہاں آنکھوں میں آئے پانی کو اس سے چھپانے کی خاطر رخ ضرور موڑ لیا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن سعدون کے آفس جانے کے بعد تحریم کا فون آیا تھا، وہ روشانے سے سعدون کے بیان کی تصدیق چاہ رہی تھی کہ کیا واقعی آفس کے کسی کام کی وجہ سے پھوپھو کی دعوت، ایک دن آگے بڑھائی جا رہی ہے یا کوئی اور بات ہے اور روشانے نے کوئی اور بات چھپانا ضروری خیال نہ کیا۔

آخر تحریم بھابھی کو بھی پتا لگنا چاہیے تھا کہ ان کا لاڈلا بھائی، اپنی کزن کے پیچھے ایک بنا بنایا پروگرام خراب کر رہا ہے۔ تحریم بھابھی روشانے کی بات سن کر چند لمحوں کے لیے بالکل خاموش ہو گئی تھیں۔

"عنبر، سعدی بھائی کی بچپن کی دوست ہے۔ دونوں اکٹھے پڑھے ہیں اس لیے دونوں میں بے تکلفی بھی بہت ہے، تم عنبر کی وجہ سے ہرگز ٹینشن نہ لیا کرو لیکن کوشش کرو کہ اب سعدی بھائی عنبر کو کم لفٹ کروایا کریں۔ وہ موڈی اور سر پھری سی لڑکی ہے۔ اسے اپنی پرائیویسی میں دخل دینے کی اجازت بھی مت دینا۔"

تحریم بھابھی نے بظاہر، لہجے کو سرسری سا بنا کر اسے نصیحت کی تھی لیکن وہ ان کے لہجے میں چھپا خدشہ پا گئی تھی۔

"یہ بات آپ مجھے نہیں اپنے سعدی بھائی کو سمجھائیں۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی روشانے کا لہجہ قدرے تلخ ہو گیا تھا، یہ اور بات کہ فون بند کرنے کے بعد وہ تحریم بھابھی سے یوں مخاطب ہونے پر سخت پشیمانی کا شکار بھی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

رات کو عنبر کی دعوت پر جانے کا اس کا قطعی کوئی موڈ نہ تھا، بل عنبر کی وجہ سے اس نے اپنی تیاری پر بہت توجہ دی تھی لیکن آج دل و دماغ کی کیفیت بالکل متضاد تھی، وہ بہت سادہ سے حلیے میں جانے کے لیے تیار تھی۔

سعدون نے نہ تو کل اسے سراہا تھا نا ں آج اتنے سادہ حلیے کی وجہ دریافت کی تھی، وہ خود خیر بہت نکھرا نکھرا لگ رہا تھا۔ اس بلا کے خوبرو اور وجیہہ شخص نے اس کے دل کی ہر دھڑکن، اپنے نام کر لی تھی لیکن روشانے کو اس کے دل تک رسائی حاصل کرنا فقط ایک خواب لگتا تھا۔

عنبر نے انہیں شہر کے سب سے مہنگے اور بہترین ریسٹورینٹ میں مدعو کیا تھا۔ سیاہ ساڑھی میں اس کا حسن خوب دمک رہا تھا، روشانے لڑکی ہونے کے باوجود اس کے حسن سے مرعوب ہو جاتی تھی، سعدون تو مرد تھا وہ کیسے اس بے پناہ حسن سے نگاہیں چرا سکتا تھا۔

عنبر کو خود اس حسن کا بھرپور ادراک تھا وہ گردوپیش سے اٹھنے والی، ہر ستائشی نگاہ کو حق سمجھ کر وصول کر رہی تھی۔ ڈنر کے دوران سعدون اور عنبر دونوں محو گفتگو رہے۔ اپنی یونی ورسٹی کے دنوں کی شرارتوں، پرانے دوستوں اور بیتی یادوں کو دہراتے ہوئے وہ روشانے کی موجودگی کو فراموش کیے بیٹھے تھے۔

روشانے خود کو دل میں سمجھاتی رہی کہ یہ محض دو پرانے دوستوں کی، بے تکلفی ہے لیکن دل اس بیان کی تصدیق کے موڈ میں نہ تھا۔

آہستہ آہستہ گفتگو کا دائرہ، دوسرے موضوعات کی طرف پھیل گیا، اب عنبر اور سعدون شدومد سے

www.pklibrary.com

ملک کے معروضی حالات ڈسکس کررہے تھے روشانے کو حیرت ہوئی، یعنی موصوفہ انٹیلکچوئل پرسنالٹی بھی رکھتی تھیں۔ حیرت انگیز طور پر کئی معاملات میں عنبر اور سعدون کا نقطہ نظر ایک دوسرے کے بالکل برعکس تھا۔ روشانے سعدون کی ہم خیال تھی مگر بحث میں کودے بغیر خاموشی سے دونوں کی باتیں سن رہی تھیں۔

"لگتا ہے ہماری باتوں سے تمہاری بیگم بور ہورہی ہیں۔"

عنبر نے بظاہر مسکرا کر کہا لیکن اس کی نگاہوں میں بڑی تمسخرانہ سی چمک تھی۔ سعدون نے اس کا فقرہ نظر انداز کرکے اپنی بات جاری رکھی تھی۔ جواب میں عنبر نے زوردار دلیل دے کر اپنے تئیں، سعدون کو لاجواب کردیا جب سعدون سے واقعی کوئی جواب نہ بن پڑا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھی۔

تب دھیمے سے لہجے میں، روشانے خود بخود گفتگو میں شامل ہوگئی۔ اس نے عنبر کے نقطہ نظر سے فوری اختلاف کیا اور یہ محض اختلاف برائے اختلاف نہ تھا۔ ملک کے جید اور معتبر صحافیوں کی رائے پیش کرنے کے ساتھ، وہ بین الاقوامی اخباروں میں چھپنے والے آرٹیکلز کی بنیاد پر اعداد وشمار پیش کررہی تھی۔ بڑے ابو کی صحبت میں ایک عمر گزارنے کے بعد اسے، ان معاملات پر اتنا عبور تو حاصل ہو ہی گیا تھا کہ وہ عنبر جیسی نام نہاد دانشورانہ سوچ کی، اپنی پراثر دلیلوں سے پرخچے اڑا دے۔ دھیما شستہ لہجہ مگر کاٹ دار دلیلیں، وہ بولنے پر آئی تو کسی دوسرے کو ٹوکنے تک کی مجال نہ ہوئی۔

سعدون کی نگاہوں میں بے پناہ حیرت تھی اور عنبر کی نگاہوں میں ناگواری کا احساس۔

"آج کھانا کھا کر مزہ نہیں آیا۔ یہ لوگ اپنے نام کے مطابق معیار برقرار نہیں رکھ پارہے ہیں۔"

اس نے نیپکن سے منہ پونچھتے ہوئے موضوع ہی بدل ڈالا۔ روشانے دھیرے سے مسکرادی اور یہ مسکراہٹ عنبر کو طیش دلانے کے لیے کافی تھی۔ ڈنر کے اختتام پر، وہ نئے نویلے جوڑے کی آمد پر ان کا شکریہ ادا کررہی تھی تو یہ الفاظ بولتے ہوئے اسے ضبط کی کن کڑی منزلوں سے گزرنا پڑا یہ وہی جانتی تھی۔

واپسی کے سفر میں سعدون، پہلی بار روشانے کے لیے ستائشی کلمات ادا کررہا تھا۔ اسے روشانے کی "باخبری" پر واقعی خوش گوار حیرت ہوئی تھی اور وہ اسی حیرت کا اظہار کررہا تھا۔

"تحریم بتاتی تھی کہ تمہارا ذوق اور عادتیں مجھ سے ملتی ہیں، مجھے کبھی یقین نہ آیا۔ آج اندازہ ہوا کہ وہ اتنی غلط بھی نہ تھی۔"

"ذوق کے بارے میں کہہ سکتے ہیں لیکن مزاج اور عادتیں ہرگز نہیں۔"

روشانے نے فوراً تردید کی تھی۔ وہ پہلی بار اس کی کسی بات پر کھل کر ہنسا تھا۔

☆☆☆

جیسے تیسے ہی مگر زندگی ایک ڈھب پر چل پڑی تھی۔ روشانے نے گھرداری سنبھال لی تھی۔ صفائی ستھرائی اور چھوٹے موٹے کاموں کے لیے عذرا آتی تھی۔ درمیانی عمر کی عورت مگر کاموں میں خاصی پھرتیلی تھی، برسوں سے اس گھر کی ملازمہ تھی اور ہر راز سے باخبر۔

ایک بار عنبر سعدون سے ملنے آئی اور اسے ساتھ لے کر، کسی مشترکہ دوست کی طرف چلی گئی تو عذرا نے ہی روشانے کو عنبر سے خبردار کیا تھا۔

"سعدی بھائی کو عنبر باجی کے سائے سے بھی محفوظ رکھیں روشانے بی بی! بہت چلتر لڑکی ہیں یہ۔ شادی کے بعد بھی سعدی بھائی کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی۔"

"ایسی بات نہیں ہے عذرا! دونوں کلاس فیلو ہیں اور پرانے دوست۔ دوستوں کے بیچ اتنی بے تکلفی تو ہوتی ہی ہے ناں۔"

اس نے عذرا کی بات میں دلچسپی لینا اور کوئی رد عمل دینا مناسب نہ سمجھا تھا لیکن عذرا، خود ہی ساری معلومات دینے کو بے قرار بیٹھی تھی۔

pklibrary.com

"یہ جو سعدی بھائی ہیں ناں۔ عنبر باجی کے عشق میں گوڈے گوڈے گرفتار تھے، لیکن بہنیں ان کی عنبر باجی سے شادی پر بالکل تیار نہ تھیں۔ سعدی بھائی نے بھوک ہڑتال کردی، تب نگہت باجی نے ان کا رشتہ ڈالا تھا لیکن آگے سے عنبر باجی نے خود ہی انکار کردیا۔ بیچ سب کے کلیجوں میں ٹھنڈ پڑ گئی۔ میں نے تو خود گھر جا کر دو نفل شکرانے کے پڑھے تھے۔ ایسی بددماغ اور مغرور لڑکی اس گھر کی بہو بن کر آتی تو کیا بنتا بے چاری بہنوں کا، نگہت باجی تو خیر ملائشیا بیٹھی ہیں بے چاری تحریم بھابھی کا میکہ ہی چھوٹ جاتا۔ بس سعدی بھائی کی عقل پر پردے پڑے تھے ورنہ کسی اندھے کو بھی نظر آجائے کہ اس لڑکی کا مزاج اور عادتیں کیسی ہیں۔ ہم جیسے انسانوں کو تو خیر یہ انسان سمجھتی ہی نہیں، یہ تو تحریم باجی تک سے اتنا خار کھاتی تھیں اور تو اور نگہت خالہ تک کی بے عزتی کرتی رہتی ہیں۔" عذرا اپنی ہی دھن میں بولتی جارہی تھی۔

"نگہت خالہ ماں ہیں عنبر کی۔ کوئی اپنی ماں کی کیوں بے عزتی کرنے لگا۔ یوں بے پر کی مت اڑاؤ۔" اس نے عذرا کو ٹوکا۔

"لو جی آپ کو تو کچھ پتا ہی نہیں۔ نگہت خالہ سگی ماں تھوڑی ہیں۔ سوتیلی ماں ہیں عنبر باجی کی۔ اور دنیا سوتیلی ماؤں کے ظلم و ستم کی داستان سناتی ہے لیکن یہاں قصہ ہی الٹ ہے۔ جیسے بدلحاظ نگہت خالہ کے شوہر ویسی ہی بدتمیز بیٹی۔ بے چاری نگہت خالہ تو ایک محل میں ظالم دیو اور خوب صورت چڑیل کی قید میں زندگی گزار رہی ہیں لیکن سعدی بھائی، سب کچھ جانتے بوجھتے بھی اس چڑیل کے عشق میں کیسے گرفتار ہوئے یہ بات میری تو عقل میں سمائی نہیں، خیر شکر ہے وہاں سے خود ہی انکار ہوگیا۔ انکار سن کر مجنوں بن گئے تھے سعدی بھائی تحریم باجی نے آپ کا رشتہ ڈھونڈا تو اللہ اللہ کر کے اس رشتے پر راضی ہوئے، رب کا کیسا کرم ہے کہ خود بخود عنبر باجی سے جان چھوٹ گئی لیکن آپ سعدی بھائی کو ذرا کنٹرول میں رکھیں، مرد کو بھٹکتے دیر نہیں لگتی۔"

عذرا نے بہت خلوص سے مشورہ دیا تھا۔

روشانے کے ہاتھ پاؤں ایک دم سے سن ہوگئے اس نے عذرا کا دھیان اس کے کام کی طرف مبذول کروایا اور خود بیڈروم میں چلی آئی۔ خاندانی ملازم گھر کے بھیدی ہوتے ہیں، عذرا کی باتوں میں سو فی صد سچائی نہ بھی ہو تو کچھ نہ کچھ سچائی تو ضرور تھی۔

وہ جواب تک سعدون کے بے مہر اور سپاٹ سے انداز کو اس کی شخصیت کا خاصہ قرار دے کر، دل کو مطمئن کرنا چاہتی تھی آج ان تمام خوش گمانیوں کا خاتمہ ہوگیا۔

سعدون تک اس کو رسائی اس لیے نہ ہوئی تھی کہ وہاں پہلے ہی کوئی قابض تھا، لیکن عذرا کے بقول انکار عنبر کی طرف سے ہوا تھا تو وہ اب کیوں سعدون کا پیچھا نہ چھوڑ رہی تھی۔

اس گھر میں اس کی آمد بڑھنے لگی اور اکثر ہی وہ کسی نہ کسی بہانے سعدون کو ہمراہ لے جاتی۔ ہر باری اس کی آمد پر، روشانے کا جی کھٹکتا تھا لیکن آج ساری حقیقت جان کر تو گویا جسم میں جان ہی نہیں بچی تھی۔

اس کا شوہر کسی اور کی زلف کا اسیر تھا، وہ یہ حقیقت جاننے کے بعد کیسے اس کے سنگ زندگی گزار سکتی تھی۔ عزت نفس کا پندار، بری طرح مجروح ہوا تھا اور روشانے کی عقل ماؤف ہو چکی تھی کہ وہ کیسے اس صورت حال سے نمٹے۔

دل ہی دل میں تحریم بھابھی پر سخت غصہ آرہا تھا۔ سب کچھ جانتے بوجھتے انہوں نے اس کی زندگی کے ساتھ کھیل کھیلا، شاید اسی لیے وہ کشف کے بجائے اس کی طلب گار ہوئی تھیں۔ اویس بھائی کی سگی بہن کے ساتھ وہ اپنے بھائی کی شادی کا رسک کیسے لے سکتی تھیں، سو قربانی کے بکرے کے روپ میں انہیں روشانے بھا گئی لیکن کیا اس گھر میں اتنے دن گزارنے کے بعد بھی، انہیں اندازہ نہ ہوا تھا کہ ان کے شوہر اور ساس، سسر کی نگاہ میں روشانے کی حقیقت کشف جتنی ہی ہے، اگر وہ گھر والوں کے علم میں سارا معاملہ لے آئے تو کیا تحریم بھابھی کی اپنی

زندگی متاثر نہ ہوگی۔

روشانے ہر پہلو پر غور کر رہی تھی پھر اس نے تھک کر ہار مان لی، وہ کب یہ چاہے گی کہ اس کی وجہ سے اویس بھائی اور تحریم بھابھی کی شادی شدہ زندگی متاثر ہوگی۔

سب کی خوشیوں کی خاطر، سمجھوتہ اسے کرنا تھا اور وہ خود کو، یہ سمجھوتہ بھری زندگی گزارنے کے لیے تیار کرنے لگی تھی۔

☆☆☆

''بہت ذائقہ ہے تمہارے ہاتھ میں۔ کھانا تم واقعی لاجواب پکاتی ہو۔''

سعدون قیمہ شملہ مرچ سے انصاف کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس کے ہاتھ کے ذائقے کو تسلیم بھی کر رہا تھا۔ روشانے کے لبوں پر پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی۔ چلو کسی صورت ہی اس کے لبوں سے ستائش کا کوئی فقرہ تو سننے کو ملا۔

''ویسے آج کل بہت چپ رہنے لگی ہو تم خیریت؟ ورنہ شادی کے بعد تمہارے بولنے کی رفتار سے میں خاصا پریشان ہو گیا تھا۔''

آج اس نے اتنے بہت دنوں بعد اس کی خاموشی نوٹ کر کے خاموش رہنے کی وجہ دریافت کر ڈالی۔

''سیانے کہتے ہیں ایک چپ سو سکھ۔ بس سیانوں کی بات پر عمل کر رہی ہوں۔'' وہ ناخنوں پر نگاہ جما کر بے تاثر سے لہجے میں بولی۔ سعدون نے ایک گہری نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی پھر خود بھی سیانوں کے مقولے پر عمل کرنا مناسب جانا۔

''میں کچھ دنوں کے لیے گھر جانا چاہتی ہوں۔ کشف بھی رہنے آئے گی۔ شادی کے بعد ہم ابھی تک اکٹھے نہیں رہے۔'' کچھ لمحوں کے توقف کے بعد اس نے سعدون کو مخاطب کیا۔

''جتنے دن کے لیے جانا چاہو اتنے دن کے کھانے بنا کر فریز کر جانا۔ بازار کے کھانے سے میرا پیٹ خراب ہو جاتا ہے۔'' سعدون نے اسے جانے کی مشروط اجازت دے ڈالی اور اپنی اس وقعت پر روشانے کا جی جل کر خاک ہو گیا۔ وہ سیانوں کی بات سے روگردانی کرنے کے بارے میں، سوچ ہی رہی تھی کہ عذرا کی اوئی اوئی اور ہائے اللہ کی پکار سن کر جلدی سے اٹھ کر اس کے پاس گئی۔

بہت برا باؤنٹا آ گیا ہے باجی۔'' روشانے کو دیکھ کر وہ کراہی۔ وہ اپنی پنڈلی پکڑ کر دوہری ہوئے جا رہی تھی۔

''مطلب کریمپس (Cramps) روشانے نے اس کی حالت دیکھ کر اس اصطلاح کا درست ترجمہ کیا۔

''ہاں جی وہ ہی..... ہائے اللہ مر گئی میں۔'' وہ پھر چیخی تھی اس کے چہرے سے ہی شدید اذیت کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی پورچ دھو کر آئی تھی۔ شلوار کے پائنچے بھی اچھے خاصے گیلے تھے۔

''اچھا تم بیٹھو تو سہی۔'' روشانے نے اسے صوفے پر بٹھایا اور خود اس کے قدموں میں کارپٹ پر بیٹھ گئی اپنی گود میں اس کی متاثرہ ٹانگ رکھ لی۔ عذرا کی ہاؤ ہو جاری تھی سعدون بھی ادھر آ نکلا۔

''سعدون، پلیز زیتون کے تیل کی شیشی پکڑا ئیے گا۔'' اس نے سعدون کو پکارا۔ سعدون نے شیشی لا دی تو وہ عذرا کی ہاؤ ہو کے باوجود نرم ہاتھوں سے اس کی پنڈلی کی مالش کرنے لگی، ساتھ ہی نصیحتیں بھی جاری تھیں کہ خوراک میں کن اجزاء کی کمی سے یہ مسئلہ جنم لیتا ہے۔

''روشانے بی بی! آپ کا تو جوڑا خراب ہو رہا ہے رہنے دیں جی، میں خود تیل مل لیتی ہوں۔''

عذرا سخت شرمندگی سے دوچار تھی۔ گرد آلود گیلے پائنچے، روشانے کے سوٹ کو بھی داغ دار کر رہے تھے لیکن وہ ان سب سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف تھی۔

سعدون دھیرے سے مسکرا کر واپس پلٹ گیا تھا۔ عذرا کے درد کی شدت میں اضافہ ہوا تو روشانے نے اسے چھٹی دے دی۔ اب گھر کے باقی کام اسے

نمٹانے تھے۔

مصروفیت کا یہ فائدہ ہوا کہ دماغ سے ساری بے کار سوچیں نکل گئی تھیں۔

☆☆☆

سعدون کے لیے ہفتے بھر کے کھانے فریز کر کے وہ میکے آ گئی تھی، کشف اس سے پہلے موجود تھی اور دونوں ماؤں سے خوب لاڈ اٹھوا رہی تھی۔ روشانے بھی آن پہنچی تو گویا سب کی عید ہوگئی۔

وہی گھر، وہی جان چھڑکنے والے گھر والے، وہی ہم جولی لیکن پھر بھی کچھ تھا کہ اب زندگی میں پہلے والی بات نہ تھی۔

کشف کے موبائل فون پر گھڑی، گھڑی ایاز کے میسج آتے، رات کو بھی وہ ایاز سے ہی محو گفتگو ہوتی۔ وہ اور کشف شادی سے پہلے ایک کمرہ شیئر کرتے تھے اب بھی دونوں کا بسیرا وہیں تھا لیکن روشانے کو وہاں، اپنی موجودگی ان کی پرائیویسی میں مداخلت لگتا۔

وہ چپ چاپ لاؤنج میں چلی آئی تحریم بھابھی کسی کام سے وہاں سے گزریں تو روشانے کو کسی سنگی مجسمے کی طرح ساکن بیٹھے دیکھا۔

''کن خیالوں میں گم ہو روشانے؟'' انہوں نے اسے پیار بھرے لہجے میں پکارا۔ وہ اپنے خیالوں سے چونکی۔

''سعدی بھائی یاد آ رہے ہیں ناں۔'' انہوں نے اپنی دانست میں اسے چھیڑا تھا۔ روشانے نے جواب دینے کے بجائے زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجائی۔

''تم خوش تو ہو ناں روشانے''۔ وہ جانے کیا تصدیق چاہ رہی تھیں۔

''جی بھابھی، آپ سب کو خوش دیکھ کر میں واقعی بہت خوش ہوں اللہ سب کی خوشیوں کو اسی طرح قائم رکھے۔''

وہ سادہ سے انداز میں مسکرا کر کہتی واپس کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ تحریم کی پرسوچ نگاہوں نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

☆☆☆

''آپ آج شام کو مجھے لینے آ جائیں۔'' اس نے سعدون کو فون کیا تھا۔

''خیریت ابھی تو وہی فریز کیے ہوئے کھانے باقی ہیں۔'' سعدون کی حیرت بے ساختہ تھی۔ روشانے نے جس طرح ضبط کیا، یہ وہی جانتی تھی۔

''کشف بھی ہفتے بھر کے لیے رہنے آئی تھی لیکن ایاز بھائی کا اس کے بغیر دل نہیں لگا۔ وہ تو برسوں ہی واپس لوٹ گئی ہے۔ آپ بھی شیڈول سے ایک، آدھ دن پہلے مجھے لینے آ جائیں تو شاید ممی اور بڑی امی کے لیے یہ بات اطمینان کا باعث ہو۔ وہ ہر وقت مجھ سے میری خوشی کے بارے میں استفسار کرنے لگی ہیں۔ شاید اب میرا چہرہ چغلی کھانے لگا ہے۔'' وہ صاف گوئی اختیار کیے بنا نہ رہ پائی۔

''اوکے میں شام کو آ جاؤں گا۔''

چند لمحوں کے توقف کے بعد سعدون سنجیدگی سے گویا ہوا۔ روشانے نے کال منقطع کر دی تھی۔

''ابھی سے کیوں جا رہی ہو بیٹا ابھی تو تم نے دو دن مزید رکنا تھا۔'' ممی اس سے پیار بھرے لہجے میں استفسار کر رہی تھیں۔

''بس ممی! سعدون تو کب سے آنے کا کہہ رہے تھے، میں ہی منع کرتی رہی پر اب کشف بھی چلی گئی تو سوچا سعدون کو مزید مت ٹالوں۔ آنے دوں انہیں۔'' وہ رسانیت سے بولی اور ممی تو یہ بات سن کر ہی نہال ہوگئیں۔

''اچھا کیا بیٹا! جب سعدون کا وہاں دل نہیں لگ رہا تو تمہارا جانا ہی مناسب ہے۔ کچھ دن بعد پھر چکر لگا لینا۔''

ممی کے کہنے پر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا جو اطمینان، اس وقت اسے ماں کے چہرے پر نظر آ رہا تھا اس کے لیے یہ جھوٹ اسے سراسر جائز لگا تھا۔

''میرا خیال ہے سعدون کے لیے قیمہ بھرے کریلے بنا لیتی ہوں سعدون کو بہت پسند ہیں۔'' ممی

نے فوراً ہی شام کے کھانے کا مینیو بھی ترتیب دینا چاہا۔

''اب آپ صرف اپنے داماد کی پسند ناپسند کو اہمیت دیتی ہیں، میں نے شام کو کڑھی چاول کھانے ہیں آپ وہ ہی بنایئے گا۔'' وہ ذرا نروٹھے پن سے بولی تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے ناں قیمہ کریلے بھی بنا لیتی ہوں اور کڑھی چاول بھی، بیٹھا تم بنا لینا۔''

ممی نے کہا وہ اثبات میں سر ہلاتی، پھر سے کمرے میں چلی گئی لیکن اس کا آج کوئی بھی نام کرنے کا بالکل موڈ نہ تھا جانتی تھی، ممی سب کچھ خود ہی کر لیں گی۔

میکے آ کر لڑکیاں، یونہی کاہل اور سست سی ہو جاتی ہیں اور اس کے تو دل کا موسم بھی اس جمود بھری کیفیت کا سبب تھا۔ اگر اپنے گھر والوں کا خیال نہ ہوتا تو وہ کبھی بھی سعدون احمد کی زندگی میں کسی ان چاہی ہستی کی مانند شریک نہ رہتی۔

شادی کے بعد احساس ہوا تھا کہ لڑکیوں کو اکثر سمجھوتے اپنے پیاروں کی خاطر کرنے پڑتے ہیں۔

☆☆☆

شام کے کھانے پر، سب ہی سعدون کی راہ دیکھ رہے تھے لیکن اس کی آمد کا کوئی نام نشان نہ تھا۔ روشانے نے دو چار بار کال کرنے کی کوشش کی مگر اس نے کال ریسیو نہ کی۔ وہ سب کے سامنے عجیب خفت سے دوچار تھی۔

اس کے علاوہ تحریم بھابھی تھیں جو عین اسی کیفیت میں مبتلا تھیں، انہوں نے الگ گوشے میں جا کر بھائی سے رابطہ کرنے کی کوشش کی، سعدون نے دوسری دفعہ کوشش کرنے پر کال ریسیو کر لی تھی۔

''سعدی بھائی کہاں ہیں آپ، سب کھانے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آج آپ نے روشانے کو لینے آنا تھا۔'' وہ خفگی بھرے انداز میں استفسار کر رہی تھیں۔

''ہاں یار، بس کام ایسا نکل آیا کہ میں آ نہیں پایا۔'' وہ بولا تھا۔

''ایسا بھی کیا کام سعدی بھائی، اور کم از کم روشانے کا فون ہی ریسیو کر لیتے۔ کب سے ٹرائی کر رہی تھی۔'' تحریم کو بھائی پر خوب ہی غصہ آ رہا تھا۔

''فون سائیلنٹ پر تھا میں عنبر کو لے کر ہاسپٹل آیا ہوا ہوں۔ وہ شاپنگ پر نکلی ہوئی تھی۔ مال میں ہی اس کا بی پی لو ہو گیا۔ اس نے مجھے فون کر دیا۔ بس اسے ڈرپ لگی ہے اب تو ختم ہونے والی ہو گی۔ میں جا کر دیکھتا ہوں اسے ڈسچارج کروا کر گھر بھیج دوں پھر آتا ہوں روشانے کو لینے۔'' وہ تھکے تھکے انداز میں گویا ہوا تھا۔

''بس اب رہنے دیجیے آخر سب کب تک آپ کا انتظار کریں گے، روشانے کو فون کر کے کوئی مناسب سا بہانہ بنا دیجیے اور براہ مہربانی عنبر کا تذکرہ مت کیجیے گا۔''

تحریم نے بہت مشکل سے غصہ ضبط کرتے ہوئے بھائی کو مخاطب کیا۔ سعدون نے تو اس کی ہدایت پر فوری عمل کرتے ہوئے روشانے کو کال ملا لی تھی لیکن تحریم سے اب مزید ضبط کرنا ممکن نہ ہو رہا تھا۔

رات کو جب اویس معمول کے مطابق ماں باپ کے بیڈ روم میں ان کے ساتھ چائے پی رہا تھا تحریم نے اپنے کمرے میں آ کر عنبر کو کال ملائی تھی۔

''خیریت آج میری یاد کیسے ستائی؟'' عنبر نے استہزائیہ انداز میں دریافت کیا۔

''کیسی طبیعت ہے اب تمہاری؟'' تحریم نے سپاٹ سے انداز میں دریافت کیا۔

''میری طبیعت کو کیا ہونے لگا۔ ٹھیک ہوں ایک دم فٹ۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''سعدی بھائی بتا رہے تھے تمہارا بی پی لو ہو گیا تھا۔'' تحریم نے استفسار کیا۔

''میرا بی پی تو لو ہوا تھا یا نہیں پر تمہارا بی پی کیوں ہائی ہو رہا ہے۔'' وہ سراسر اسے چڑا رہی تھی اور بس تحریم کا ضبط بھی جواب دے گیا۔

''عنبر تم کیوں سعدی بھائی کے پیچھے پڑی

ہوئی ہو۔ ان کی شادی ہو چکی ہے۔ ان کی لائف کو ڈسٹرب کر کے تمہیں کیا حاصل ہوگا۔'' عنبر اس کی بات سن کر کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

''تمہارے لہجے کی تپش سے ظاہر ہو رہا ہے کہ سعدی کی زندگی میں میری مداخلت سے سعدی کے بجائے، تمہاری زندگی متاثر ہونے کا زیادہ خدشہ ہے آخر روشانے نند ہے ناں تمہاری۔ سگی نہ سہی رشتے کی سہی لیکن میں نے نوٹ کیا ہے کہ تمہارا شوہر اسے سگی بہنوں کی طرح ہی چاہتا ہے۔ ایم آئی رائٹ تحریم۔''

وہ لطف لیتے ہوئے پوچھ رہی تھی اور لمحے کے ہزارویں حصے میں تحریم کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ سعدی اور روشانے کی زندگی کے بیچ میں آنے کی کیوں کوشش کر رہی ہے۔

''تمہیں میرے ساتھ مسئلہ ہے ناں عنبر۔ سعدی بھائی اور روشانے کی لائف تو ڈسٹرب مت کرو۔ پہلے بھی تمہارے انکار کے بعد وہ بہت مشکل سے سنبھلے تھے بہت مشکلوں سے وہ اپنی زندگی میں آگے بڑھے ہیں، انہیں دوبارہ کوئی آس، امید مت دلاؤ۔ آخر وہ دوست ہیں تمہارے میری دشمنی میں اپنے دوست کے ساتھ تو دشمنی مت کرو۔''

یہ جانتے ہوئے بھی کہ عنبر پر کسی بات کا کوئی اثر نہ ہوگا تحریم منت پر اتر آئی۔

''سعدی سے میری واقعی کوئی دشمنی نہیں۔ میری فقط یہ مجبوری ہے کہ وہ تمہارا بھائی ہے اور.....'' وہ مسکرا کر کہتی ایک لمحے کو رکی تھی۔

''اور یہ کہ اتفاق سے اس کی بیوی تمہاری نند ہے۔ اگر میں سعدی کی زندگی میں مداخلت نہیں کروں گی تو تمہیں مزا کیسے چکھاؤں گی تحریم ڈیئر۔'' عنبر زہر خند انداز میں مسکرا کر بولی تھی۔

''میری زندگی جائے بھاڑ میں تم فقط یہ بتاؤ کہ اگر سعدی بھائی، روشانے کو چھوڑ کر ایک بار پھر تمہارے طلب گار بنتے ہیں تو کیا اس بار بھی انہیں خالی ہاتھ لوٹاؤ گی میرے بھائی کا دل دوسری بار توڑتے ہوئے تمہیں کوئی پشیمانی، کوئی ندامت نہ ہو گی۔''

وہ دکھ بھری بے یقینی سے استفسار کر رہی تھی۔

''مائنڈ مت کرنا تحریم! تمہارے اس بے وقوف بھائی کے پاس اچھی شکل وصورت کے سوا ہے ہی کیا جو میں اس بار اس کے لیے سنجیدگی اختیار کروں گی۔ ڈیڈ نے میرا جہاں رشتہ طے کیا ہے شادی تو میں وہیں کروں گی۔ دل اجڑ گیا ہے تو کیا ہوا۔ ایک پرتعیش زندگی تو گزاروں گی ناں۔ میرا مسئلہ صرف تم ہو۔ اپنے دل کے اجڑنے کا کم از کم بدلہ تمہارا گھر اجڑنا ہے۔ تمہاری باتوں کی وجہ سے ہی احمر مجھ سے متنفر ہوا تھا ناں۔ سزا تو تمہیں بھگتنی ہوگی۔ میں دیکھتی ہوں جب روشانے اپنے گھر آ کر بیٹھے گی تو تمہارے سسرال والے تمہیں مزید کتنے دن اس گھر میں برداشت کریں گے۔ آخر تمہیں اپنے بے چارے بھائی کے پاس ہی واپس آنا پڑے گا اور اس کی دل جوئی بھی تم ہی کرو گی ناں۔ آخر اس کا دوسری بار دل جو ٹوٹا ہوگا۔''

عنبر کے لیے ساری صورت حال بہت پرلطف تھی۔ تحریم نے بنا کچھ مزید بولے کال منقطع کر دی تھی۔

☆☆☆

نانا، نانی کے انتقال کے بعد نگہت خالہ کو امی اپنے گھر لے آئی تھیں۔ چھوٹی بہن کا ان کے سوا دنیا میں تھا بھی کون تمکنت، سعدون اور تحریم تینوں بچوں میں نگہت خالہ کی جان تھی۔ بچے بھی خالہ کو بے تحاشا چاہتے تھے۔

امی کی بھرپور کوشش تھی کہ کوئی مناسب گھر بار دیکھ کر نگہت کو وداع کر دیں، ان کی کوششوں سے نگہت کا رشتہ طے پا گیا۔ توفیق خاندان کا واحد کفیل تھا ماں بہنوں نے اسے اپنی مٹھی میں کرنے کے لیے بیوی سے اتنا برگشتہ کر دیا کہ یہ تعلق بمشکل سال بھر ہی چل پایا۔

معمولی سے جھگڑے میں، ساس نندوں نے انتہائی مبالغہ آرائی کر کے توفیق کو اتنا بھڑکایا کہ وہ فی

الفور نگہت کو طلاق دے بیٹھا۔ وہ ایک بار پھر بہن کی دہلیز پر آن بیٹھی۔

حبیب الرحمٰن بابا کے دوست کے بہنوئی تھے۔ بیوی دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران کسی پیچیدگی کے باعث، جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی بڑی بیٹی چھ سات برس کی ہوگی۔ مختصر گھرانہ اور خوش حال فیملی۔ امی اور بابا نے دعاؤں کے سنگ نگہت کو ایک بار پھر وداع کردیا۔

شادی کے بعد حبیب الرحمٰن کا کاروبار مزید چمک گیا۔ لیکن شوہر مرحوم بیوی کی یادوں سے باہر نکلنے پر تیار نہ تھا۔

نگہت خالہ بہت حسین جمیل نہ تھیں جبکہ حبیب الرحمٰن کی مرحومہ بیوی بلا کی حسین تھی۔ عنبر نے بھی ماں جیسی خوب صورتی پائی تھی، اس نے سوتیلی ماں کو ہمیشہ سوتیلی ہی جانا اور نگہت خالہ کی ہر پرخلوص پیش قدمی کا جواب ہٹ دھرمی سے دیا۔

ہاں سوتیلی ماں کے بھانجے سے اس کی بہت جلد دوستی ہوگئی تھی۔ سعدون اس کا کلاس فیلو تھا اور اب اس کا بہترین دوست بھی بن گیا تھا۔ سعدون کا لڑکپن ختم ہونے کو تھا جب ماں باپ دونوں ایک کار حادثے کا شکار ہوگئے۔ بابا کی پنشن اور واجبات سے کسی طور زندگی کی گاڑی چلنے لگی۔

ملائشیا میں مقیم تایا نے، اپنے بڑے بیٹے کے لیے تمکنت کا رشتہ مانگ لیا اور یوں تمکنت بیاہ کر دور دیس جا بسی۔

سعدون کا بیسٹ فرینڈ احمر، کب تحریم میں دلچسپی لینے لگا۔ اس کا اندازہ سیدھی سادی تحریم کو نہ ہو سکا۔ وہ اس کے لیے صرف سعدی کا دوست تھا۔ عنبر سعدی اور احمر تینوں دوستوں کی تکون یونی ورسٹی میں بھی مشہور تھی۔

عنبر کی فطرت میں حاکمیت تھی، وہ یہ برداشت نہ کرسکتی تھی کہ احمر اور سعدی اس کے علاوہ کسی اور لڑکی سے مخاطب ہو پائیں، سعدون کو تو خیر عنبر کے سوا کوئی اور نظر بھی کب آتا تھا لیکن عنبر جس کو دل دے بیٹھی تھی، وہ عنبر کو دوست سے زیادہ کوئی اور درجہ دینے پر تیار نظر نہ آتا۔

عنبر کی زیرک نگاہوں نے بہت جلد بھانپ لیا کہ احمر کی آنکھیں، تحریم کو دیکھ کر جگمگانے لگتی ہیں سعدون کی غیر موجودگی میں اس نے احمر سے اس بارے میں استفسار کیا تو اس نے بنا جھجک تحریم سے محبت کا اقرار کرلیا۔

احمر کے منہ سے یہ سن کر کہ وہ بہت جلد اپنے والدین کو سعدون کے پاس بھیجنے کا ارادہ رکھتا ہے، عنبر کے غم و غصے کی کوئی انتہا نہ رہی، تحریم ویسے بھی اسے زہر سے کم نہ لگتی تھی وہ ان لوگوں سے جو نیر تھی اور اب تک عنبر کا ہر ریکارڈ بہت کامیابی سے توڑتی آئی تھی۔ شکل وصورت بھی بہت من موہنی تھی، یہ اور بات کہ وہ عنبر کو کسی چیز میں سے کم نہ لگتی۔

احمر کو کچھ کہنے کے بجائے اس نے تحریم کو دھمکانا زیادہ مناسب خیال کیا تھا۔ احمر سے رشتہ جوڑنے کی صورت میں اس نے اسے ہر ممکن دھمکی سے نوازا تھا۔ تحریم کو اس مغرور اور بدمزاج لڑکی کی دھمکیاں سن کر خوف بھی آیا اور شدید غصہ بھی، اسی لیے جب ایک دن موقع پا کر احمر نے اسے دلی واردات سے آگاہ کرنا چاہا تو تحریم نے عنبر کی ساری دھمکیوں کے متعلق بتا کر اس کے جذبوں کی پذیرائی سے صاف انکار کردیا۔

احمر کو عنبر پر سخت طیش آیا تھا۔ عنبر کو خوب جلی کٹی سنا کر اس نے ہمیشہ کے لیے اس سے قطع تعلق کرنے کا اعلان کردیا اور وہ اس وعدے پر قائم رہا۔ تحریم نہیں تو عنبر تو بالکل بھی نہیں۔

وہ پڑھائی ختم ہونے کے ساتھ ہی انگلینڈ چلا گیا وہیں اپنی ماموں زاد سے شادی بھی کرڈالی۔ عنبر نے اسے منانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن وہ اب اس کی شکل دیکھنے کا بھی روادار نہ تھا۔

سعدون کو ان دونوں کی دوستی ٹوٹنے پر اچنبھا تو تھا مگر بہت کریدنے کے باوجود، دونوں نے ہی اس کی وجہ نہ بتائی۔ احمر چلا گیا تو یہ قصہ بھی اختتام پذیر

ہوا۔

اب سعدون، عنبر کو باضابطہ طور پر اپنی زندگی کا حصہ بنانا چاہتا تھا لیکن کہیں اس کوشش میں آڑے آرہی تھیں۔ جب وہ کسی طور اپنے مطالبے سے پیچھے نہ ہٹا تو تمکنت آپی نے مصلحت اسی میں جانی کہ بھائی کے دل کی خوشی پوری کردی جائے۔

تحریم نے جلد اپنے گھر بار کا ہو جانا تھا، زندگی سعدون نے گزارنی تھی تو اس کی پسند کو اپنانا ہی عقل مندی کا تقاضا تھا۔ عنبر جیسی خود پسند لڑکی سے کچھ بعید نہ تھا وہ از خود بھی سعدون کی زندگی میں، شامل ہو سکتی تھی لیکن ان لوگوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب عنبر نے اس رشتے سے صاف انکار کردیا۔

''تمہاری بہنیں مجھے شدید ناپسند کرتی ہیں اور میں ان چاہی بن کر تمہاری زندگی میں بھی شامل نہیں ہونا چاہتی۔''

اس نے جلالی کے انکار کا سارا ملبہ بھی سعدون کی بہنوں پر گرادیا۔

سعدون کی ساری منت سماجت، ساری یقین دہانیاں بے کار گئیں، عنبر کی ناں ہاں میں نہ بدلی بلکہ اس نے اپنے باپ کے منتخب کردہ شخص سے منگنی کرلی۔ سعدون بہنوں سے شدید ترین خفا تھا۔ نگہت خالہ کے سمجھانے بجھانے پر وہ تحریم کی نند سے شادی پر راضی تو ہو گیا۔ مگر دل سے اس رشتے کو نبھانے پر تیار نہ تھا اور عنبر جو کچھ عرصے کے لیے اس کی زندگی سے دور چلی گئی تھی، شادی کے بعد فوراً پہلے والی دوست بن کر واپس پلٹ آئی۔

سعدون اب بھلے سے اسے اپنی دوست ہی سمجھ رہا تھا لیکن وہ کیا سوچ کر، سعدون کی زندگی میں شامل ہوئی تھی یہ بات اب تحریم کے لیے راز نہ رہی تھی۔

☆☆☆

گھر کے کام کاج نمٹاتے ہوئے، جب تحریم کا گزر لاؤنج سے ہوتا تھا تو اس کی ساس اور چچی ساس بہت شوق سے پاکستانی ڈرامے دیکھ رہی ہوتی تھیں۔ یونہی چلتے پھرتے کوئی سین اس کی توجہ بھی کھینچ لیتا ورنہ اس جیسی سیدھا سادہ مزاج رکھنے والی لڑکی کو، یہ کال ریکارڈ کرنے کا خیال قیامت تک نہ آسکتا تھا اب جب کال ریکارڈ ہو ہی گئی تھی تو اسے اس کی اصل منزل کی جانب بھیج بھی دینا چاہیے تھا۔

تحریم گہرا سانس اندر کھینچتے ہوئے پھر سے فون پر جھک گئی تھی۔

☆☆☆

''میرا دل کر رہا تھا میں اسے شوٹ کردوں۔ ماضی میں بھی وہ کہیں اتنا ہراساں کرتی رہی اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں۔''

سعدون انتہائی دکھ سے بہن کو تک رہا تھا۔ روشانے کو موسمی بخار نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ میکے میں اس کا قیام دو چار دن مزید بڑھ گیا تھا۔

تحریم، سعدون کے کھانے فریز کرنے کا کہہ کر میکے آئی تھی۔ یہاں کھانے بنانے کا کس کو ہوش تھا۔ دونوں بہن بھائی تو زندگی کے سود و زیاں کا کھاتا کھولے بیٹھے تھے۔

''پہلے کبھی کچھ کیوں نہ بتایا تحریم۔'' وہ دکھ کی انتہا پر تھا۔

''کیا بتاتی بھائی، کہ آپ کا دوست مجھ سے محبت کرنے لگا ہے۔ مجھے تو یہ یک طرفہ محبت بھی سراسر اپنا قصور لگتی تھی۔ یہ بات تو میں شرم کے مارے تمکنت آپی اور نگہت خالہ کو بھی نہ بتا سکی تھی۔ آپ کو بتانے کی ہمت کہاں سے لاتی۔''

''عنبر کا چہرہ تو دکھا سکتی تھیں ناں۔'' وہ آہستگی سے بولا۔

''ہم بہنوں پر تو عنبر کا چہرہ ہمیشہ سے ہی عیاں تھا۔ اس نے ساری زندگی نگہت خالہ کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھا یہ کوئی ڈھکی چھپی بات تو نہ تھی، بس آپ ہی اس کی محبت میں اندھے تھے۔'' تحریم تلخ ہوئی۔ بات سچی تھی۔ سعدون سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

''میں تمہارے لیے فکر مند ہوں اب جب وہ

روشانے اور مجھے مہرہ نہ بنا سکے گی تب بھی تمہاری زندگی میں زہر گھولنے کی ہر ممکن کوشش ضرور کرے گی۔ اویس کو اعتماد میں لو۔ احمر تمہیں پسند کرتا بھی تھا تو یہ یک طرفہ پسند، ناپسند تھی۔ تمہیں عنبر کے کہی اور وار سے پہلے اویس کے سامنے اپنی پوزیشن کلیئر کرنی ہو گی۔"

عنبر کا اصل روپ دیکھ کر اب وہ واقعی بہن کے لیے پریشان ہو رہا تھا۔

"ہم لڑکیوں کی زندگی کا کتنا بڑا المیہ ہے ناں یہ سعدی بھائی! مجھے اپنے شوہر کے سامنے احمر کی یک طرفہ پسندیدگی کی بھی صفائی پیش کرنی پڑے گی باوجود اس بات کے کہ یہ اویس سے میرا رشتہ جڑنے سے بھی بہت پہلے کا واقعہ ہے اور روشانے کو آپ کی زندگی میں شامل ہونے کے بعد بھی اپنی نگاہوں کے سامنے آپ کا لوافیئر برداشت کرنا پڑا ہے۔"

تحریم بھائی کو بخشنے کے موڈ میں نہ تھی۔

"لوافیئر نہیں تھا۔ میں اسے دوست سمجھ کر ہی ٹریٹ کرتا تھا۔" سعدون نے نگاہیں چراتے ہوئے جواب دیا۔

"اور روشانے کو اپنی زندگی میں وہ مقام اور مرتبہ کیوں نہ دیا جس کی وہ حق دار تھی۔" تحریم مزید تیکھی ہوئی۔ وہ چپ رہا۔

"آپ مسلسل اس پیاری لڑکی کے جذبات و احساسات کو ہرٹ کرنے کا باعث بنے ہیں۔ میں اس کی جگہ ہوتی تو کبھی آپ کو معاف نہ کرتی۔ معافی مانگنے کے لیے اس کے سامنے ناک بھی رگڑنی پڑے تو گریز مت کیجیے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ روشانے کی اصل مجرم میں ہوں۔ آپ اتنی پیاری لڑکی کی ڈیزرو ہی نہ کرتے تھے۔" وہ خفگی سے کہتی اٹھ گئی۔

"بھنڈی اور آلو مٹر دو کھانے بنا رہی ہوں اور ان کے تیار ہونے سے پہلے روشانے کو یہاں موجود ہونا چاہیے۔" وہ کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔

سعدون نے گہرا سانس اندر کھینچا، جب بہن نے اتنی باتیں سنا دی ہیں تو بیوی کون سا رعایت برتے گی۔

اب اس نے عزت نفس اور انا کو پس پشت ڈالتے ہوئے ندامت کے اظہار کے ساتھ غیر مشروط معافی مانگنی تھی۔ اور تب تک مانگنی تھی جب تک معافی مل نہ جاتی۔

☆☆☆

دو دن کے بخار نے اسے، جسمانی طور پر اتنا نہ توڑا تھا جتنا سعدون کی مسلسل بے رخی نے جذباتی طور پر توڑ ڈالا تھا۔ تحریم بھابھی سے اسے اس کی طبیعت کے بارے میں تو پتا لگ ہی گیا ہوگا۔ پھر بھی حال پوچھنے کے لیے ایک کال تک کرنے کی زحمت گوارا نہ کی۔

روشانے آنکھوں پر بازو رکھے کپ سے ایک ہی پوزیشن پر نیم دراز تھی۔ دماغ اس دشمن جان کی یادوں سے باہر ہی نہ نکل رہا تھا، تب ہی کوئی دھیرے سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا، ممی سے کہہ دو اب سر میں درد ہے ٹانگوں میں، مزید مالش کی ضرورت نہیں۔" اس نے اپنی دانست میں نذیراں کو مخاطب کیا ممی ذرا دیر پہلے کہہ کر گئی تھیں کہ وہ مالش کے لیے نذیراں کو بھیج رہی ہیں۔ ممی کی فرماں بردار نذیراں اس کا انکار سننے کے باوجود اس کے قدموں میں بیٹھ کر اس کی ٹانگیں دبانے لگی تھی کولون کی مخصوص مہک پر اس نے پہلے تو چونک کر آنکھیں کھولیں پھر سرعت سے اپنے پاؤں سکیڑے۔

"آپ۔" یہ تو وہ مر کر بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ سعدون احمد یوں اسے اپنے قدموں میں بیٹھا لے گا۔

"لینے آیا ہوں۔" وہ دھیرے سے بولا۔

"کیوں فریزر خالی ہو گیا؟" روشانے نے طنز کیا۔

"نہیں میرا گھر اور میرا دل دونوں تمہارے بن بہت اداس اور خالی خالی ہیں۔ صرف ایک بار ماضی کی تمام تر کوتاہیوں پر معاف کر دو۔ مستقبل میں بھی شکایت کا موقع نہ دوں گا۔" وہ فرماں برداری کی انتہاؤں پر تھا۔

"تحریم بھابھی کی خاطر آئے ہیں۔ بے فکر رہیں میری وجہ سے انہیں کبھی کوئی تنگی یا مشکل نہیں ہو گی نہ ہی میرا اپنے گھر والوں کو کچھ بتانے کا ارادہ ہے۔ آپ لینے آ گئے آپ کا احسان۔ میں اسی کو غنیمت جان کر آپ کے ساتھ چلنے پر تیار ہوں۔ خوامخواہ کی معافی تلافی مت کریں۔" وہ تھکے تھکے انداز میں گویا ہوئی۔

"تحریم کی خاطر نہیں آیا اپنی خاطر آیا ہوں۔ میں جانتا ہوں میرے ماضی کے رویے کے پیش نظر تمہارا مجھ پر یقین کرنا بہت مشکل ہے پھر بھی اگر یقین کر سکو تو کر لو، اب تمہیں ایک بدلا ہوا سعدون احمد ملے گا جو اپنی بیوی کو اس کا جائز مقام اور مرتبہ دے گا۔ اسے نوٹ کر چاہے گا، بنا کہے اس کی ہر خواہش، ہر فرمائش پوری کرے گا۔" سعدون کی سمجھ میں نہ آیا کہ مزید کس طرح اپنی وفاؤں کا یقین دلائے۔

"اس یوٹرن کی وجہ جان سکتی ہوں؟" وہ واقعی بے یقین تھی۔

"اب ماضی کی حماقتوں کا بار بار تذکرہ مت کرو۔ کہا تو ہے اب ایک وفا شعار اور محبت کرنے والا شوہر بن کر دکھاؤں گا۔"

"مجھے لگتا ہے اب بخار میرے دماغ کو چڑھ رہا ہے۔" روشانے اپنے پاؤں پیچھے کھینچ لیے تھے۔ اس بے یقینی نے سعدون کو ندامت کے سمندر میں غوطہ زن کر دیا تھا۔

"معاف کر دو میری جان۔ میری زندگی میں آنے والی اتنے اجلے تن من والی لڑکی، میں واقعی تمہارے قابل نہیں۔" سعدون نے اسے اپنے ساتھ لگا کر سچے دل سے اعتراف اور اقرار کیا تھا۔

روشانے بہت دیر تک خاموش رہی پھر اس کے سینے سے لگے لگے آبشار وقطار رونا شروع کر دیا۔ سعدون نے اسے رونے دیا۔ اتنے بہت سے دنوں کا دل پر جما غبار تھا۔ اس غبار کا دھلنا ہی بہتر تھا۔ وہ ہولے ہولے اس کا سر تھپکتا رہا تھا۔

☆☆☆

"کہاں تھے سعدی۔ اتنے دنوں سے تم سے رابطے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میرا فون کیوں نہیں اٹھاتے۔"

عنبر دندناتی ہوئی کچن میں ہی چلی آئی تھی۔ وہ روشانے کے ساتھ مل کر سبزیوں کی کٹنگ کر رہا تھا۔ عنبر کو دیکھ کر مسکرایا تھا۔

"کہاں ہونا ہے یار، یہیں ہوں اچھا اور فرماں بردار شوہر بننے کی پریکٹس کر رہا ہوں اور دیکھو میں جس نے ساری عمر ہل کر پانی تک نہ پیا تھا اب روشانے کی صحبت میں رہ کر کتنا سگھڑ ہو گیا ہوں۔ اچھا ہوا تم آ گئیں آج ہم دیسی نیبل رائس بنا رہے ہیں، ساتھ قیمہ شملہ مرچ بھی، تم بھی کھانا کھا کر جانا۔" سعدون نے اسے بڑی فراخ دلی سے دعوت دی۔

"میں نے کوئی کھانا، وانا نہیں ہے اور تم بھی یہ فضول کام چھوڑو، ہم ابھی اسجد کی طرف جا رہے ہیں۔ کتنے دنوں سے فرینڈز اکٹھے مل کر نہیں بیٹھے۔ ارم اور فرقان سے بھی رابطہ کرتی ہوں سب مل کر باہر ڈنر کریں گے۔"

وہ کچن میں روشانے کی موجودگی کو قطعی فراموش کرتے ہوئے، دھونس بھرے انداز میں سعدون سے مخاطب تھی۔ آج روشانے جی ہی جی میں بالکل نہ کلس رہی تھی۔ مطمئن مسکراہٹ چہرے پر سجائے وہ خاموشی سے اپنے کام میں مصروف تھی۔

"ارے چھوڑو یار! میرا اس وقت گھر سے نکلنا تو دور کی بات اس کچن سے نکلنے کا بھی موڈ نہیں، چھٹی کا ایک ہی تو دن ہوتا ہے ہم میاں بیوی کے پاس اور ہم ہی کیا اسجد فرقان اب سب ہی فیملی والے ہیں۔ فارغ وقت ہر کوئی اپنی فیملی کے ساتھ ہی گزارنا چاہتا ہے۔ سال چھ مہینے میں فرینڈز کی گیٹ ٹوگیدر کی اور بات ہے لیکن ہمیں ہر ویک اینڈ پر تو اپنے فرینڈز کو ڈسٹرب کرنا یا دندناتے ہوئے ان کی پرائیویسی میں مداخلت کرنا زیب نہیں دیتا ناں۔"

وہ بہت سلیقے سجاؤ سے اسے کچھ سمجھانا چاہ رہا تھا اور عنبر اتنی تو کند ذہن نہ تھی جو بین السطور مفہوم نہ

www.pklibrary.com

سمجھ پاتی۔

"تم دنیا کے آخری بندے تھے جس سے میں ایسی زن مریدی کی توقع نہیں رکھتی تھی۔ لگے رہو اپنی بیوی کے ساتھ سبزیاں کٹوانے میں میں چلتی ہوں۔"

سعدون اس کی بات سن کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"سو فی صد سچ کہا تم نے۔ میں تو سرٹیفائیڈ زن مرید ہوں۔ ارے میں نے تو اپنی شادی کی اگلی صبح ہی اپنی بیگم کے لیے ناشتہ بنایا تھا مجھے لگتا ہے کہ یہ شادی کے وقت ہی اپنے پرس میں کوئی دم کی ہوئی پڑیا وغیرہ لے کر آئی تھی۔ جانے کیا گھول کر پلا دیا ہے میری مسز نے کہ مجھے اس کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔"

وہ روشانے کو والہانہ نگاہوں سے تکتے ہوئے بولا۔ اب عنبر میں مزید سننے کی تاب نہ تھی۔ دونوں کو قہر بار نگاہوں سے گھورتی ہوئی بنا الوداعی کلمات ادا کیے وہ واپسی کے لیے مڑی۔

"نگہت خالہ سے کہوں گا، تمہارے ڈیڈ سے بات کریں اب تمہاری منگنی کو مزید طول مت دیں سب فرینڈز میں تم ہی سنگل بچی ہو اسی لیے بور ہو کر ادھر ادھر جاتی رہتی ہو، اب خالہ کو تمہارے ہاتھ پیلے کر دینے چاہئیں۔" سعدون نے اس کے جاتے جاتے بھی پیچھے سے ہانک لگائی تھی۔ وہ بنا مڑے تن فن کرتی چلی گئی۔ سعدون مسکرایا۔ نگہت خالہ کی مجبوری نہ ہوتی تو وہ کسی اور طریقے سے اس کا دماغ ٹھکانے لگاتا۔ فی الحال اس خود پسند لڑکی کے لیے اتنا سبق ہی کافی تھا۔

"خس کم جہاں پاک، میں نے ڈرائنگ روم میں بٹھانے کی اتنی کوشش کی مگر عنبر بی بی تو دندناتی ہوئی کچن میں ہی گھس گئیں۔" عذرا نے باہر سے ہی با آواز بلند تبصرہ کیا تھا۔

"کیا کمال کا فقرہ بولتی ہیں عذرا بی بی! ویسے روشانے ایک بات بتاؤں تم پہلی بار دندناتے ہوئے میرے دل میں کب گھسی تھیں؟"

سعدون نے اس کی جانب جھک کر سرگوشی کی، روشانے نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

شوہر سے محبت کی حکایتیں ہر گھڑی ہر پل سنتی تھی اب جانے موصوف کیا انکشاف فرمانے لگے تھے۔

"تمہیں پتا ہے میں عنبر کی انٹلکچوئل پرسنلٹی سے بہت متاثر تھا ملکی اور غیر ملکی ادب پر پورا عبور حاصل تھا اسے۔" سعدون بتانے لگا۔

روشانے کے منہ کا ذائقہ خراب ہوا۔ اظہار محبت کے بیچ اب عنبر کہاں سے ٹپک پڑی تھی۔ اس کا تو تذکرہ تک ان دونوں کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل چکا تھا۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں نگہت خالہ کے گھر گیا تو عنبر اپنے برسوں پرانے بوڑھے مالی پر بری طرح برس رہی تھی اور اگلے دن کی بات ہے یہ اپنی عذرا بی بی کی کوئی رگ وغیرہ چڑھ گئی تو تم اس کے قدموں میں بیٹھ کر اس کی ٹانگ اپنی گود میں رکھ کر زیتون کے تیل کی مالش کر رہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ تم خود ادب کی رسیا ہو لیکن اس دن مجھے ادراک ہوا کہ علم اور ادب جب تک آپ کے اخلاق کو نہ سنواریں تو چاہے آپ ملکی اور غیر ملکی ادب پر بھرپور عبور بھی حاصل کر لیں۔ سب بے فائدہ ہے۔ بس اسی دن تم نے میرے دل میں گھس کر پہلی گھنٹی بجائی تھی۔" وہ اعتراف کر رہا تھا۔

"توبہ ہے سعدون! آپ کہاں کی بات کہاں جوڑتے ہیں، میں تو یہ اظہار محبت کسی کو سنا بھی نہیں سکتی۔ آپ اظہار محبت کے بیچ عذرا کی ٹانگ ہی لے آئے ہیں۔" روشانے کا چہرا کھل اٹھا۔

"ہاں تو کیا میں اظہار محبت اس لیے کرتا ہوں کہ تم دنیا والوں کو سناؤ، خبردار جو میری باتیں کشف کو یا کسی اور کو بتائیں۔"

سعدون نے اسے وارننگ دی تھی۔ روشانے نے مسکراہٹ چھپانے کی خاطر گردن ہی جھکا لی تھی۔ سعدون نے محبت پاش نگاہ اس پر ڈالی اور خود بھی پورے دل سے مسکرا دیا تھا۔

☆☆

فریحہ اشتیاق

# مذاق

رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ دو دنوں بعد شروع ہونے والا تھا۔ نساء نے تقریباً سارے کام نپٹا لیے تھے تاکہ سکون سے عبادات میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے سکے۔ آج مہینے بھر کا سارا سامان امی کے ساتھ جا کر خرید لائی تھی۔

وہ کچن میں سارا سامان سمیٹ رہی تھی، جب اس کے کانوں میں رفیقہ خالہ کی پاٹ دار آواز پڑی۔ وہ تیزی سے ہاتھ چلانے لگی۔ جانتی تھی کہ رفیقہ خالہ اب چائے پی کر ہی جائیں گی۔ باہر رفیقہ خالہ زور و شور سے امی کے ساتھ باتوں میں مشغول تھیں۔ اس نے چائے کی ٹرے ٹیبل پر رکھی اور انہیں سلام کیا۔

"جیتی رہو بیٹی! ارے حلیمہ بچی اکیلی ہی کھپتی رہتی ہے کاموں میں۔ تم بھی ذرا ہاتھ بٹایا کرو اور وہ تمہاری لاڈلی بہو تو ہر وقت میکے میں ہی پائی جاتی ہے۔ نساء کو تو نوکرانی بنا چھوڑا ہے تم نے۔" حلیمہ نے پہلو بدلا۔

"ارے نہیں خالہ! یہ میرا گھر ہے۔ اور گھر کے کام کرنے سے کوئی نوکر نہیں بن جاتا۔"

نساء کو برا تو لگا مگر اس نے تحمل سے جواب دیا۔ اور خالی ٹرے اٹھائے کچن میں چلی گئی۔ مگر وہ جانتی تھی کہ رفیقہ خالہ اب جہاں بھی جائیں گی۔ ہر گھر میں یہی بات بتائیں گی جیسے اس گھر میں نساء پر ظلم ڈھائے جا رہے ہوں۔ وہ ان کی عادت سے واقف تھی۔

دراصل نساء حلیمہ کی سگی بیٹی نہ تھی۔ نساء کے ابو رحیم ملک صاحب نے حلیمہ سے دوسری شادی کی تھی۔ نساء کی امی نفیسہ اس کی پیدائش کے موقع پر ہی وفات پا گئیں۔ اس لیے نساء کے لیے رحیم ملک نے دوسری شادی کی۔ جن سے ایک بیٹا صارم تھا۔ نساء نے حلیمہ کو ہی ماں کے روپ میں دیکھا تھا اور حلیمہ بھی اسے اپنی سگی بیٹی سمجھتی تھیں۔ مگر لوگ اسی تاک میں رہتے کہ کوئی بات انہیں ملے۔ جسے بنیاد بنا کر وہ یہ ظاہر کر سکیں کہ نساء بے چاری پہ بڑے ظلم ڈھائے جاتے ہیں۔

☆☆☆

آج ساتواں روزہ تھا۔ صارم کی بیوی روزینہ بھی میکے سے لوٹ آئی تھی۔ دونوں مل جل کر جلدی جلدی کام کرتیں اور پھر تلاوت کرتیں۔ نوافل ادا کرتیں۔ دونوں مل کر افطاری کی تیاری کر رہی تھیں کہ ڈور بیل بجی۔ دونوں مصروف رہیں۔ انہیں پتا تھا کہ حلیمہ صحن میں موجود ہیں۔

"بھی! لگتا ہے مہمان آئے ہیں۔" اس نے آوازوں سے اندازہ لگایا۔

"جاؤ دیکھ آؤ۔" روزی نے پالک کاٹتے

ہوئے اسے کہا۔ اس نے باہر جھانکا تو کافی چہرے نظر آئے۔ تب ہی رمشہ ممانی کی نظر اس پہ پڑی۔ انہوں نے میری بچی کہہ کر اسے ساتھ لپٹا لیا اور رونے لگیں۔ وہ گھبرا گئی۔ وہ سب بہت غصے میں تھے۔ دونوں ماموں، ممانیاں اور نانا ابا، حلیمہ سے غصے سے بات کررہے تھے۔

''نساء! اپنے ابو اور بھائی کو فون کر کے جلدی گھر آنے کو کہو۔''

حلیمہ نے پریشانی سے کہا۔ تو وہ جی امی کہتی روزی کے پاس چلی آئی۔ کچن کاؤنٹر پر پڑے سیل سے پہلے کال کی۔ پھر جلدی جلدی افطاری کے انتظامات کرنے لگی۔

☆☆☆

افطاری کا وقت ہونے کو تھا۔ صارم اور رحیم صاحب بھی آچکے تھے۔

''میرا خیال ہے پہلے افطاری کرلی جائے پھر آرام سے بات کرتے ہیں۔''

رحیم صاحب نے بارعب انداز میں کہا۔ سب کے چہرے غصے سے تنے ہوئے تھے۔ نماز مغرب کی ادائیگی کے بعد سب بڑے ڈرائینگ روم میں چلے گئے۔ روزی سب کے لیے چائے بنانے لگی۔

''صارم کیا ہوا؟'' باہر جاتے صارم پہ نساء کی نظر پڑی تو اسے روک لیا۔

''ابھی بہت جلدی میں ہوں بعد میں بتاؤں گا۔''

''کیا ہوا بتاتے جاؤ۔'' اس نے پھر اسے روکا۔

''افوہ رفیقہ خالہ کو بلانے جارہا ہوں۔ ان ہی کا کارنامہ ہے یہ۔ ماموں کے گھر جا کر الٹی سیدھی باتیں بتائی ہیں انہوں نے جیسے کہ ان کی عادت ہے۔ اب وہی آکر بتائیں گی۔ بس ہوگئی تسلی اب جاؤں؟''

''ہاں جاؤ۔'' وہ پلٹ آئی۔ ''کیا فائدہ رفیقہ خالہ کو بلانے کا۔ انہوں نے کون سا مان جانا ہے۔ یا پھر ہنس کر کہہ دیں گی۔ میں تو مذاق کررہی تھی۔'' اس نے سر جھٹکا۔

''ارے بھائی صاحب، میرے تو کلیجے پر ہاتھ پڑا۔ رفیقہ خالہ کی باتیں سن کر ہمیں تو یہی لگا کہ بچی بیچاری برے حالوں میں ہے۔ دلہن ہر وقت میکے میں رہتی ہے اور حلیمہ سارے کام نساء سے کرواتی ہے۔''

ساجدہ ممانی نے آہ بھری۔

رفیقہ خالہ آچکی تھیں۔

''اے بنو! میں تو ایسے ہی مذاق کررہی تھی۔''

رفیقہ خالہ نے بھونڈی سی ہنسی ہنس کر سب کو ہنسانے کی کوشش کی۔

''خالہ! آپ بڑی ہیں۔ ہمارے لیے محترم ہیں برائے مہربانی ایسی باتیں کر کے لوگوں کے گھروں میں لڑائی نہ کروایا کریں۔''

''اے لو میاں میں نے ایسا کیا کہہ دیا۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔'' رفیقہ خالہ غصے سے اٹھ کر روانہ ہوگئیں۔

''اب آپ لوگ بھی یوں کسی کی بھی باتوں میں آکر حلیمہ کو باتیں نہ سنایا کریں۔ حلیمہ نے آج تک ایسی کوئی حرکت نہیں کی جس کی وجہ سے اسے سوتیلی ماں کہا جائے۔ یہ بات آپ سب بھی جانتے ہیں۔ اور رفیقہ خالہ کے مزاج کو بھی آپ سب جانتے ہیں۔ بہرحال کھانا کھا کر جایئے گا۔''

رحیم صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے۔ سب لوگ شرمندہ سے کھانا کھا کر رخصت ہوگئے۔

لوگوں کے لیے کتنا آسان ہوتا ہے لایعنی باتیں کر کے جھوٹ بول کر لڑائیاں کروانا۔ بعد میں ہنس کر کہہ دیا۔ میں نے تو مذاق میں بول دیا تھا۔

''رمضان میں شیطان تو بند ہوتے ہیں نا روزی بھابھی۔ پھر رفیقہ خالہ جیسے لوگ ایسی حرکتیں شیطان کی مدد کے بغیر ہی سرانجام دے لیتے ہیں؟ شیطان تو ویسے ہی بدنام ہے۔ جبکہ ایسے کاموں میں تو ہم انسان ماشاء اللہ خود کفیل ہیں۔''

''نہیں نساء! سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اور بعض لوگوں کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے۔ تم چھوڑو ان باتوں کو آؤ۔ عشاء کی نماز پڑھیں اور دعا کریں کہ ہم اس قسم کے مذاق سے محفوظ رہیں اور رفیقہ خالہ جیسے لوگوں کو اللہ ہدایت دے۔''

☆☆

www.pklibrary.com


ماہنامہ کرن

## مارچ 2024ء سالگرہ نمبر کے شمارے کی ایک جھلک

- "خواتین کے عالمی دن اور ماہنامہ کرن سالگرہ کے حوالے سے شاہین رشید کا سروے،
- اداکار، "حمزہ خان" کہتے ہیں میری بھی سنیے،
- "تاش گھر" ایمل رضا کا سلسلہ وار ناول،
- "دامن سحاب" مہوش افتخار کے ناول کی آخری قسط،
- "مجھے تاوان کیا دو گے؟" نگہت سیما کا مکمل ناول،
- "ایک شام دو اجنبی" آسیہ رئیس کا مکمل ناول،
- "سپاس گزار" میمونہ صدف کا ناولٹ،
- "زینتِ خدا" ام اقصیٰ کا ناولٹ،
- نفیسہ سعید، نظیر فاطمہ، مریم شہزاد، نازنین فردوس کے افسانے اور مستقل سلسلے،

---

- **"کرن کتاب"**

"رمضان اسپیشل"

مارچ 2024ء کا شمارہ شائع ہوگیا


pklibrary.com

www.paksociety.com

سنعیہ عمیر

# دو دھاری تلوار

ناولٹ

نیلم ظہیر اور بختیار کاشف کے گھر والے، جب پہلی بار کسی رشتے کروانے والی کے توسط سے ملے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ الفاظ اور متضاد آمنے سامنے بٹھا دیے ہوں۔ یا ں دو تہذیبوں کا تصادم ہو رہا ہو۔

نیلم کی فیملی معاشی طور پر خوش حال تھی، ان کے رہن سہن میں جدت تھی۔ خاندان میں لڑکیوں کی تعلیم پر بے حد توجہ دی جاتی تھی اور لڑکے تعلیم سمیت کسی بھی ذمہ داری میں کوتاہی کریں، یہ تو برداشت ہی نہیں ہوتا تھا۔ سب سے بڑھ کر وہاں محبت اور اخلاص رچی بسی تھی۔ محبتوں کا حصار پھیلائے رکھنا تو وہاں سانس لینے سے بھی زیادہ عام تھا۔ بختیار کا خاندان اتنا کھاتا پیتا نہیں تھا۔ تعلیم کو بھی واجبی سی اہمیت دی جاتی تھی۔

ان کا رہن سہن مذہبی اور روایتی تھا۔ وہ سینہ ٹھونک کر آئے تھے کیونکہ بختیار ان کا ہونہار بچہ تھا۔ مگر لڑکی کے آنے سے پہلے ہی ان کے حوصلے ڈگمگا گئے تھے۔ بڑے گھر والے ان کو کیوں رشتہ دینے لگے پھر لڑکی آئی خوب صورت، خود اعتماد، مہنگے کپڑا جوتی تو سب پہن لیتے ہیں۔ نیلم کو کپڑے پہننے کا انداز آتا تھا۔ اس کی ہر چیز پرفیکٹ ہوتی تھی مگر اس سے زیادہ اس کی پرسنالٹی بولتی تھی۔

گفتگو موسم کے حال سے شروع ہوئی۔ پھر کاروباری مصروفیت تک آئی۔ پھر بیچ کی کڑی وکالت بنی۔ بختیار وکیل تھا۔ جبکہ نیلم کا تو پورا خاندان اس ہی شعبے سے منسلک تھا۔ اس کے والد تینوں بھائی، چچا اور خود نیلم بھی وکیل تھی۔ جب بیچ کی کڑی ان کے ہاتھ لگی تو نیلم کے گھر کی محبت کی فضا نے بھی اپنا جادو چلانا شروع کر دیا۔ بختیار کے خاندان کو تو نیلم کا گھرانہ ان کی ملن ساری اور خوش مزاجی بہت پسند آئی۔ نیلم کے گھر والوں کو بھی وہ لوگ اچھے لگے۔

''امی میں برقعہ نہیں پہنوں گی۔'' مہمانوں کے جانے کے بعد نیلم نے دوٹوک کہہ دیا۔

''تمہارے ابا نے ان کو بتا دیا ہے کہ ہماری بیٹیوں کو عادت نہیں ہے۔ وہ سمجھ گئے ہیں۔'' امی ٹرالی کا سامان پلاسٹک کے ڈبوں میں ڈال رہی تھیں۔

''ابھی مان جائیں گے یہ نہ ہو بعد میں مجھے طعنے دیں۔'' نئے گھر میں جانے کے خیال سے ہی دل ڈرا ہوا تھا۔

''تم بھی ابھی یہ سب کہہ رہی ہو۔ مگر دیکھنا، جلد ہی ان کے رنگ میں رنگ جاؤ گی یا ان کو اپنے رنگ میں رنگ لو گی۔'' امی کو اعتماد تھا۔

اور شاید غلط بھی نہیں تھا۔ دونوں گھر والوں کی چند بار ملاقات ہوئی پھر بات پکی کر دی گئی۔ پھر مزید ملنا ملانا ہوا۔ ہر طرح سے پوری تسلی کر کے نیلم زوجہ بختیار کاشف بن گئی۔

☆☆☆

ہوٹل میں ڈنر بوفے ویسا ہی تھا جیسے روز ہوتا تھا۔

آج مہمانوں میں بختیار کے رشتہ داروں کی تعداد اتنی زیادہ تھی۔ گمان ہوتا تھا ان کے علاوہ ریسٹورنٹ میں کوئی ہے ہی نہیں۔ انگلینڈ والے چچا بہت عرصے بعد بمعہ اہل وعیال آئے تھے۔ اس خوشی میں لوکل رشتہ دار بار بار اکٹھے ہو رہے تھے۔ یہ کھانا بختیار اور اس کی فیملی نے دیا تھا۔ بختیار اور نیلم ریسٹورنٹس اور گھومنے پھرنے والی جگہوں کی ڈکشنری

تصور کیے جاتے تھے۔ ہر کوئی ان سے پوچھتا تھا کہ کہاں کھانا اچھا ملتا ہے۔ کس جگہ کی کون سی ڈش اچھی ہے۔ آج کی دعوت بھی ان کے ہی مشورے سے ہوئی تھی۔ نیلم نے سرخ رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ تہ شدہ دوپٹہ بائیں کندھے پر ڈالا اور بالوں کو سمیٹ کر ایک بینڈ میں قید کرلیا۔ کھانے کی پلیٹ لیے وہ گفتگو میں مصروف تھی جب دور کھڑے بختیار کی خود پر اٹھی نگاہ دیکھی۔

"تمہارے بھائی، بھابھی سب ٹھیک ہیں؟" چچی جان نے نیلم سے پوچھا۔

نیلم دور کھڑے بختیار کی سمت دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس نے سنا ہی نہیں۔

"جی، اس کے گھر میں سب ٹھیک ہیں۔ اس کی امی کا صبح ہی فون آیا تھا کہہ رہی تھیں، چکر لگائیں آپ

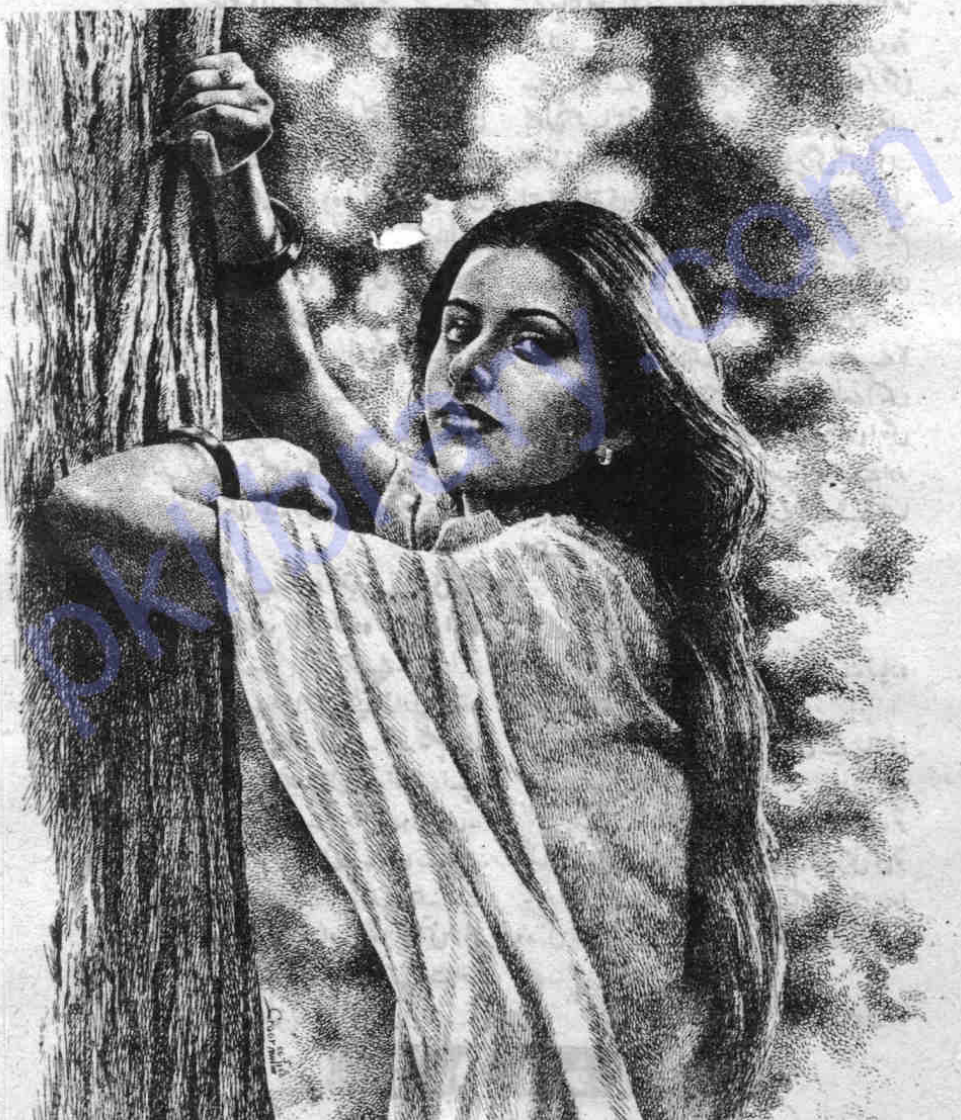

www.pklibrary.com

دیکھ لیجیے گا۔ کل بازار جانے سے پہلے ہو آئیں گے۔" اس کی جگہ اس کی ساس نے جواب دیا۔

اتنے میں بختیار خود ہی ان کے پاس آ گیا۔ اس کی پلیٹ میں شیشے کا چھوٹا گلاس تھا جس میں تہ دار میٹھا تھا۔ اب تک سارے ہی نیلم اور بختیار کی نگاہوں کے تبادلے کو دیکھ چکے تھے۔ بختیار نے آ کر میٹھے کا گلاس اپنی پلیٹ سے نیلم کی پلیٹ میں منتقل کیا۔

"شکریہ جانو جی! یہ تو میرا فیورٹ ہے۔" نیلم نے خوشی سے کہتے ہی ایک چمچہ چکھا۔ سارے بزرگ پہلو بدل کر رہ گئے۔

نیلم کھلے عام اپنے شوہر کو جانو کہتی تھی اور وہ بھی سب کے سامنے اسے جان جی کہہ کر آواز دیتا تھا۔ انہیں ذرا شرمندگی نہیں تھی۔ وہ اپنی محبت کا جشن کرتے تھے۔ کوئی پوچھتا تو نیلم کہتی میرا حق حلال کا شوہر ہے اس سے محبت نہیں کروں گی تو کس سے کروں گی۔ پورے خاندان کے لیے یہ سب سترہ سال پرانا ہو گیا تھا۔ لیکن یو کے والی چچی کا منہ کھلا رہ گیا۔ اس کے سسر خود ہی ہنس پڑے۔

"ان دونوں کی اتنی ہم آہنگی ہے کہ بیچ میں سے ہوا بھی نہیں گزرتی۔ آنکھوں کا اشارہ سمجھ لیتے ہیں۔" ان کی وضاحت میں ایک دبی ہوئی خار تھی جو کسی کو محسوس نہیں ہوئی۔

باقی بھی مسکرا دیے۔ نیلم اور بختیار نے شادی کے سترہ سالوں میں ثابت کیا تھا کہ وہ بنے ہی ایک دوسرے کے لیے ہیں۔ نیلم نے کم خرچ میں، روایتی ماحول میں خوشی سے زندگی اس لیے گزاری کیونکہ بختیار نے بہت محبت نچھاور کی تھی۔ جبکہ نیلم کے احسانوں کا بھی شمار نہیں تھا۔ اس نے نندیں اپنے زیور، اپنے جہیز کا سامان دے کر رخصت کی تھیں۔ اس کا سادہ سا نظریہ تھا کہ چیزیں انسانوں کے لیے ہوتی ہیں۔ انسان چیزوں کے لیے نہیں ہوتا۔ اپنے گھر سے وہ محبت سیکھ کر آئی تھی اور ساتھ بھی اتنی لائی تھی کہ سترہ سال لٹانے کے بعد بھی اس محبت اور خلوص میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

"صرف اپنی بیگم کے لیے لائے ہو؟ ہمیں بھی میٹھا پسند ہے۔" آپا نے کمر کسی۔

"آپ تو گھی والے حلوے اور شیرے والی مٹھائی بھی کھا لیں گی میری ایل ایل بی بیگم ہے۔ صرف انگریزی میٹھے کھاتی ہے۔" بختیار نے ہنس کر کہا۔

وہ اکثر ہی ان کے طبقاتی فرق کا مذاق میں ذکر کر جاتا تھا۔ اس کے ذکر سے ہر بار نیلم کو یاد آتا تھا کہ ان کے بیچ ایک طبقاتی فرق بھی کبھی تھا۔ ورنہ وہ تو یہ سب بھولے بیٹھی تھی۔ مگر بختیار یہ سب چاہ کر بھی بھول نہیں پاتا تھا۔ خود سے بڑے گھر کی بیوی لایا تھا۔ جو خاندان بھر کی عورتوں سے زیادہ پڑھی لکھی تھی۔ احساس کمتری کی ایک چنگاری اس کے دل میں دبی تھی۔ جو ایسے ہی بات بے بات شعلہ پکڑتی تھی مگر نیلم کو یقین تھا، یہ سب بھی بہت جلد دور ہو جائے گا۔ ان کا پہلا بچہ پیدا ہوا اور فوت ہو گیا۔ یہ حادثہ ان کو اور قریب لے آیا تھا۔ انہیں لگا تھا وہ ایک دوسرے کا بہترین اور بدترین دیکھ چکے ہیں۔ پھر اللہ نے انہیں دو بیٹے ایک بیٹی اور دیے۔ بختیار کی پریکٹس اچھی جا رہی تھی پیسا آ کر ٹھہر رہا تھا۔ سب اچھا رہے اور زندگی ایسے ہی فیری ٹیل کی طرح گزر جائے ایسا ہوتا ہے؟

نہیں نا یہاں بھی وقت بدل گیا۔

☆☆☆

"آپ کو بریسٹ کینسر ہے۔" ڈاکٹر نے زیادہ تمہید نہیں باندھی۔

نیلم کے حوصلے چٹان تھے تو زندگی نے پہاڑ سی مشکلات سامنے لا کھڑی کیں۔

جب بچے اپنے کام خود کرنے لگتے ہیں تو لگتا ہے بچے بڑے ہو گئے۔ اب جب یہ خبر سنی تھی تو نیلم کو لگا تھا موت کا فرمان سن لیا ہو۔ نیلم کو احساس ہوا وہ کتنی غلط تھی۔ اس کے بچے تو ابھی بہت چھوٹے تھے۔

"عزیز تو ابھی ساتویں میں ہے۔ میں سوتی رہ

جاؤں تو یہ اسکولوں کے لیے بھی نہیں اٹھتے۔" بڑے بیٹے کو یاد کر کے وہ بستر میں بیٹھی کانپ رہی تھی۔

"ڈاکٹرز مایوس نہیں ہیں تم بھی حوصلہ کرو۔ ہم سب تمہارے بغیر ادھورے ہیں۔" بختیار نے اسے مضبوطی سے تھام لیا۔ وہ اس کے سینے سے لگی روتی رہی۔

پھر آنسو بہا کر اس نے ہمت باندھی۔ پہاڑوں سی مشکلات سے نبرد آزما ہونے کے لیے اس نے آسمانوں جتنی ہمت کر لی۔ نیلم کا آپریشن ہوا۔ وہ ایک عضو جو کینسر زدہ تھا نکال دیا گیا۔ پھر کیموتھراپی پھر ریڈی ایشن وقت گزرنا بھول گیا تھا اس کو سورج کے چڑھنے سے ڈر لگنے لگا تھا نا جانے آج کی صبح کون سی نئی آزمائش لے آئے۔ اس کے میکے والوں کا پیار اور بختیار کا ساتھ تھا تو یہ سفر بھی کٹ گیا۔ وہ کینسر فری ہو کر سرخرو ہو کر نکلی۔ وہ پہلے سے مضبوط شخصیت بن کر ابھری، اس کے کچھ عرصے بعد ہی نیلم کے آسمانوں سے بلند حوصلے سے ٹکرانے کے لیے زندگی نے سمندروں سے گہری آزمائش بھیج دی تھی۔

☆☆☆

میں "لا" گریجویٹ ہوں۔ بچے آدھا دن اسکول میں گزارتے ہیں۔ مجھے زندگی کی قدر ہو گئی ہے۔ میں اسے کارآمد بنانا چاہتی ہوں۔" اس نے بہت دھیمے لہجے میں بختیار سے کہا۔

"ہمارے خاندان میں کوئی عورت جاب نہیں کرتی۔ بڑے گھر کی ہونے کا کیا فائدہ، گھر پر ٹکنے کا شوق ہی نہیں ہے تمہیں۔"

وہ موت کے منہ سے پلٹ کر آ گئی تھی مگر طبقاتی فرق کی چنگاری اب تک بجھی نہیں تھی۔ بختیار کا رویہ اب بدلنے لگا تھا۔ لوگ نیلم کو چلتے پھرتے سناتے تھے کہ شوہر تو ایسی بیویوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ بختیار کی بلائیں لیتے تھے ایک نسوانی عضو سے محروم عورت کے ساتھ گزارا کر رہا ہے۔ جب کہ ان کے رشتے میں کوئی خرابی نہیں تھی۔ وہ بستر سے نہیں لگی تھی۔ پہلے سے زیادہ پھرتیلی ہو گئی تھی۔

"پچاس فیصد آبادی کو تعلیم کا موقع نہیں ملتا اور آپ چاہتے ہیں، میں پڑھ لکھ کر اس نعمت سے کوئی فائدہ نہ لوں۔" اس نے روٹھ کر کہا۔

بختیار بھی طعنہ دے کر نرم پڑ چکا تھا۔

"ہمارا گھر مکمل ہونے دو۔ وہاں شفٹ ہو جائیں پھر قریب کے کسی اسکول میں نوکری ڈھونڈ لینا۔" اتنے سال اس نے مانی تھی۔ اب اپنی منوانا چاہتی تھی تو کوئی حرج نہیں تھا۔

"باقی دن بھی بچے ہی دیکھنے ہیں۔ صبح بھی بچوں کی ذمہ داری لے لوں نہیں، میں ایسا نہیں چاہتی۔" نیلم نے دل ٹٹولا۔

"تم کچہری کے خراب مت دیکھو۔ میں تمہیں اس ماحول میں نہیں بھیجنا چاہتا۔" بختیار نے اس بار محبت کی زبان بولی۔ عورت محبت کی زبان پر نہ پگھلے ایسا کبھی ہوتا ہی نہیں۔

نیلم نے ارادہ نہیں چھوڑا اور زندگی سے اپنے حصے کی اینٹیں ٹٹولنے لگی۔

☆☆☆

"تمہاری درگزر کرنے کی عادت خطرناک حد تک بڑھی ہوئی ہے۔" فائزہ نے اسے یاد کروایا۔

"یہ زندگی نفرتیں پالنے کے لیے بہت چھوٹی ہے۔ اس کی باتوں کی پروا کرنے لگ جاؤں گی تو ہنسنا بھول جاؤں گی۔" نیلم مہارت سے میک اپ برش چلا رہی تھی۔

فائزہ کرسی سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے بیٹھی تھی مگر اس کی زبان بلاتکان چل رہی تھی۔

"ہنسنا یاد رکھو، خدشتیں کرنا ذہن سے نکال دو۔ مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے کہ تم اپنے لیے کچھ کر رہی ہو۔" فائزہ نے کہا۔

فائزہ اور نیلم وہ سہیلیاں جو اسکول سے اب تک ساتھ چل رہی تھیں۔

"چلو، آنکھیں کھولو اور دیکھو۔" نیلم نے ہائی لائٹر لگا کر اس کی لک مکمل کی۔

"واؤ یہ میں ہی ہوں؟ تمہارے اندر کی یہ فیری

گاڈ مدر کہاں کی اب تک؟" خود کو سنڈریلا محسوس کرتی فائزہ نے اپنا سراپا آئینہ میں دیکھا۔

"یعنی وکالت نہ کر کے بیوٹیشن بننے کا فیصلہ درست تھا۔" نیلم نے شکر گزاری سے کہا۔

"بالکل صحیح تھا اب بس جلدی سے پارلر کھول لو۔ عورتوں کے ساتھ ساتھ مردوں کی دعا بھی لگے گی۔ لیکن حاتم طائی بن کر اپنی کمائی دوسروں پر مت لٹا دینا۔ اتنے سال تم نے حالات کے مطابق گزارا کیا ہے۔ اب وقت ہے حالات کا دھارا اپنی سمت موڑ لو۔ باکہ جو تمہارا گھر بن رہا ہے۔ اس میں تمہاری ساری بچت، تمہارا زیور لگا ہے۔ تمہارے ابو نے بھی رقم دی۔ آدھا گھر اپنے نام کرواؤ۔" فائزہ نے سمجھایا۔

"بختیار میرا ہے۔ اس کی ہر چیز میری ہے۔ مجھے یہ سب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ گھر چاہے جس کے نام ہو میرا ہی گھر ہوگا۔" نیلم نے اس کی بات رد کی۔

"تم نہیں سدھرو گی۔" فائزہ نے افسردگی سے کہا۔ پھر دونوں ہنس دیں۔

نیلم کو بہت ڈھارس محسوس ہوئی۔ اس نے پروفیشنل بیوٹیشن کا کورس مکمل کر لیا تھا۔ اب وہ زندگی میں آگے بڑھنے لگی تھی۔

☆☆☆

بختیار نے پانچ مرلے کا گھر بنا لیا۔ وہ لوگ خوشی خوشی وہاں شفٹ ہو گئے۔ ساس سسر ان کے شفٹ ہونے کے بعد پہلی بار گھر دیکھنے آئے اور اور بہت فخر سے آئے۔ آخر کو بیٹے نے اپنا گھر بنایا تھا۔ مٹھائی، بچوں کے کپڑے، گھر کے لیے گلدان بھی ہمراہ تھا۔ مگر عیش کرتی بہو کسی کو اچھی نہیں لگتی۔ بیٹے کا گھر بن جائے تو خوشی ہوتی ہے۔ اس گھر کا نظام بہو کے ہاتھ دیکھ کر دل جلتا ہے۔ اس کے ساس سسر کا بھی یہی معاملہ تھا۔ گیٹ پر ہی بیٹے کو زوردار طریقے سے گلے لگا لیا۔ پھر جب کچن سے نکلتی بہو دیکھی تو منہ میں کچھ کڑواہٹ بھر گئی۔

"میں نے کہا تھا، مرچیں وارے بنا نظر نہ لگ جائے۔ ہم نے تو یہی سنا ہے کہ نیا گھر لو تو انسان لوگوں کی نظروں میں آجاتا ہے۔ مگر بختیار کہنے لگا، آپ کی بہو ان باتوں کو نہیں مانتی۔ چلو اب تو یہ بہو کا گھر ہے۔ اس کی مرضی سے چلے گا۔" سسر نے بظاہر ہنستے ہوئے کہا۔ ساتھ نیلم کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار بھی دیا۔

"میرے بچے کا اب اچھے سے خیال رکھنا۔ یہ نہ ہو پھیکے ڈائٹ کھانے کھلاتی رہو۔" ساس نے کہا وہ بھول گئی تھیں کہ سالوں سے وہی تو اس کا خیال رکھتی آئی تھی۔ باقی تمام ملاقات بہت خوش اسلوبی سے گزری اور نیلم کی ضرورت سے زیادہ درگزر کرنے کی عادت یہاں بھی بازی لے گئی۔

☆☆☆

"جانو جی میں سوچ رہی تھی کہ بچے ابھی نظر کے سامنے ہی رہیں تو اچھا ہے۔ میرے سامنے رہیں گے تو خبر بھی رہے گی کہ کتنا پڑھا، کتنا کھیلا۔" وہ دھوبی کے کپڑے الگ نکال رہی تھی۔

"بات تو صحیح ہے۔" بختیار نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"پھر اوپر کے پورشن میں پارلر کھول لیتی ہوں۔ ایک تیر اور دو شکار ہو جائیں گے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"ہرگز نہیں یہ میرا گھر ہے۔ اس کو بزنس کا اڈا نہ بناؤ۔" بختیار نے دھیمے لہجے میں ہی سہی مگر صاف انکار کر دیا۔

"سوچیں تو سہی کتنی سہولت ہو جائے گی۔ ہانڈی چڑھا کر پارلر کا چکر لگا آؤں گی۔ کرایہ بھی بچے گا تو منافع ہی منافع۔" اس نے ایک اور دلیل دی۔

"بھانت بھانت کے لوگ آئیں گے۔ مجھے اپنے گھر میں شراکت قبول نہیں۔" بختیار نے دوٹوک کہہ دیا۔ پھر نیلم کی کوئی دلیل کام نہ آئی۔ اس نے بھی زیادہ بحث نہیں کی۔

☆☆☆

بختیار کو اس کے ابا جی کا فون آیا تھا۔ اس فون میں ایسی تھرتھراہٹ تھی وہ سب کام کاج چھوڑ کر دوڑا ہوا اپنے والدین کے گھر پہنچا تھا۔ اس کی ماں جو اس وقت دھوپ میں بیٹھی سنگترے کھانے کی عادی تھی۔ کمرے میں چھپی بیٹھی تھی۔ چھوٹے بھائی انوار کے کمرے سے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ بختیار کو ماں باپ نے کمرے میں بلا کر کنڈی چڑھالی۔

''تمہارا بھائی جہاں اسکول میں نوکری کرتا ہے وہاں یہ بھی ساتھ پڑھاتی ہے۔ خود ہی پسند کی کسی کو بھنک تک نہ پڑنے دی۔'' ابا جی نے دنیا کو جواب دینے تھے۔ اس لیے پریشان تھے۔

''میں نے اور نیلم نے دیکھا تھا ایک دفعہ، اس کے ساتھ گھوم رہا تھا لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ شادی ہی کرلے گا۔'' بختیار نے پیشانی رگڑی۔

''ابھی شادی کر کے اپنے دوست کے گھر رکھا ہے۔ فضیلت نے اپنی ماں اور بھائی کو بلالیا ہے۔ تم ادھر ہی رکو، ان کو سمجھانا۔'' ابا جی نے بلانے کا مقصد بتایا۔

''نو سال ہو گئے ہیں۔ فضیلت نے اولاد نرینہ نہیں دی۔ تو آخر انوار نے یہی کرنا تھا۔'' امی جی نے اپنے بیٹے کی سائیڈ لی۔

''دو چھوٹی بچیاں ہیں اس کی، کم از کم مجھے تو شریک کرلیتا۔'' بختیار کو دکھ ہوا تھا۔

''بچیوں کو باپ پالے گا۔ اپنے فرائض سے کب انکار کر رہا ہے۔'' امی نے پھر کہا۔

''آپس میں کیوں بحث کر رہے ہو۔ یہ دلائل فضیلت کے خاندان کے لیے بچا رکھو۔'' ابا جی نے کہا۔

☆☆☆

''معلوم ہے مجھے ہیپاٹائٹس ہو گیا ہے۔ روز دوائیاں کھاتی ہوں۔ بچے پیدا کر کے وزن بھی بڑھ گیا ہے۔ لیکن اگر انوار بیمار ہو جاتا یا اس کو کوئی حادثہ پیش آجاتا تو میں بھی اس کو چھوڑ دیتی؟ عورت تو نہیں چھوڑتی نہ دوسرا مرد کرتی ہے۔ مرد کیوں بہانے ڈھونڈتا ہے؟'' فضیلت کمرے میں بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔

اس کے گھر والے ہو کر جا چکے تھے۔ انوار نے اس کی بیماری کو بہانا بنایا تھا۔ اب وہ نیلم کے سامنے دل کھولے بیٹھی تھی۔

''اسے کوئی اور پسند آگئی تھی، اس نے کرنی ہی تھی تمہاری بیماری تو بہانا تھا۔ اب کیا سوچا ہے؟'' نیلم نے پوچھا۔

''ابو ہیں نہیں۔ بھائی اور بوڑھی ماں پر بوجھ بنوں؟ اور ان بچوں کا کیا؟'' وہ بہت دکھی تھی۔ شوہر کو ایک لمحہ لگا تھا اس کو بے کار چیز ثابت کرنے میں۔

''بس دعا کرو، مجھے برداشت مل جائے۔ خود پر اعتماد تو میں نے کھو دیا ہے۔'' فضیلت اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ایک ماں آخر کتنا سوگ منا سکتی تھی۔ بچیوں کے کھانے کا ٹائم تھا۔

☆☆☆

نیلم نے پارلر کے لیے جگہ ڈھونڈ لی تھی۔ اب سامان کے لیے کچھ جمع جوڑ کر رہی تھی۔ انوار اور فضیلت بھی ڈگر پر چل پڑے تھے۔ انوار کی اب بھی سب سے بڑی مددگار اس کی پہلی بیوی فضیلت ہی تھی۔ دوسری بیوی جویریہ کا خاندان کے فنکشنوں میں آنا جانا شروع ہو چکا تھا۔ عید کے دن سب جمع تھے۔ فضیلت کے ہاتھ کے بنے کھانے، اس کی بچیاں، اس کی ہمت نیلم کی توجہ کا مرکز تھی۔ تو بختیار انوار کو دیکھ رہا تھا انوار نے وزن کم کیا تھا۔ بالوں کا نیا کٹ کروالیا تھا وہ اپنی عمر سے دس سال کم لگ رہا تھا۔ ارمانوں کی سرخی سے اس کے گال لال تھے۔ سب کی نظر بچا کر جویریہ نے اس کے منہ میں حلیم کا چمچہ ڈالا تھا۔ کسی نے نہیں دیکھا مگر بختیار کی نگاہوں سے یہ منظر بچ نہ سکا۔ وہ منظر آنکھ کی کیل کی طرح اس کی نگاہوں میں بس گیا۔ بیوی سے محبت کرنا ضروری ہے مگر یہ کہاں لکھا ہے کہ ایک ہی بیوی سے محبت کی جائے۔ دنیا تو رنگینیوں سے بھری ہوئی ہے۔ ہر ڈال پر تتلی تھی اور دلوں میں ارمان۔

یاد ہے، اچھی بھلی زندگی کو دو دھاری تلوار کیا بناتا ہے؟ ان چاہی شراکت داری۔

☆☆☆

"میں نے فیصلہ کرلیا ہے میں دوسری شادی کررہا ہوں۔"

بختیار نے پہلے بھی اس کو یہ کہا تھا۔ مگر آج اس کے انداز میں بلا کی سنجیدگی تھی۔ اس کا یہ کرتب بہت دن سے چل رہا تھا۔ نیلم نے ہر طرح سے بحث کرکے پیار سے، بچوں کا واسطہ دے کر سمجھا کر، روٹھ کر بھی دیکھ لیا تھا۔ اب بختیار نے ایسی ضد باندھ لی تھی کہ کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔

"میں اپنا جواب بتا چکی ہوں۔ میں نہیں چاہتی تم دوسری عورت لاؤ، اگر تم دوسری شادی کرو گے تو یاد رکھنا کہ ہمارے بیچ پھر کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ دوسری شادی تمہارا حق ہے تو یہ میرا فیصلہ ہے۔" نیلم اس سے کئی گنا زیادہ سنجیدہ تھی۔

"تم مجھے چھوڑ دو گی؟" وہ بگڑا۔

"نہیں یہ کام تم کررہے ہو۔" اس کا دل درد سے پھٹ رہا تھا۔

وہ دلیلیں جو وہ دنیا کو سناتا تھا۔ نیلم کے سامنے نہیں چل سکتی تھیں۔ وہ دونوں ہی جانتے تھے وہ کتنی بوگس ہیں۔ نیلم کے سامنے ناراض ہونے بھوکا رہنے کے ڈرامے کام کرتے تھے اور وہی کرکے اس نے نیلم سے اجازت لی تھی۔ وہ شیو بڑھا کر مجنوں کی طرح پھرتا تھا۔ سیدھے منہ بات کرنا چھوڑ گیا تھا۔ بھوک ہڑتال کردی تھی۔ نیلم کیسے اجازت نہ دیتی۔

"میں تو کسی کھلاڑی کی تعریف بھی کردوں تو تم خفا ہوجاتے تھے۔ مرد کا تو اتنا بھی ظرف نہیں کہ زبانی تعریف ہی سن لے۔ اور وہی مرد عورتوں سے توقع کرتا ہے کہ دوسری عورت کے لیے دل بڑا کرلے۔ اس کو شریک ٹھہرالے؟ کس چیز کی کمی ہے ہماری زندگی میں؟" اس نے تڑپ کر پوچھا۔

"اتنی کمیاں ہیں میرا ذہن شمار کرنا بھول گیا ہے۔" بختیار نے کہا۔

"کیا گارنٹی ہے کہ دوسری شادی سے وہ کمیاں دور ہوجائیں گی۔ مان لو کہ یہ تمہاری ضرورت نہیں زبان کا چسکا ہے۔ جرثی آئے گی۔ تمہیں تمہاری اپنی اولاد سے دور کردے گی۔ ان کا ہی سوچ لو۔" نیلم نے آخری لمحے تک لڑنے کی ٹھانی تھی۔

"نہیں مہر ایسی نہیں ہے۔" بختیار کے منہ سے نکلا۔

یہ لمحہ تھا جب نیلم کو لگا کہ اس کی دنیا لٹ چکی ہے۔ اوہ تو آج یہ بات اس لیے کھولی گئی تھی۔

"مہر" تم نے لڑکی بھی ڈھونڈ لی؟" یہ خواب ہوتا تو وہ چیخ مار کر اٹھ جاتی۔ لیکن یہ حقیقت تھی۔

"امی نے ڈھونڈی ہے۔ خالہ کی بہو کی کزن ہے۔ طلاق یافتہ ہے۔ ایک بیٹی بھی ہوجائے گی۔ دیکھو انوار کی طرح میں نے چکر نہیں چلایا۔ سیدھے طریقے سے شادی کررہا ہوں۔ ایک ضرورت مند عورت سے۔" بختیار نے نظر ملا کر اس کو مرعوب کرنا چاہا۔

نیلم کے آنسو بہنے لگے اور اس نے تالی بجائی۔

"واہ واہ! یہ خدا ترسی دوسری عورت کے معاملے میں ہی کیوں آئی۔ نیکی کے کیا باقی در بند ہو گئے ہیں؟" وہ دیوانہ وار تالیاں پیٹ رہی تھی۔

"ایک کا گھر بسا رہے ہو تو دوسری کا اجاڑ رہے ہو۔ یہ کیوں نہیں دکھ رہا۔" اس نے تالیاں روک کر ان ہی ہاتھوں میں چہرہ چھپالیا اور مزید آنسو بہائے۔

شادی کی اگلی صبح سے ہی نئی بہو سے توقع کی جاتی ہے کہ ساس کو امی اور سسر کو ابا جی کہے گی۔ نا صرف کہے گی بلکہ سمجھے گی بھی۔ شوہر دفتر ہوتا ہے۔ یہ بہوویں ہی صبح سے شام ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی ہیں۔ لیکن بیٹے کے مقابلے میں وہ بہو کو کبھی فوقیت نہیں دیتے۔ آج جیسے ہر رشتے کا جنازہ نکل رہا تھا۔

بختیار پر دھن سوار تھی۔ نیلم کے آنسو، بچوں کے اترے چہرے اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ نیلم نے آخری شرط رکھی کہ وہ اس کے گھر میں نہیں آئے گی۔

وہ الگ رہے گی۔ بختیار نے قبول کرلیا اور ایسے ہی کچھ دن بعد قبول ہے قبول ہے قبول ہے کہہ کے مہر سے شادی کرلی۔

☆☆☆

"بہت جانو جانو کہتی تھیں اب جانو کی جگہ جانور کہنا شروع کردو۔ تم پر سوتن لے آیا ہے۔ وہ اس کے ہی قابل ہے۔" وہ امی کے گھر آئی ہوئی تھی جب اس کے بھائی نے کہا۔

"جانو نے جان ہی نکال کر رکھ دی۔" نیلم خود پر ہنسی۔

"ہم تمہارے ساتھ ہیں ہر وقت۔ کبھی خود کو اکیلا نہ سمجھو، جو تم چاہو گی وہ ہی ہوگا۔ ہم تمہارے ساتھ کھڑے رہیں گے۔" بھائی نے حوصلہ بڑھایا۔

ایک دو روز میں اس کے پارلر کی اوپننگ تھی۔ کہتے ہیں فورٹی اس از نائی۔ اس عمر میں مڈل ایج کرائسس آتا ہے۔ اپنی زندگی بے مقصد لگنے لگتی ہے۔ اور انسان مقصد کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ شاید ایسا ہی ہوا تھا۔ بختیار مرد تھا اس نے دوسری شادی کرلی تھی۔ وہ عورت تھی، اس نے پارلر کھول لیا تھا۔

"تم طلاق لینا چاہتی ہو؟" بھائی بہت سنجیدہ تھے۔

"میں نے کون سا دوسرا مرد ڈھونڈ لینا ہے۔ میرا تو وہی نصیب ہے۔ اس نے وعدہ خلافی کی ہے میں نہیں کروں گی۔" نیلم نے کہا۔

"اسے ایسے ہی من مرضی کرنے دو گی؟ اس کو کوئی سزا نہ ملے؟" بھائی طیش میں آیا۔

"جانو نہیں رہا۔ محرم تو رہنے دو ورنہ بچوں سے جان چھڑانے کا بہانا بھی مل جائے گا۔ باپ کا ہونا ضروری ہے، چاہے مہینے میں ایک ہی بار شکل دکھائے۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ اس کی ہمت دیکھ کر سب دنگ رہ جاتے تھے۔ وہاں بھی اس کے فیصلے کے آگے سب لاجواب ہوئے۔

☆☆☆

شرعی فریضہ اور نیکی کا یہ کام کرنے کے لیے دھوم دھام سے فنکشن ہوئے۔ مہندی بھی لگائی گئی۔ رشتہ داروں کو بھی بلایا گیا۔ فوٹو گرافی ہوئی اور ناچ گانا بھی کیا گیا۔ بیٹے کی دوسری شادی میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی۔ کچھ سوشل ورک کے قائل رشتہ دار فون کرکے تمام اطلاع نیلم کو پہنچاتے تھے۔ تاکہ اس کے تبصرے سے کوئی اور چسکے والی بات ہاتھ لگے۔ نیلم نے بہت مشکل سے اپنی خاموشی برقرار رکھی۔ اپنے جلے دل پر وہ دوسروں کو ہاتھ سینکنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ بختیار کی پھپھو اس کے پارلر ہی آگئیں۔

"بارات پر تو مایوسی ہوئی کہ یہ لڑکی پسند کی ہے۔ مگر پھر ولیمے پر اچھے پارلر سے تیار ہوئی تھی تو کوئی روپ آیا۔" پھپھو بال ڈائی کرواتے ہوئے مسلسل بول رہی تھیں۔

نیلم بھی کسی کو ہدایت دینے لگتی کبھی کسی اور کو مگر پھپھو کا بیان ختم نہیں ہو رہا تھا وہ شادی کی ہر بات کھول کر رکھنے پر مصر تھیں۔

"یہ تو تجھ سے معلوم ہوا تم نے پارلر کھول لیا ہے۔ ورنہ بھائی صاحب نے بتایا تھا کہ تم تو اب دو بندوں کا کھانا بھی نہیں پکا سکتیں۔ بیماری نے تمہیں نچوڑ دیا ہے۔ بختیار تنہائی میں ذہنی مریض نہ بن جائے۔ اس لیے دوسری شادی کرنی پڑی۔" کلثوم پھپھو نے ایک اور انکشاف کیا۔

"کیا؟ ابا جی یہ کہتے پھر رہے ہیں؟" نیلم کو یقین نہ آیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے دلچسپی لی۔

"بھائی صاحب تو وہ ہی کہہ رہے ہیں جو بختیار نے ان سے کہا ہے۔ روز جا کر ماں کی گود میں سر رکھ کر روتا تھا کہ اس کی دوسری شادی ممکن بنائیں۔ اس کی بیوی اب بیوی ہونے کا کوئی فرض نہیں نبھا سکتی۔ مجھے بھی یہی لگا۔ تم بستر سے لگ گئی ہو۔ مگر یہاں تو تم بھلی چنگی بیٹھی ہو بلکہ کاروبار چلا رہی ہو۔" پھپھو نے تعریف کی تھی تو بھی تعریف لگ نہیں رہی تھی۔

"بہو کو ہیپاٹائٹس ہوگیا، دوسری کو کینسر تو نئے

ماڈل لے آئے۔ اب ان نئی بہوؤں کی کوئی گارنٹی ہے کہ نہیں؟ کہیں ان کو بھی کوئی مرض نہ لاحق ہوجائے۔" نیلم نے کاؤنٹر کی چیزیں ٹھیک کرتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"تمہارے سسر تو بہت خوش تھے کہہ رہے تھے۔ میرے دونوں بیٹے بیویوں کے نیچے لگے تھے۔ میں نے ان کی دوسری شادی کروائی ہے تاکہ ان کے اثر سے نکلیں۔" پھپھو نے ایک اور پتے کی بات بتائی۔

اولاد کی تعلیم پر جیسے فخر کیا جاتا ہے ویسے ان کی دوسری شادیوں پر کیا جارہا تھا۔ کمال تھا۔ نیلم فون کرنے کے بہانے کرسی سے اٹھی تھی اور باہر چلی گئی تھی۔ اس کے کئی دن بعد تک بختیار کی دھوم دھام سے ہوئی شادی کے چرچے سننے میں آتے رہے تھے۔

☆☆☆

پارلر میں لحہ بھر بیٹھنے کو نہیں ملتا تھا۔ جانے سے پہلے وہ کھانا پکا جاتی تھی۔ پھر بھی گھر اگر کئی کام اس کا منہ تک رہے ہوتے تھے۔ وہ تھک کر صوفے پر بیٹھی۔ بچے ہوم ورک کررہے تھے۔ وہ کئی دنوں سے بچوں کی خاموشی دیکھ رہی تھی۔

"کہیں باہر چلیں؟" نیلم نے ماحول بدلنے کے لیے کہا۔

"میرا کل ٹیسٹ ہے۔" بڑے بیٹے عذیر نے کتاب سے سر اٹھائے بغیر کہا۔

"چلیں نا بھائی دل کررہا ہے پھر میں بھی سنبل کو بتاؤں گی کہ ہم نے بھی انجوائے کیا تھا۔" ثمرا تو جیسے تیار بیٹھی تھی۔

سنبل اس کے چچا کی بیٹی تھی اور دونوں ایک ہی اسکول میں پڑھتی تھیں۔

"کیوں؟ سنبل کہاں گھوم پھر رہی ہے؟" چھوٹے بیٹے احد نے پوچھا۔

ثمرہ چپ کی چپ رہ گئی۔

"بتاؤ تو" عذیر نے دوبارہ کریدا۔

"ثمرہ کو معلوم ہو اب چپ رہنے کا فائدہ نہیں۔ بات سر سے اوپر ہوگئی ہے۔

"کہیں خاص نہیں۔ پاپا کی شادی کے قصے سنا رہی تھی۔ بدکی کافی ڈبیاں جما کررکھی تھیں۔ ٹافیاں خود کھاتی ہے چھوارے کھانے ہمیں کہتی ہے کھالو" ثمرہ نے کہہ دیا۔

نیلم کا دل جیسے مٹھی میں آیا۔ بختیار کی شادی کے قصے صرف وہ اکیلی نہیں سن رہی تھی۔ اس کے معصوم بچوں کے کانوں میں بھی سب پڑ رہا تھا۔ نہ جانے ثمرہ کتنے دن سے یہ سب دل میں رکھے بیٹھی تھی۔

"میرے پارلر میں بھی کلثوم پھپھو آئی تھیں کہہ رہی تھیں۔ دادی جان نے عینک نہیں لگائی، ویٹر کو دلہن کا بھائی سمجھ کر پیار دینے لگیں۔" نیلم کہہ کر ہنسی۔ وہ ہنسنے لگی تو بچے بھی اس کو ہوا نہیں سمجھیں گے۔

"انوار چچا ہر شادی پر چچی کو پلیٹ بنا کر دیتے تھے۔ دو بیویوں کے ساتھ پہلی شادی ہے۔ ان کا تو سارا ٹائم پلیٹیں بنا کر کھانا دینے میں لگ گیا ہوگا۔" احد بھی ہنسا۔

"چلو اٹھو باہر لان میں آؤ، تازہ ہوا ہی کھالیں۔" نیلم اٹھ کھڑی ہوئی۔

گرمیوں کے دن تھے ابھی اندھیرا نہیں ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا تو بچے بھی اٹھ آئے۔

"لان میں کچھ پانی ہی دے دیں، نرم گھاس ہو تو انسان کبھی بیٹھ ہی لے۔" عذیر اب تک بے زار تھا۔

ثمرہ نے پانی کھول کر کیاری میں دینا شروع کردیا۔

"آخری بار احد جب نہایا تھا لگتا ہے تب ہی پودوں کو پانی نصیب ہوا تھا۔" ثمرہ نے منہ بنایا۔

"نہانے کا کیا فائدہ پھر پسینہ آجاتا ہے۔" احد نے کندھے اچکائے۔

ثمرہ نے شرارت سے پانی کا رخ اس کی طرف کردیا۔ پھر واٹر فائٹ شروع ہوگئی دونوں بچے تھے، جلد بہل گئے۔ عذیر اب بھی خاموش بیٹھا خلا میں گھور رہا تھا۔ نیلم نے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"کیا پاپا اب واپس نہیں آئیں گے؟" اس

نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
''کیوں نہیں آئیں گے، تم تینوں میں جان ہے ان کی۔ یاد آرہے ہیں تو ابھی گاڑی بلوائی ہوں ان سے مل آتے ہیں۔'' نیلم نے ایسے اعتماد سے کہا جیسے کوئی انہونی گزری ہی نہ ہو۔
''ابھی تو پڑھائی رہتی ہے۔'' عذیر بھی پرسکون ہونے لگا۔
نیلم کے پاس اولاد تھی۔ وہ چاہتی تو بچوں کو شوہر کے گریبان کا راستہ دکھا دیتی۔ لیکن اس نے کبھی نفرتیں نہ پالی تھی نہ وہ اپنی اولاد کے دل میں نفرتیں بونے والی تھی۔ آج وہ باپ سے لڑیں گے کل ماں کو بھی جواب دے سکتے ہیں اور پھر وہ معاشرے میں کیسے انسان بن کر رہ جائیں گے؟
''چلو ٹھنڈ لگ جائے گی۔ آؤ اندر چلیں۔'' اس نے پانی بند کیا۔
اس رات اس نے دکھتی کمر کے ساتھ پکوڑے تلے کسٹرڈ بنایا۔ خوش ہونے کی کوشش اس نے چھوڑ دی تھی مگر اپنی اولاد کو خوش رکھنے کا چھوٹے سے چھوٹا موقع بھی وہ گنوانا نہیں چاہتی تھی۔

☆☆☆

ابھی تو وہ شوہر کی محبت کے چھوٹ جانے پر ہی رو رہی تھی کہ بچوں کے باپ نے رونے کی اور وجہ دے دی۔ بختیار خرچے میں تنگی کرنے لگا۔ تین سو پینسٹھ دنوں میں وہ پینسٹھ بار بھی نہیں آیا تھا۔ کبھی فون پر رابطہ کر لیتا۔ کبھی بچے اسے کال کر لیتے۔ کبھی کچہری سے واپسی پر چکر لگا لیتا اور جلد ہی نکل جاتا۔
نئی بیوی کو لے کر وہ گھومتا پھر رہا تھا۔ کچھ لوگوں کو ایک بار بھی ارمان پورے کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ اس کو دوسری بار ملا تھا تو پہلے سے زیادہ شدت سے ارمان نکال رہا تھا۔ ایک ایک کر کے ساری معاشی ذمہ داریاں بھی نیلم پر آرہی تھیں۔ وہ فون کر کے بچوں کی فیس اور بجلی کے بل کا ذکر کر سکتی تھی۔ مگر گھر کی ضرورتیں تو پل میں نئی آجاتی ہیں۔ اب جو گھر میں رہتا نہیں، اس کو یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ آٹا ختم ہو گیا ہے۔ نلکا خراب ہے، کتنی بار نیلم بیٹھ کر صرف حساب کرتی رہتی تھی۔ یہاں سے کمی کر دوں تو یہاں سے بڑھ جائے گا۔
ہفتے میں دو بار وہ میکے چکر لگا آتی۔
ماموں ممانی بچوں کو لے کر گھما پھرا آتے۔
بختیار ایک روز آیا تو بچوں کو گھر میں نہ دیکھ کر الٹا انہیں ہی سنا گیا کہ پیروں میں پہیے لگ گئے ہیں۔ وہ کیوں وضاحت دیتے کہ زندگی کو قابل قبول بنانے کے لیے یہ ان کا نیا پینترا ہے۔
اس روز نیلم کے ابو آئے۔ سالوں پہلے کوئی پلاٹ لے کر رکھا تھا اب اس کی قیمت لگوائی تو اچھے گاہک مل گئے۔ نیلم سمیت سب کو حصہ ملا۔ پھنسے ہوئے کتنے ہی خرچے نکل آئے۔ رزق کا وعدہ اللہ نے کیا ہے۔ وہ وسیلے بنا دیتا ہے۔
نیلم کو کرشموں اور معجزوں پر یقین آنے لگ گیا اور وہ اکیلی نہیں تھی۔ فضیلت کے گھر خوشخبری تھی۔ جن رشتہ داروں کو کہا گیا تھا کہ فضیلت کے ہیپاٹائٹس کی وجہ سے انوار نے دوسری شادی کی ہے۔ ان کا منہ کھلا رہ گیا۔ پھر اللہ کے کرم سے اس کے گھر بیٹا ہوا تو ساس سسر کو ایک بار پھر سب کو جواب دہی کرنی پڑی۔ بیٹوں کی مردانگی پر پہلے سینہ ٹھونکتے تھے۔ اب دنیا کی چہ مگوئیوں کی زد میں آگئے تھے۔

☆☆☆

مہر اور نیلم کی پہلی ملاقات فضیلت کے گھر ہوئی تھی۔ انوار کو دوسری شادی راس آئی تھی۔ اس نے ڈبل محنت کی، ڈبل کمانے لگا۔ اپنا گھر بنایا۔ ایک بیوی کو اوپر کا پورشن دیا۔ دوسری کو نیچے کا بختیار بھی مہر کو رخصت کروا کر انوار کے گھر ہی گیا تھا اور سختی سے ہدایت دی تھی کہ اس گھر کی دو مالکن پہلے ہی ہیں تم نے صرف مہمان کی طرح رہنا ہے۔
بچے چچا کے بیٹے کو دیکھنا چاہتے تھے۔ نیلم مبارک باد دینے آگئی۔ مہر کا بھی آمنا سامنا ہوا۔ اس رات بختیار کی خوب شامت آئی کیونکہ مہر بڑی عمر کی بدصورت موٹی عورت دیکھنے کی خواہاں تھی، جس کو

کینسر نے ہر قسم کے نسوانی حسن سے محروم کر دیا ہو مگر نیلم تو ہر لحاظ سے مکمل تھی۔ میچنگ جوتے، کپڑے، ساتھ ہینڈ بیگ وہ لیا تھا جو بریف کیس کی طرح زمین پر کھڑا ہو جاتا تھا۔

فضیلت کی بڑی بہن بھی آئی بیٹھی تھیں۔ وہ کبھی نیلم سے بچوں کے اسکول کے مشورے لیتیں، کبھی سکن کیئر کے ٹوٹکے مانگتیں۔ سیاست ہو یا مہنگائی کا رونا، نیلم کے مشورے اور باتیں بغیر کسی محنت کے ہی ہر طرف چھائی ہوئی تھیں۔ نیلم نے تو شراکت سے مجھوتا کر لیا تھا۔ مہر نے تو پہلی بار یہ زہر چکھا تھا۔

''مجھے تو ایک کمرے میں قید کر رکھا ہے۔ پہلی بیوی پر لٹانے کو بہت پیسہ ہے۔ اس کا پہننا اوڑھنا شان دار ہے۔'' مہر روہانسی ہوئی تھی۔

''وہ ورکنگ وومن ہے۔ اس کی یہ سب ضرورت ہے۔ تم تو بارہ بجے سو کر اٹھتی ہو۔ تمہیں اس سب کی کیا ضرورت ہے۔'' بختیار کا جواب اسے مزید غصہ دلا گیا۔

''اہم تو وہی ہے۔ آخر اولاد تو اس نے ہی دی ہے۔ سال سے اوپر ہو گیا، میری گود سونی ہے۔ آپ میرا علاج نہیں کرواتے۔'' وہ رو پڑی۔

''نیلم اپنے سارے خرچے خود اٹھاتی ہے۔ تم جانتی ہو، میری پریکٹس اچھی نہیں جا رہی۔'' بختیار نے بیوی کی ٹھوڑی چھو کر چہرہ اوپر کیا۔

''یہ کہیں کہ تین بچے پہلے ہی ہیں آپ کو میری اولاد نہیں چاہیے۔'' وہ کھسک کر دور ہو گئی۔

''تمہارے لیے ان سب کو چھوڑ دیا ہے۔ تمہیں اولاد چاہیے تو تھوڑی ورزش کرو، کوئی صحت بخش خوراک لو اللہ نے چاہا تو ہو جائے گی۔'' بختیار نے یاد کروایا۔

''یعنی بے اولادی میری وجہ سے ہے۔ آپ کے پاس تو تین بچے پہلے سے ہیں۔ یہ ثابت کرنے کے لیے۔'' وہ مزید جلی اور روٹھ کر صوفے پر جا لیٹی۔

''اچھا ناراض کیوں ہوتی ہو۔ کسی ڈاکٹر کا معلوم کرو۔ چیک اپ کروا لیتے ہیں۔ کیا خبر ہماری اولاد آئے تو میرے بھی دن پھر جائیں۔''

بختیار روٹھی بیوی کو منا کر صوفے سے ہاتھ پکڑ کر بیڈ پر لے آیا تھا۔ آزمائش انسان کو نکھار کر بہتر انسان بناتی ہے۔ نیلم پر آ چکی تھی۔ مہر پر آنی تھی۔ علاج معالجے کے بعد مہر اور بختیار کی بیٹی ہوئی۔ ایک چیز ہوتی ہے بیماری جو دور ہو سکتی ہے ایک چیز ہوتی ہے سینڈروم جو ساری عمر ساتھ چلتی ہے۔ اسے مسلسل محنت اور کوشش سے قابو میں کیا جاتا ہے۔ ''تمکنت'' مہر اور بختیار کی بیٹی کو ڈاؤن سینڈروم تھا۔ جس کو عام زبان میں منگول ہونا بھی کہتے ہیں۔

☆☆☆

''بچہ پالنے کا ذرا ڈھنگ نہیں ہے آپ کی نئی بھابھی کو، فیڈر کا پانی ابلنے رکھا تھا اتنا پکا کہ دیگچی سفید ہو گئی۔ مہر بھابھی جا کر سو گئی تھیں۔'' فضیلت نے آج شوہر سے دو دو ہاتھ کرنے کی ٹھانی تھی۔

''بچی چھوٹی ہے۔ اس کی نیند نہیں پوری ہوتی ہو گی۔'' اس نے وضاحت دی۔

''جب اولاد نہیں تھی تو وہ کون سا کوئی کام کرتی تھی۔ دن چڑھے سو کر اٹھتی تھی۔ اتنے سال ہو گئے ہیں۔ اس کو چاہیے ہفتے میں دو دن کچن کی ڈیوٹی لے کہاں وہ پانی تک اٹھ کر نہیں پیتی۔'' فضیلت کے گھر کا نظام بگڑ گیا تھا۔

انوار دعا کرتا تھا کہ اس کی دونوں بیویوں میں ہم آہنگی ہو۔ آخر اس کی دعا قبول ہو گئی تھی۔ اس کی دونوں بیویاں مہر اور بختیار بھائی کی موجودگی سے خفا تھیں۔

آخر انوار نے بھائی سے بات کر لی۔ بختیار کرائے کا گھر لے کر مہر اور تمکنت کو وہاں لے گیا۔ جلد ہی مہر کے گھر پھر خوش خبری کی اطلاع تھی۔ لیکن اولاد کی خبر آنے کے باوجود اس کے رزق میں برکت نہیں آ رہی تھی۔ نہ جانے کیا تھا جو برکت کو روکے ہوا تھا۔

☆☆☆

یہ ''انصاف'' جس قدر وزنی لفظ ہے انسان کو

اس کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اس کی خبر تب ہی ہوتی ہی جب اس وزن کو اٹھانا پڑتا ہے۔ بختیار نے اچھا طریقہ نکالا تھا۔ انصاف کو گنتا تھا۔ ناانصافیوں کا شمار بھول گیا تھا۔

"مجھے بزنس کے لیے پیسے چاہیے میں نے یہ گھر بیچنا ہے۔ یہی میری واحد جمع پونجی ہے۔" بختیار اس دن گھر آیا تھا۔

نیلم تو جیسے شاک میں چلی گئی۔

"تین بچے ہیں تمہارے۔ شفقت کا سایہ تو اٹھا ہی لیا ہے۔ کیا اب انہیں دربدر بھی کردو گے؟" وہ اتنا پرایا ہوسکتا ہے؟

پیروں سے زمین نکلنے والے سے اب بھی توقع تھی کہ سر سے چھت نہیں چھینے گا۔

"میرے پاس ایک بہت اچھا بزنس پلان ہے دیکھنا میں دو سالوں میں نیا گھر بنادوں گا۔ کرائے پر آدھی دنیا رہتی ہے.. میں گھر ڈھونڈ کر دوں گا۔" اس نے تسلی دی۔

"تمہیں دو کشتیوں میں سواری کا چسکا لگ گیا ہے۔ اب کاروبار میں بھی یہی فارمولا لگاؤ گے؟ بچے پڑھائی کے اہم موڑ پر ہیں۔ ڈسٹرب ہوجائیں گے۔ ان سے کس بات کی دشمنی۔" نیلم چڑ گئی۔

"ان کی بھلائی کے لیے ہی کر رہا ہوں۔ میں ترقی کروں گا تو ان ہی کا فائدہ ہے۔ انہوں نے بڑے کالجوں میں جانا ہے۔ آگے خرچے بڑھنے والے ہیں۔ ہم قربانی دیں گے تو ہی بچے ترقی کریں گے۔" اس نے دکھتی رگ پکڑی۔

"یہ ناانصافی ہے۔" نیلم نے کہا۔

"میں نے مہر کو بھی کرائے پر رکھا ہوا ہے۔" بختیار نے یاد دلایا۔

"اس کو ہماری برابری پر نہیں لاسکے تو ہمیں اس کے مقابل لانے کی ٹھان لی۔ اچھا انصاف ہے آپ کا۔"

نیلم آخری لمحے تک سودے پر خوش نہیں تھی۔ مگر جس کی ملکیت تھی اس نے گھر بیچ کر ہی دم لیا۔

☆☆☆

آج کا مینو تھا آلو گوشت، گوشت گلنے رکھا تھا۔ آلو وہ چھیل چکی تھی اب ان کو کاٹ رہی تھی۔ ایک سو بہتر..... ایک سو بہتر.....

سے دو سو افراد کا کھانا پکانا تھا۔ ہر بچے کی پلیٹ میں آلو کے دو ٹکڑے تو آنا لازمی تھے۔ وہ گوشت کی بوٹیاں بھی گنتی تھی۔ تاکہ کوئی کمی نہ ہو اور یہ تھی نئے کرائے کے گھر میں نیلم کی مصروفیت اور بختیار کا نیا بزنس۔ بختیار نے ہوٹل کھول لیا تھا۔ اب جب بزنس چلانے کے لیے ساتھی چاہیے تھا تو نیلم ہی یاد آئی۔ دو دہائیوں کا ساتھ تھا۔ چھوٹے نہیں چھوٹتا تھا۔ نیلم پارلر چلا رہی تھی، گھر اور بچے دیکھتی تھی۔ ساتھ روزانہ دو سو افراد کا کھانا بنا کر ہوٹل بھیجتی تھی۔

"تم اس کو چھوڑ دو۔ وہ تمہیں خوار کر رہا ہے۔" بھائی اور والد صاحب اس بار جیسے اس کو ساتھ لے جانے آئے تھے!

"خواری تو وہ کرچکا ہے۔ زندگی نے ایک بار پھر اسے میرے آسرے پر ڈالا ہے۔ کچھ اچھے وقتوں کا قرض ہے، میں اس لیے ساتھ نبھا رہی ہوں۔"

نیلم کے کچن میں اب بھی بڑے دیگچے موجود تھے۔ کسی سے اس کی مشقت چھپی نہیں تھی۔

"بے وقوفی نہ کرو، زندگی کو اس نے جہنم بنادیا ہے۔ اسی وقت گھر چلو، ہم اٹھائیں گے تمہارے بچوں کا خرچا، میں تمہارے شوہر جیسا باپ نہیں ہوں۔ جب تک میرے ہاتھ پیر سلامت ہیں میں تم سب کو پال سکتا ہوں۔" ابو نے اتنے زور سے کہا۔

نیلم کو سکون ملا اس کا دل چاہا باپ کے گلے لگ کر رو پڑے۔ مگر ابھی اسے اپنی اولاد کے لیے اتنا ہی مضبوط بننا تھا۔ جتنا اس کا باپ اس کے لیے بن رہا تھا۔

"بچوں کا اور باپ نہیں آتا، ساری عمر اسی کے نام سے پکارے جاتا ہے۔ میں نے ان کے باپ کو چھوڑ دیا تو ان کا اپنا نام ان کے لیے شرمندگی بن

جائے گا۔'' نیلم نے آنسو پی کر کہا۔

''اور وہ جو مرضی کرتا پھرے۔ اس کی اب کبھی واپسی نہیں ہوگی۔ تمہیں ایک بیگار ملازمہ بنا دیا ہے اور کچھ نہیں۔'' بھائی تو اس کے ایک اشارے کے منتظر تھے۔

''کل عذیر کو کرکٹ کھیلنے جانا تھا اور احد کو دوست نے بلایا تھا۔ گھر پر ایک ہی بائیک ہے دونوں دوسرے کو کہہ رہے تھے کہ تم بائیک لے جاؤ، میرا ضروری نہیں میں ایثار کرنے والے بچے پال رہی ہوں۔ اگر خود غرضی دکھاؤں تو بچے بھی یہی سیکھیں گے۔'' نیلم نے زور دے کر کہا۔

''اس نے جو کیا، اس کے بعد کوئی عمل خود غرضی نہیں ہے۔ کوئی اور ماں ہوتی تو بچوں کی شکل نہ دیکھنے دیتی۔'' ابا جی پھر بولے۔

''بچے بھی تو باپ کی شکل سے محروم ہو جاتے۔ میرا یہ فیصلہ میری کمزوری نہیں میری طاقت ہے۔ پھر آپ سب کی مورل سپورٹ میرے ساتھ ہے۔ وہ ساتھ رہے گی تو میں اس گھر میں بھی خوش رہوں گی۔''

نیلم پچھلی راہ کو خیر باد تو تب کہتی جب کوئی نئی راہ پکڑنی ہو۔ جب اسی راستے پر چلنا تھا تو سواری اپنی تھی یا کرائے کی کیا فرق پڑتا تھا۔

☆☆☆

وہ فرشتہ نہیں تھی اسے غصہ آتا تھا۔ اس کا سب تہس نہس کرنے کا دل بھی کرتا تھا۔ وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔ ساس سسر نے فون کر کے بلایا تھا کہ بچوں کو ملوا جائے۔ وہ گئی تو اور کئی انکشافات ہوئے۔ بختیار بھی وہیں آیا تو وہ پھٹ پڑی۔

''تمہارے گھر بھی ہوٹل سے کھانا جاتا ہے؟ وہی کھانا جو میں بنا کر بھیجتی ہوں؟'' نیلم کو سسرال میں آ کر پچھلے اچھے دن یاد آئے تھے اور اپنا آج پہلے سے زیادہ ڈسنے لگا تھا۔

''تمکنت ٹھیک نہیں رہتی مجبوری ہے۔'' بختیار نے پہلو بدلا۔

''ایسی کیا مجبوری کہ ایک بیوی سے بارات کا کھانا پکلواتے ہو اور دوسرے سے دو بندوں کی ہانڈی نہیں چڑھتی۔'' نیلم کو ایسا لگا جیسے اس کو مہر کی چاکری پر لگا دیا ہو۔ دل جل کر کوئلہ ہو گیا۔

''جہاں دو سو کا پکا سکتی ہوں وہاں دو بندوں کا کھانا کونسی مشقت ہے؟'' بختیار زچ ہوا۔

''مجھے مشقت سے اعتراض نہیں نہ انصافی سے ہے۔'' اس نے شکوہ کیا۔

اس کی آواز سسر صاحب نے نہیں سنی تھی مگر نظر آ رہا تھا۔ بختیار کو ضد میں دیکھ کر ان کا بھی دل کیا کہ حساب چکتا کیا جائے۔

''بختیار پتر! تم نے تو کہا تھا نیلم دو بندوں کا کھانا نہیں بنا سکتی۔ اب وہ پورے ہوسٹل کا کھانا پکاتی ہے مجھے کہانیاں سناتا تھا کہ میں ذہنی مریض بن جاؤں گا۔ بہت دکھی زندگی ہے۔ نیلم پتر اس نے الٹی سیدھی باتیں کی تھیں ورنہ میں بھی تم پر سوتن نہ لانے دیتا۔''

سسر صاحب نے اپنا آپ کلیئر کیا۔ نیلم کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں تھا۔ مگر دوسری اتنی ناکارہ نکلے گی یہ کسی نے نہیں سوچا تھا۔ دن بہ دن سب کو نیلم کی قدر آ رہی تھی۔

نیلم نے ضد نہیں کی۔ بزنس چلتا رہا۔ کچھ جمع جوڑ ہوئی تو پانچ مرلے کا گھر لے لیا۔ اس بار گھر میں خود رہا۔ اپنی دوسری بیوی کے ساتھ شاید یہ بھی انصاف کا ایک انداز تھا۔ چلو کسی کے ساتھ تو انصاف ہو رہا تھا۔ نیلم کو خدمت گزاری پر دل کے کسی کونے میں اگر ملال تھا بھی تو تین سال بعد دور ہو گیا۔ تین سال بعد ہاسٹل بند ہو گیا۔ انہیں کروڑوں کا نقصان ہوا۔ اگر اس نے پہلے نخرہ دکھایا ہوتا تو کاروبار ٹھپ ہونے پر اپنے ردعمل پر دکھ ہوتا۔ اب اس نے اپنا سو فیصد دیا تھا تو کوئی شرمندگی نہیں تھی۔ یہ بھی قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا۔

☆☆☆

وہ فریج کے ٹھنڈے آٹے کے پیڑے بنا رہی تھی۔ ساتھ تپتے توے سے گرمائش اٹھ رہی تھی۔ اس

کی زندگی بھی ایسی ہی ہوگئی تھی۔ ایک طرف سے سرد تو دوسری طرف سے حرارت، باہر لاؤنج میں بختیار احد کو میٹھ کا ہوم ورک کروا رہا تھا۔ صبح کا بھولا اب لوٹنے لگا تھا۔ رات کے کھانے پر بختیار گھر آجاتا تھا۔ اس کی روٹیاں چولہے سے پھول کر اتر رہی تھیں۔ وہ مل کر باتیں کرتے ہوئے کھانا کھاتے تھے۔ اس روز کھانے کے بعد نیلم فریج سے فرنی نکال لائی۔

بختیار جو میز سے اٹھنے والا تھا چونک کر اس کی صورت دیکھنے لگا۔ نیلم بغیر تاثرات کے چمچے کٹوریاں بانٹ رہی تھی۔ مگر اندر سے سب ہی جانتے تھے فرنی بختیار کی پسندیدہ تھی۔ بچے کھانا کھا کر کمروں میں سونے چلے گئے۔ نیلم کچن سمیٹ کر آئی تو بختیار لاؤنج میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔

''معلوم ہے مجھے ایک کیس ملا ہے۔'' بختیار نے کچہری کی باتیں شروع کردیں۔

اس کی کون سی کوئی لڑائی تھی وہ سنتی رہی اور تبصرے کرتی رہی۔ پورا قصہ سنا کر وہ کچھ آگے ہوا اور نیلم کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''فرنی بہت اچھی بنائی تھی۔'' اس نے ہاتھ چوم لیا۔

نیلم کے وجود میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ کتنا مانوس احساس تھا لیکن اتنا ہی ان چاہا۔

کتنا کام کرتی ہو تھک جاتی ہوگی۔'' وہ پیار سے کہتے اور پاس آنے لگا۔

''بس''! نیلم نے ہتھیلی بیچ میں حائل کردی۔

''تمہاری حد اب یہیں تک ہے۔''

''شوہر ہوں تمہارا اب بھی ٹوٹ کر چاہتا ہوں۔'' بختیار کو یقین نہیں آیا۔

''میں بھی محبت کرتی ہوں مگر مجھ سے اتنی بڑی قیمت نہ مانگو۔ تم کسی اور کے ہو چکے ہو۔ اب مجھے اس سب سے گھن آتی ہے۔''

بختیار کو اگر لگا تھا وہ اس کی باقی باتوں کی طرح یہ بھی مان جائے گی تو اس کی بھول تھی۔ اس نے باقی احکام مانے تھے کیوں کہ اس کی مرضی شامل تھی۔ یہاں اس کی مرضی نہیں تھی۔

''مجھ سے گھن آتی ہے؟'' اس کو جھٹکا لگا تھا۔

''میں نے اگر اپنی محبت کسی اور مرد کو دی ہوتی۔ تو کیا تمہیں مجھ سے کوفت نہ ہوتی؟ اگر یہ دلیل بھی قبول نہیں تو سمجھ لو میں اتنے سال مردوں کی طرح کمائی کر کے آدھی مرد بن چکی ہوں۔'' اس کے لہجے میں ذرہ بھر بھی ہچکچاہٹ نہیں تھی۔

''میں تم دونوں کے ساتھ انصاف کرنا چاہتا تھا۔ تم نے مجھے خود دور کیا ہے۔'' عورت ایک بات پر بھی من مانی کرلے تو اس پر الزام دھرنا کتنا آسان ہوتا ہے۔

نیلم کا دل کیا ایک بار پھر تالیاں پیٹے۔ انصاف کیا صرف اس ایک معاملے میں ہوتا ہے۔

''میرے ساتھ وقت گزار کر اگر اٹھ جاؤ گے؟ پھر رات کو خراٹے تو اس کے ہی بستر پر لو گے نا؟ ایسا ہوگا تو مجھے خود سے بھی گھن آنے لگے گی۔'' نیلم اس وقت فولاد بنی ہوئی تھی۔ بختیار نظریں چرا گیا۔

''تمکنت اور مہرا کیلی ہوتی ہیں۔ میں رات کو انہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔''

دل میں اگر ہلکی سی امید تھی کہ وہ اپنی محبت ثابت کرنے کے لیے اس کے پاس رک جائے گا تو وہ ٹوٹ کر بکھری تھی۔

''میں نے کبھی اسے چھوڑنے کے لیے نہیں کہا۔ میں نے اپنانے سے منع کیا تھا۔ اب تو وہ وقت بھی گزر چکا ہے لیکن یاد رکھنا اس تعلق میں بھی یکسانیت آجائے گی۔ اس عورت کی بھی عمر ڈھلنے لگے گی۔ قدرت کا نظام ایسا ہی ہے۔'' اس کا لہجہ طنزیہ ہوا۔

''میں اس سے اکتا کر نہیں آیا۔ میرے دل میں تم دونوں کا الگ مقام ہے۔'' بختیار نے قائل کرنا چاہا۔

''تمہارے دل میں تو بہت گنجائش ہے۔ میرا دل اتنا فراغ نہیں۔ ایک ہی مرد سے محبت کی تھی۔ جو میں اب تک نبھا رہی ہوں۔ لیکن عورت کی محبت

خدمت گزاری سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس میں کبھی کمی ہوئی ہو تو بتاؤ۔'' وہ سامنے کھڑی جواب مانگ رہی تھی۔

''میں چلتا ہوں۔'' مختیار نے رخ موڑا۔

''آتے جاتے رہنا۔'' نیلم نے اس پر دروازے کبھی بند نہیں کیے تھے۔ لیکن یہ چیز اس کے اختیار سے باہر تھی۔

اس دن کے بعد بھی وہ رات کے کھانے پر آتا رہا تھا۔

☆☆☆

زندگی کا یہ طوفان پورا چکر کاٹ کر اپنے اصل کو واپس آ گیا۔ مہر کے گھر دوسری بار خوش خبری تھی۔ وہ تو ایک بچی مشکل سے سنبھالتی تھی۔ مختیار کو ہر طرف ذمہ داریاں نظر آ رہی تھیں۔ اور ذمہ داریاں دیکھ کر اسے ہمیشہ نیلم کا ہی خیال آتا تھا۔

''مجھے ویسے ہی وہ گھر بیچنا پڑ رہا ہے۔ پچھلی بار بھابھی کا گھر تھا۔ اب اس بار سب آپ نے دیکھنا ہے۔''

اتنے سال ایسے ہی گزر چکے تھے اب وضاحتیں دینے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ اس گھر کا کرایہ وہ دے رہا تھا۔ ساتھ رہنے کا فیصلہ وہ کر چکی تھی، اس لیے اس کے باقی فیصلے بھی قبول کرتی تھی، یہ بھی سر آنکھوں پر رکھ لیا۔ مختیار کی واپسی ہوگئی۔ وہ دوسری بیوی اور بچی کو لے آیا۔ نیلم سامان اٹھا کر بیٹی کے کمرے میں شفٹ ہوگئی اور اپنا کمرہ مہر کو دے دیا۔

☆☆☆

مہر کے دیر سے اٹھنے، کام نہ کرنے کے قصے تو اس نے فضیلت سے سن رکھے تھے۔ اب تو ویسے ہی آخری وقت چل رہا تھا۔ اس وقت میں تو بستر سے اٹھنا سب کو ہی محال لگتا ہے۔ نیلم صبح ہی کھانا پکا کر، کام نبٹا کر پارلر چلی گئی تھی۔ بچوں کی سردیوں کی چھٹیاں تھیں وہ بھی دیر سے اٹھے اور ناشتا کر رہے تھے جب تمکنت آنکھیں ملتی کمرے سے باہر آئی۔ وہ ڈیڑھ سال کی تھی مگر ابھی بولتی نہیں تھی۔ تمکنت بھول پن سے انہیں دیکھتی رہی۔ اس کے گول مٹول گال دیکھ کر ثمرہ پیار سے آگے بڑھی۔

''کچھ کھاؤ گی؟'' ثمرہ نے ہتھیلی کے کٹورے میں اس کا ہاتھ تھاما۔ وہ تو محبت کی مورت تھی۔ مسکراتے ہوئے ثمرہ کے گلے ہی لگ گئی۔

''کتنی کیوٹ ہے۔ تمکنت بولو بھائی۔'' احد نے بھی آواز دی۔

وہ ان کے ساتھ ہی بیٹھ کر کھانے لگی۔ کچھ دیر میں ہی وہ ایسی گھلی ملی کہ عذیر فرنچ ٹوسٹ کے نوالے اس کے منہ میں ڈال رہا تھا۔

☆☆☆

تمکنت کی بہن ہوئی تھی۔ نیلم ہر کھانے کی ٹرے بنا کر کمرے میں بھجواتی تھی۔ کماتی بھی تھی اور خرچ بھی گھر کا خود اٹھاتی تھی۔ سوتن کا چھلا کروا رہی تھی۔ مہر پھر بھی منہ بنا کر پھرتی تھی۔ جیسے اس گھر میں رہ کر اور ان لوگوں کو برداشت کر کے احسان کر رہی ہو۔

''باجی کتنا اچھا سوٹ پہنا ہے آپ نے مجھے تو کوئی جوڑا ہی پورا نہیں آ رہا۔'' ہفتوں منہ پھیر کر وہ اچانک سے میٹھی میٹھی ہوئی۔

''یہ انعم ساری رات جگاتی ہے پیٹ نہیں بھرتا کہتے ہیں دودھ کی بنی چیزیں کھانے سے دودھ اچھا آتا ہے۔ مجھے دودھ سے الٹی آتی۔ حلوہ کھا لیتی ہوں ان میں بھی دودھ ہوتا ہے۔''

نیلم نے دنیا دیکھی تھی اس نے ایک اچھا سوٹ لے کر سلوہ کر مہرا کو دیا اور حلوے کے دو ڈبے بھی لا دیے۔

اس کو بھی اللہ نے دیا تھا وہ اللہ سے ڈرتی تھی اور اس کی خوشنودی کے لیے یہ سب کرتی تھی۔ مہر کا مقصد پورا ہو گیا تو پھر سے منہ سجا کر کمرہ نشین ہوگئی۔

☆☆☆

نیلم اور اس کی تربیت ہر طرف حاوی تھی۔ مہر کی چھوٹی بیٹی انعم کو تینوں بہن بھائی اٹھائے پھرتے تھے۔ وہ گھنٹوں ان کے ساتھ کھیلتی تھی یہ سب مختیار

www.paksociety.com

بھی دیکھ رہا تھا۔

"بیٹا! بازار جاؤ تو چھوٹی امی کی دوائیاں لے آنا۔" بختیار نے عذیر سے کہا۔

"ہماری صرف ایک ماما ہیں کوئی چھوٹی نہیں ہیں۔" یہ واحد معاملہ تھا جہاں وہ باپ کو انکار کرتے تھے۔

"وہ بھی تمہاری امی ہیں۔" بختیار مہر کو مزید عزت دلوانا چاہتا تھا۔

"وہ تمکنت کی امی ہیں اور تمکنت میری پیاری بہن ہے۔" یہ کہہ عذیر نے تمکنت کو گود میں ہی اٹھالیا۔

"بائیک پر سیر کرنی ہے؟" اس نے تمکنت سے پوچھا جس نے زور زور سے اثبات میں سر ہلایا۔

"لسٹ دے دیں۔" اس نے فوراً باپ کے آگے ہاتھ کیا اور لسٹ لے کر دوائی لینے چلا گیا۔

اگلم بڑی ہوئی تو گھٹنوں چلتی سیدھی ان کے کمرے میں آجاتی تھی۔ اپنے پہلے قدم بھی غالباً ان کے ہی کمرے میں اٹھائے تھے۔ اس کے بعد اس نے ماما بولا تھا اور پھر "بائی" یعنی بھائی۔ تمکنت تو سارا دن ان کے کمرے میں ہی رہتی تھی۔ وہ رات کو زبردستی بتیاں بجھا کر سوتے بن جاتے تھے کہ تمکنت اپنے کمرے میں جائے تمکنت معصومیت سے ان کی آنکھوں کو کھول کر تصدیق کرتی کہ سو گئے ہیں کہ نہیں۔ اور اس موقع پر ان کی ہنسی لازمی چھوٹتی تھی۔

☆☆☆

ٹماٹر سستے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ پانچ کلو لے آئی کہ دھو کر پیس کر فریزر کر لے۔ بچت بھی ہو جاتی ہے اور کھانا پکانے میں بھی آسانی رہتی تھی۔ ملازمہ ٹماٹر دھو رہی تھی اور وہ بلینڈر دیکھ رہی تھی۔ جانتی تھی ہوشیار ملازمہ رکھ لو بلینڈر استعمال سے پہلے خود ہی دھونا پڑتا تھا۔

"مہر باجی کہہ رہی تھیں گوشت صحیح بھونا نہیں گیا۔ بدرنگ سالن ہے۔ انہوں نے اوپر سے نمک ڈال کر کھایا۔" ٹماٹر دھوتی ہوئی ملازمہ نے رپورٹ پہنچائی۔

نیلم نے جواباً گھور کر دیکھا تو اس نے پینترا بدلا۔

"میں نے کہا ایک تو وہ کھانا پکاتی ہیں۔ آپ سارا دن فارغ ہوتی ہیں آپ کو چاہیے کھانا پکائیں۔ آگے سے کہنے لگیں۔ میں دوسروں کے کام میں مداخلت نہیں کرتی۔ اچھا بہانا ہے۔ آپ کے بچوں کی بھی خوب برائیاں کر رہی تھیں۔" ملازمہ کسی شاباشی کی منتظر تھی۔

مگر نیلم نے بات کو بڑھاوا نہیں دیا اور اس کو کام میں لگا دیا۔ ایک بات جو سب پر اس گھر میں لاگو تھی وہ یہ تھی کہ نفرتوں کی اجازت نہیں تھی۔ اس نے اپنے بچوں کو بھی اس عادت سے دور رکھا تھا اور اب مہر کو بھی اس کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ شام جب بختیار اس کے کمرے میں آیا تو اس نے آرام سے سب کہہ دیا۔ تاکہ ملازموں کے سامنے ایسا دوبارہ نہ ہو۔ ثمرہ لاؤنج میں تمکنت کا ہیئر اسٹائل بنا رہی تھی۔

"تم ملازمہ بدل لو۔" بختیار نے کہا۔

"سب تقریباً ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔ ایک بدل کر دوسری لانے کے بعد اتنا تو سمجھ آ ہی جانا چاہیے۔" نیلم نے ذومعنی انداز میں کہا۔

"پھر وہی بات جان کر مجھے غصہ دلاتی ہو۔" بختیار چڑنے لگا۔

تمکنت دوڑ کر نیلم کے سامنے آگئی اور باپ کو آنکھیں دکھانے لگی۔

وہ صحیح سے بولتی نہیں تھی مگر اپنی زبان میں تاؤں واؤں کہتی ہوئی وہ باقاعدہ باپ سے اس کے لیے لڑ رہی تھی۔

"اچھا چھوٹی میڈم جی! معاف کر دو تمہاری ماما کو کبھی کچھ نہیں کہوں گا۔" بختیار نے پہلے ہاتھ جوڑے پھر آگے ہو کر نیلم کے کان کے پاس شرارت سے چوم لیا۔

"لو اب خوش؟" بختیار نے تمکنت کو دیکھا جو خوشی سے چھلانگیں مار کر تالیاں پیٹنے لگی تھی اسے نیلم

سے اتنا ہی پیار تھا۔

☆☆☆

اس دن کلثوم پھپھو ان کے گھر آگئیں۔ انہیں کوئی قانونی مشورہ چاہیے تھا۔ بختیار نے دوبارہ پریکٹس شروع کی تھی۔ مگر اس کی کمائی میں برکت نہیں رہی تھی۔ وہ بل ہی بمشکل دے پاتا تھا باقی سارا خرچا نیلم اٹھاتی تھی۔ ہر دیسی عورت کی طرح کلثوم پھپھو کو بھی چسکا تھا دو بیویوں والا گھر ہے کئی دنوں کی گفتگو کا سامان نکل آئے گا نیلم پارلر میں تھی۔

مہر ایک دو بار ذکر کر چکی تھی کہ "باجی" کا بہت رعب ہے۔ ملازمہ بھی ڈرتی ہے گھر کا ہر فیصلہ وہی کرتی ہیں۔ کلثوم پھپھو کو مسالے دار گفتگو مل رہی تھی۔ لیکن پھر نیلم پارلر سے واپس آگئی۔ دونوں بچیاں دوڑ کر نیلم کی ٹانگوں سے لپٹ گئیں۔

"ماما ساری میری، ماما میری۔" انعم تتلا کر بول رہی تھی۔

کلثوم پھپھو کا تو منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ حمکنت نے پرس پکڑا اور بھاگ کر اندر رکھ آئی۔ ساتھ وہ اس کی گھر کی جوتیاں بھی لے آئی کہ بدل لے۔ اتفاق سے نیلم کا بھی اس دن بازار کا چکر لگا تھا۔ اس کے دل میں اتنی محبت تھی کہ جتنی لٹاتی اتنی بڑھتی تھی۔ اسے ان بچیوں سے بہت پیار تھا۔ وہ بازار جاتی تھی تو اپنے سامان سے پہلے ان بچیوں کی چیزیں اچھی لگتی تھیں۔ اس روز بھی اس نے کلپ پونیاں نکال کر بچیوں کو تھمائیں۔

"ارے باجی آگئیں بہت محنت کرتی ہیں۔ باجی کے بغیر تو ہمارا دل ہی نہیں لگتا۔ باجی بیٹھیں ناں میں چائے دیکھ آؤں۔" اس کو نیلم سے بہت کام نکلتے تھے اس لیے اس سے منہ در منہ کبھی نہیں بگاڑتی تھی۔

لیکن دوسروں کے سامنے برا بھلا کہنے سے چوکتی بھی نہیں تھی۔ مہر نے اچھی بھلی بساط بچھائی تھی اب چاروں خانے چت ہوئی تو بہانے سے اندر چلی گئی۔

اتنے سالوں میں بھی اس کے تعلقات سلام دعا سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ بس اتنی ترقی ہوئی تھی کہ وہ اپنا ناشتا خود بنا لیتی تھی۔ ناشتا تناول فرما کر وہ گندے برتن میز پر ہی چھوڑ کر ملازمہ سے کہتی تھی کہ باجی کو بتا دینا انڈے ختم ہو گئے ہیں اور اٹھ کر کمرے میں چلی جاتی۔ پھر پورا دن ٹی وی دیکھتی۔

نیلم کو معلوم بھی ہو جاتا کہ اس کے پیچھے مہر نے کلثوم پھپھو کو کیا کیا کہا ہے تو بھی وضاحتیں نہ دیتی۔ اس کی ایسی عادت نہیں تھی۔ کلثوم پھپھو خود ہی سمجھ گئی تھیں کہ نیلم ملازموں پر رعب رکھتی ہے مطلب گھر کا کام وہ دیکھتی ہے اور فیصلے کرنے کا اختیار تو کمایا جاتا ہے۔ کما کر گھر چلا رہی ہے تو ہی فیصلے کر رہی ہے۔ کلثوم پھپھو بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔ چائے پی کر انہوں نے منہ پر ٹشو پھیرا۔

"میری نند اپنے لڑکے کے لیے رشتہ ڈھونڈ رہی تھی۔ کم عمر لڑکا ہے باہر پڑھنے جا رہا ہے۔ ماں چاہتی ہے کوئی چھوٹی سی لڑکی دیکھ کر شادی ہی کر دے دونوں ساتھ ہی باہر چلے جائیں۔ آج کل ماحول بھی تو ایسا ہے۔ لڑکا بھی اکیلے بھیجتے ڈر لگتا ہے۔ میں نے تمہاری ثمرہ کا ذکر کیا تھا لیکن وہ کہنے لگیں علیحدگی والے ماں باپ کے بچے سازشی ماحول کے عادی ہوتے ہیں۔" ساتھ ہی وہ قہقہہ لگا کر ہنسیں۔

"میں نے کہا باجی کا کیا قصور۔ ہاں کوئی بختیار کے بیٹوں کو لڑکی دینے سے انکار کرے تو سمجھ بھی آتی ہے۔" وہ ہنس کر پھر سے چائے کی چسکیاں لینے لگیں۔

نیلم صبر کر گئی۔ جگ ہنسائی کا سامان دے کر دوسروں کے منہ بند نہیں کیے جا سکتے۔ اس کے دل سے دعا نکلی۔ اللہ اس کی بیٹی کے بخت بلند کرے۔ اس کے بیٹوں کو مخلص بیویاں ملیں۔ اس کے صبر کے بدلے اللہ اس کی اولاد کو قدر دانوں سے نواز دے۔

☆☆☆

اس روز بڑے دنوں کے بعد فائزہ آئی تھی۔ انعم نے اسکول جانا شروع کر دیا تھا۔ عذیر کو اس کے چچا نے اسپانسر کیا تھا۔ وہ لاء کر کے بڑی ڈگری لینے یو

کے جا چکا تھا۔

''شکر ہے عذیر کی زندگی تو صحیح سمت نکلی۔'' فائزہ کچن میں ہی بیٹھی تھی۔

''میری بھی الحمدللہ اچھی گزری سب میری عزت کرتے ہیں۔ جن کو قدر نہیں ان کو بھی آ گئی ہے۔'' نیلم ساتھ ہانڈی میں چمچہ چلا رہی تھی۔

''وہ میٹھا میٹھا بول کر سارے کام نکال لیتے ہیں اور تمہاری خدمتیں کرنے کی عادت نہیں جاتی۔''

''ان سب سے بہتر ہے میری زندگی۔ سر اٹھا کر جیتی ہوں۔ خود کماتی ہوں مرضی سے دوسروں پر خرچ کرتی ہوں، میری یہی دعا ہے اللہ مجھے دینے والوں میں سے ہی رکھے۔'' اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''کم از کم میاں کو یہ تو کہہ سکتی ہو کہ تمہارے پالنے والوں میں مزید اضافہ نہ کرے۔'' فائزہ نے کہا۔

نیلم کا ہاتھ تھم گیا۔

مرد خود غرض بیوی ہے صرف اپنا سوچتا ہے اس وقت جب میں اکلوتی بیوی تھی میرے بارے میں کچھ تو سوچتا۔ لائی تھی تو کوئی امیر مربعوں والی لے آتا۔ میں بھی عیش کر لیتی۔ لیکن اسے اپنی انا کی تسکین کے لیے کم عمر عورت چاہیے تھی۔ کوئی کم صورت امیر بیوہ نہیں چاہیے تھی۔'' اس نے مدھم آواز میں ہنس کر کہا۔

اتنے میں ثمرہ آ گئی۔ وہ کالج کے کسی فنکشن میں جانے کے لیے تیار تھی۔ آتے ہی فائزہ کے گلے لگ گئی۔

''ہیلو فائزہ آنٹی! میں آپ کو بہت یاد کر رہی تھی۔'' ثمرہ گلے لگی تو اس کا پرس فرش پر لگا۔

''یہ میٹل کا پرس کیوں لے کر جا رہی ہو، ہر طرف ٹکرائے گا۔'' نیلم نے ٹوکا پھر غور کیا۔ پچھلے ہفتے جب وہ اسکول پارٹی کی بات کر رہے تھے تو اس نے دوسرا ڈریس نکالا تھا۔

''تم نے وہ سوٹ کیوں نہیں پہنا جو ہم نے اس دن سوچا تھا۔ وہ زیادہ اچھا تھا۔'' نیلم نے سر سے پاؤں تک بیٹی کو دیکھا۔

''اس کی سائیڈ کی سلائی لگنے والی تھی۔ سلائی مشین حمکنت کی امی اپنے کمرے میں لے گئی تھیں میں نے مانگی تھی وہ کہنے لگیں انہیں ابھی کام ہے۔ صبح بھی کہا ایک ہی سلائی لگانی ہے۔ پر ان کی مرضی میں نے دوسرا پہن لیا۔'' ثمرہ نے لاپرائی سے کہا پھر نیلم کے گلے لگ کر باہر چلی گئی۔ اس کی فرینڈ اور اس کی امی پک کرنے آ گئی تھیں۔

''وہ عورت سمجھتی ہے کہ وہ مس پرفیکٹ ہے اور ہم رعایا۔'' نیلم دھب سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

''بختیار بھائی سے ابھی بھی کوئی اچھی امید ہے تو ختم کر لو۔ پہلے بھی تم نے اپنے بچوں کا سوچا تھا۔ اب بھی اپنے بچوں کا سوچو۔ آگے کو ان کی شادیاں ہوتی ہیں۔ بچوں کو ہنستا بستا دیکھنا ماں کی خوشی ہوتی ہے سوکنی ماں کی نہیں۔'' چائے کا آخری گھونٹ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ فائزہ نے کپ میں ہی چھوڑ دی۔

''صبر صرف اللہ کے لیے کرنا چاہیے۔ اللہ کے لیے صبر کرو تو وہ راستے کھول دیتا ہے انعام واکرام سے نوازتا ہے۔ بندوں کی خاطر صبر کرو تو وہ آپ کو قابل استعمال شے سمجھ لیتے ہیں۔ میں اللہ کو خوش کرنے کے لیے صبر کرتی تھی۔ بندوں کے لیے نہ پہلے کیا تھا نہ اب کروں گی۔'' وہ ایک بار پھر بہت اعتماد سے مسکرائی تھی۔

☆☆☆

''میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ آپ مجھے الگ گھر لے دیں۔'' نیلم صوفے پر آ کر بیٹھی۔

بہت سالوں پہلے اس ہی جملے سے بختیار نے بات شروع کی تھی۔ جب بختیار نے دوسری شادی کا فیصلہ کیا تھا۔

''کتنی دفعہ کہہ چکا ہوں ایک بل آتا ہے۔ مجھے بچوں سے روز ملنے کے لیے محنت نہیں کرنی پڑتی۔'' وہ پھر سے مثبت چیزیں گنوانے لگا۔

''کل کو میری بہوویں آئیں گی۔ وہ کیوں

دوسا سیں برداشت کریں۔ گھر کا ماحول آج اتنا ہمدرد ہے میں چاہتی ہوں۔ آگے بھی رہے اور یہ تب ہی ممکن ہے۔ جب سب کو ان کی اسپیس ملے۔"

وہ بہت نپے تلے انداز میں کہہ رہی تھی۔

"میرا ہاتھ تنگ ہے آج کل تو پمپرز کا خرچا ہی نہیں پورا ہوتا۔ میں تمہیں الگ گھر کیسے لے کر دے سکتا ہوں۔" اس نے بڑھ جذباتی رخ موڑا۔

نیلم کے تو کھر نڈ چھل گئے۔ اب تک وہ شوہر کی بے وفائی، تنہائی، خرچے کی تنگی، سوتن کی شراکت، بزنس کی مشکلیں کیا کچھ نہیں برداشت کر چکی تھی۔ ان سب کے سامنے اب والی بات تو کچھ بھی نہیں تھی۔ مگر اس سلائی مشین والی بات نے تابوت کے آخری کیل کا کام کیا تھا۔ برداشت کے اس پل پر وہ سالوں سے چلتی آرہی تھی اب اسے آخری دھکا دیا جا چکا تھا۔

"انوار کا کنال کا گھر ہے وہ بھی اپنا۔ ایک بیوی کے پاس پورا پورشن ہے۔ دونوں بیویوں کا خرچا وہ خود اٹھاتا ہے۔ ایک چیز جو دونوں رشتوں میں یکساں ہے وہ یہ ہے کہ اس کی بھی سب سے بڑی مددگار اس کی پہلی بیوی ہے اور آپ کی بھی۔ مرد کو دوسری شادی کا پھندا گلے میں تب ہی ڈالنا چاہیے جب وہ افورڈ کر سکتا ہو۔" نیلم نے آہ بھری۔

"اچھا بھلا سب کام چل رہا تھا ایسی ہی کوئی بددعا لگ گئی ہے۔ جو نقصان ہو رہے ہیں۔" بختیار نے خود کو مظلوم ثابت کرنے کی کوشش کی، یہ حربے پرانے ہو گئے تھے۔

"میں نے کبھی بددعا نہیں دی۔ میرا نصیب ابھی بھی آپ سے جڑا ہے۔ میرا ٹوٹ بھی جائے تو میرے بچوں کے باپ آپ ہی ہیں۔ لیکن میرے بچوں کا کیا قصور ہے الگ گھر اب ان کا حق ہی نہیں ضرورت ہے۔ میں عرصے سے دو دھاری تلوار پر چل رہی ہوں۔ میں چاہتی ہوں اب یہ ریت ختم ہو جائے۔" اس نے کہا۔

"تم بڑے گھر کی ہو، بہو بھی بڑے گھر کی لانا چاہتی ہو گی۔ تم لوگوں کا گزارا کیسے ہو گا۔" اس نے کرختگی سے کہا۔

"بڑے گھر کی تھی بڑے دل کی ہوں اور بڑے ظرف کی بھی ہوں۔ آپ نے کہا تھا۔ دو سال بعد نیا گھر لے دیں گے۔ اتنے سال گزر گئے میں نے ذکر نہیں کیا۔" آج سرے حساب کتاب کرنے کا وقت تھا۔

"ظرف ہوتا تو تم مجھے معاف کر چکی ہوتیں۔ یہ روز کی عدالت نہ لگائیں۔" اس کے جواز کھوکھلے ہو رہے تھے۔

"سالانہ خرچ کا حساب تو ایک بار حکومت بھی مانگ لیتی ہے اور معافی کس بات کی مانگ رہے ہیں۔ میری طرف بہت حساب باقی ہیں۔" وہ دکھ سے بولی۔

بختیار نے خاموشی سے چینل بدلنا شروع کر دیا۔

"آپ نے کہا تھا ایک طلاق یافتہ عورت کو اپنا کر آپ نیکی کر رہے ہیں۔ اس عورت کی ذمہ داریاں بھی آپ نے میرے سر پر ڈال دیں۔ اب کیا میرے بچے بھی آپ کے شوق کا مول دیتے رہیں گے؟ میں نے الگ گھر کا فیصلہ کر لیا ہے آپ لے کر دیں گے یا باقی خرچوں کی طرح یہ بھی میرا درد سر ہے تو بتا دیں۔" اس نے کہہ دیا ہر لفظ اس کے دل پر بوجھ بن کر گرا تھا لیکن اس نے کہہ دیا۔

بختیار بول نہ سکا تھا۔

☆☆☆

فائزہ نے بہانے سے ثمرہ اور نیلم کو اپنے گھر بلایا تھا۔ اس کے گھر میں بزنس پارٹنر کا کھانا تھا۔ ان کے بیٹے بیٹیاں بھی آئے ہوئے تھے۔ وہ چلے گئے تو فائزہ نے بتایا کہ وہ لڑکے کا رشتہ ڈھونڈ رہے ہیں اور ثمرہ انہیں اچھی لگی ہے۔

"اس گھر میں خوشی کی باتیں کرتے ہوئے دل ڈرتا ہے۔" نیلم کو احساس ناکامی ہونے لگا۔

"تم تو گھر بدل رہی تھیں کیا بنا؟" فائزہ کو یقین نہ تھا اتنے اچھے رشتے پر بھی سوچ میں پڑ جائے گی۔

"ایک پسند آیا ہے۔ پراپرٹی ڈیلر کو ٹوکن دیا تھا کہ کرایہ کم کروائے مگر بات نہیں بنی۔ ہمارے بجٹ میں کوئی مناسب گھر نہیں مل رہا۔"

"میں مدد کروں؟" فائزہ نے پوچھا۔

"تم جانتی ہو مجھے یہ سب قبول نہیں اللہ کوئی راستہ نکالے گا۔"

وہ گھر واپس آ گئی تھی۔ اندر تو دیواروں کے بھی کان تھے۔ باہر کھڑے ہی پراپرٹی ڈیلر کو کال ملالی۔

"جی میرا ٹوکن واپس کر دیں۔ میں کوئی اور دیکھ لوں گی۔" اس نے کہا۔

"لیکن کیوں میڈم ابھی صبح ہی تو آپ کے شوہر سیکورٹی جمع کروا کر گئے ہیں۔" پراپرٹی ڈیلر کی آواز آئی تو اسے لگا کوئی مذاق کر رہا ہے۔

"میرے شوہر؟" اس نے تصدیق کی، باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔

"جی بختیار صاحب آئے تھے۔ میں تو اگریمنٹ بنوا رہا تھا۔" اس نے بتایا۔

نیلم کو جیسے کھویا ہوا حصار ملا ہو۔ اس ہی وقت گیٹ کھلا اور بختیار اندر داخل ہوا۔

"میں اڑان بھرنے لگتی ہوں تو آپ یوں ہی کنڈا ڈال لیتے ہیں۔" اس نے شکوے سے کہا۔

"میرا ساتھ نبھانا تمہاری مجبوری نہیں تمہاری مرضی تھی۔ میں اس کا ساری عمر شکر گزار رہوں گا۔" اس نے کہا۔

اور جو کچھ اس نے کہا نہیں وہ بھی نگاہوں سے بیان ہوا تھا۔

"کیا پکاؤں؟ کیا کھائیں گے؟" وہ پوچھتی ہوئی اندر جانے لگی۔

"آج میں کچھ لے آتا ہوں باہر سے بتاؤ کیا لاؤں۔" اس نے جواب میں سوال کیا۔

اور سال میں ایسے چند لمحوں میں اس کو اپنی قربانیوں کا صلہ ملتا تھا اور دل میں ٹھنڈ اترتی تھی وہ ایسے موقعے دونوں ہاتھوں سے بٹورتی تھی۔

☆☆


الف لیلہ ہزار داستانیں

دلچسپ اور خوبصورت داستانیں جنھیں پڑھ کر بچے ہیری پوٹر کو بھول جائیں گے، ایسی داستانیں جنھیں بڑے بھی پڑھ کر لطف اندوز ہونگے

کتاب بذریعہ رجسٹری منگوائیں

-/300 روپے کا ڈسکاؤنٹ حاصل کریں

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

انیسہ عائشہ

# رمضان کے رنگ

عافیہ نے محبت پاش نگاہ ان کے شفیق چہرے پہ ڈالی اور دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔ عافیہ کی جب شادی ہوئی وہ ایم اے کی استوڈنٹ تھی۔ پڑھتے پڑھتے ہی بیاہ کر سسرال آ گئی۔ کام کی سمجھ بوجھ نہ تھی سو بڑا گھبراتی مگر اس کی ساس، شفقت بیگم واقعتاً سراپا شفقت ثابت ہوئیں۔ آہستہ آہستہ وہ سارے کاموں میں طاق ہوتی چلی گئی۔ اس کے باوجود انہوں نے یہ نہیں کیا کہ کاموں کا سارا بوجھ بہو کے سر پر ڈال کر خود بری الذمہ ہو گئیں، بلکہ وہ اب بھی اول روز کی طرح ہر کام میں اس کی معاونت کرتیں۔ یوں تمام کام بخوبی نمٹ جاتے اور وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی۔

☆☆☆

جیسے جیسے رمضان کی آمد قریب آتی جا رہی تھی عافیہ کی فکر اور پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اگرچہ اس بار اس نے عید کی ساری خریداری اور عید کے حوالے سے گھر کی تفصیلی صفائی پہلے ہی کر لی تھی، افطار کا کافی کچھ سامان فریز کر لیا تھا مگر پھر بھی اطمینانی ہلکورے لے رہی تھی۔ بالآخر رمضان کی مبارک ساعت آ پہنچی۔

اگلی صبح سحری میں اٹھنے کی فکر میں وہ رات بھر صحیح سے سو بھی نہ سکی۔ آخر میں اس کی آنکھ لگ گئی۔ امی جان کے جگانے پر وہ منہ ہاتھ دھو کر سیدھا کچن میں چلی آئی۔ دل میں یہ ڈر تھا کہ کہیں گیس نہ چلی جائے۔ امی جان نوافل ادا کرنے میں مشغول ہو گئیں۔

رمضان میں دونوں بھائی ہاسٹل سے گھر آ جاتے تھے اور سب سے چھوٹے دیور عمار کی تو چھٹیاں ہو جاتی تھیں۔ یوں سات افراد کی سحری تیار کرنا ہوتی۔

اس نے میاں کو اٹھایا۔ سب دستر خوان پر آ بیٹھے۔ سحری میں کسی کو پراٹھا چاہیے ہوتا تو کسی کو سادہ روٹی، تو کوئی دیسی گھی میں چپڑی۔ کوئی لسی پیتا تو کوئی چائے۔ ابا جان کو چاول چاہئے ہوتے یوں ہی کاموں میں گھن چکر بنی اپنی سحری کی۔ ابا جان کو ادویات پہنچائیں۔

فجر کی بلند ہوتی آواز پر وہ دل مسوس کر رہ گئی پہلی سحری میں ہی وہ نوافل سے محروم رہی تھی۔ نماز فجر ادا کر کے وہ برتنوں کا ڈھیر دھونے کچن چلی آئی، کیونکہ گندا کچن چھوڑ کر وہ سکون کی نیند نہیں سو سکتی تھی۔

اس سے فارغ ہو کر اس نے اپنے بڑے بیٹے عفان کو اٹھایا کہ قاری صاحب پڑھانے آئے تھے۔ اس دوران میں وہ خود بھی قرآن پاک کی تلاوت کرتی رہی۔ قاری صاحب کے جانے کے بعد عفان کے لیے ناشتہ بنایا، اسے اسکول کے لیے تیار کیا تو اسے یاد آ گیا کہ اسے بھی روزہ رکھنا تھا۔ لو جی عفان صاحب ناراض۔ آنکھوں میں آنسو۔ اسکول سے چھٹی کی دھمکی۔ بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر اسکول روانہ کیا۔

کمرے میں آئی تو ننھا زوہان جاگ اٹھا تھا۔ اسے فیڈر بنا کر دیا۔ کپڑے تبدیل کرائے گھڑی پر نگاہ پڑی تو میاں کو آفس کے لیے اٹھایا ان کے جانے کے بعد، وہ زوہان کو کھلونے دے کر قرآن پاک کی

تلاوت میں مشغول، امی جان کے پاس بٹھا کر صفائی کے ارادے سے جھاڑن اٹھالی۔

صفائی کے بعد وہ بری طرح تھک چکی تھی۔ کمر سیدھا کرنے کی غرض سے لیٹ گئی۔ ظہر کی اذان کانوں میں پڑی تو بمشکل اٹھنا پڑا۔ عفان کو کھانا دیا، وہ اسکول سے گھر لوٹ چکا تھا۔ اس نے نماز ظہر ادا کی اور قرآن پاک کی تلاوت کرنے لگی عفان اور زوہان نیند کی وادیوں میں کھو چکے تھے۔ وہ ان پر نگاہ ڈالتے فکر مندی، افطاری کی تیاری کے لیے کچن میں چلی آئی۔

اس کا دماغ اور ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔

رمضان المبارک میں امی جان گھر کے کاموں اور تمام سرگرمیوں سے لاتعلقی اختیار کر کے مکمل طور پر عبادات کی طرف متوجہ ہو جاتیں۔ رمضان المبارک کے مہینے میں ایک تو تمام افراد گھر ہوتے، دوسرا امی جان بھی ہاتھ نہ بٹاتیں تو عافیہ پر بھاری بوجھ آپڑتا۔ نہ نے دن پوری ہوئی، نہ ہی عبادات کو پرسکون اور اطمینان سے وقت دے پائی۔ عجب سی فکر گھیرے رہتی اس کا دل اداسی سے بھر گیا۔

''آہ! اپنے ہاں رمضان میں کتنا خوش رہا کرتی تھی ہائے وہ بے فکری اور سکون سے پر روزے۔ کاش کہ پھر سے لوٹ آئیں۔'' زوہان کی آواز اسے حال میں کھینچ لائی۔ عفان ٹیوشن چلا گیا تھا کہ رمضان میں کم از کم وہ اسے نہیں پڑھا سکتی تھی اس لیے مجبوراً ٹیوشن لگوائی۔ پاؤں میں لپٹے زوہان کے ساتھ اس نے افطاری کا سارا سامان تیار کیا۔ اس کا بہت دل چاہتا کہ وہ بھی اماں کی طرح، افطار میں گھنٹہ بھر تک طویل دعائیں مانگے مگر وائے قسمت عمار کو گرما گرم پکوڑے چاہیے تھے تو میاں کو ٹھنڈے دہی بھلے، فروٹ چاٹ افطاری تیار کر کے بھاگم دوڑ میں دستر خوان لگائی۔ افطاری کے بعد مرد حضرات مسجد چلے جاتے۔ وہ نماز مغرب ادا کر کے کچن کی راہ لیتی۔ امی جان زوہان کو لے کر واک کے لیے چھت پر چلی جاتیں۔

کچن کا پھیلا وا سمیٹ کر نماز عشاء اور پھر تراویح۔ اتنی دیر میں سب مسجد سے لوٹ آتے۔ سب کو کچھ نہ کچھ کھانے کو چاہیے ہوتا۔ پھر دودھ گرم کر کے سب کو دینا۔ سب کام نمٹا کر سب سے آخر میں وہ لیٹتی اور صبح بھی سب سے پہلے اسی کو اٹھنا ہوتا۔ جس دن مشین لگا لیتی۔ اس دن تھکاوٹ حد سے سوا۔

رمضان کے بابرکت جمعے، مسجد اور محلے کے گھروں میں بھجوائی جانے والی افطار اسپیشل کی نذر ہو جاتے۔ وہ شکر مناتی تھی کہ اماں رمضان میں نہ کسی کی افطار پارٹی قبول کرتی تھیں اور نہ کسی کو دعوت دیتی تھیں ورنہ اس کا کیا ہوتا۔ آخری عشرہ آپہنچتا تو ابا جان یا امی اجان اعتکاف بیٹھ جاتے اور کام ڈبل

یوں آخری دنوں تک اس پہ غصہ، جھنجلاہٹ اور بیزاری طاری ہوجاتی اور وہ گن گن کر ایام رمضان کو الوداع کہتی۔ مگر ہر بار ملال بڑھ جاتا کہ وہ رمضان کا حق اس سال بھی ادا نہیں کر پائی۔

نماز عشاء کے لیے وضو کر کے لوٹی تو ہمسائی شمع آئی بیٹھی تھی، وہ ایسے اگلے روز ہونے والے درس میں دعوت دینے آئی تھی۔ اس نے اپنی مجبوری بتا کر معذرت کرلی۔ وہ دل ہی دل میں خفت زدہ تھی کہ وہ شمع کو پہلے بھی یوں ہی لوٹا چکی تھی۔ منہ پھٹ اور صاف گو شمع تو پھٹ پڑی۔

"خوب جانتی ہوں تمہاری مجبوری کو، تمہیں کاموں میں جھونک کے تمہاری ساس خود سارا دن جائے نماز بچھائے بیٹھی رہتی ہے۔"

شفقت بیگم جو عافیہ سے کچھ کہنے آئی تھیں اپنے نام کا تذکرہ سن کر وہیں رک گئیں۔

"ارے ایسی کوئی بات نہیں ہے، سارا سال امی میری مدد کرواتی ہیں صرف رمضان میں وہ چاہتی ہیں کہ ایک ماہ پرسکون ہوکر، صرف عبادت کو وقت دیں تو اس میں کیا مضائقہ ہے۔"

"تو عبادت کیا صرف ان کا حق ہے۔ اولیا کرام کا تو یہ معمول تھا کہ رمضان میں غلاموں کو بھی کاموں کی تخفیف کردیا کرتے تھے اور یہاں الٹی ریت ہے کہ رمضان میں سارا بوجھ ہی تم پر ڈال دیا۔"

"یہ بات نہیں ہے شمع، یہ میرا گھر ہے۔ میرے اپنے لوگ ہیں گھر کے کاموں کا بھی ثواب ملتا ہے۔ حقوق العباد بھی ادا کرنے ضروری ہوتے ہیں۔"

"یہ بات اپنی ساس کو بھی سمجھاؤ نا کہ گھر کے کاموں کا ثواب وہ بھی لیں، کہتے ہیں کہ رمضان میں دوسروں سے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور دل نرم ہوجاتا ہے، جبکہ یہاں تمہاری ساس کا دل الٹا پتھر ہوجاتا ہے۔ خیر میں کل باجی جان سے خصوصی دعا کرواؤں گی کہ وہ شفقت بیگم کی ہدایت کے لیے دعا کردیں۔"

شمع نے آنکھ مار کے شوخی سے کہا تو وہ بھی مسکرائے بنا نہ رہ سکی۔ "یہ شمع کی بچی بھی نا!"

شفقت بیگم خاموشی سے واپس لوٹ گئیں۔ اس ساری گفتگو نے ان کے دل کی دنیا کو تہہ و بالا کر ڈالا تھا۔ شمع کی باتیں انہیں غصہ دلا رہی تھیں۔ مگر وہیں اپنی بہو کی باتوں نے ان پر ٹھنڈی پھوار ڈال دی تھی۔ انہوں نے ساری منفیت ایک طرف رکھ کر سوچا تو انہیں اپنا رویہ واقعی غلط لگا۔ رات تک وہ سوچتی رہیں اور ایک فیصلے پر پہنچ کر مطمئن ہوگئیں۔ اگلی صبح امی کو کچن میں پا کر عافیہ نے پوچھا۔

"کچھ چاہیے آپ کو؟"

"نہیں جاؤ تم جا کر نوافل پڑھ لو۔ باقی کام میں دیکھ لیتی ہوں۔" اسے تذبذب میں گھرا دیکھ کر وہ دوبارہ گویا ہوئیں۔ "جاؤ بیٹا، شاباش۔"

اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ آج اس نے پرسکون انداز میں نوافل ادا کیے جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو ایک سکینت سی طاری ہوتی محسوس ہوئی۔ سبحان اللہ کیا خوب صورت وقت ہے۔

آج سارا دن امی جان کی کایا پلٹ نے اسے خوش گوار حیرت میں مبتلا کیے رکھا۔ آج وہ دن میں پرسکون نیند بھی لے سکی تھی اور افطار میں امی جان کے ہاتھ بٹانے اور ان کے مشفقانہ تسلی آمیز جملوں نے اس کی ساری کلفت، پریشانی اور فکر دور کردی وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ تروتازہ اور شاداب۔ یہی وجہ تھی کہ مغرب کے بعد، وہ ان کے ساتھ ساتھ اپنے لیے بھی چائے کا کپ اٹھائے چھت پر چلی آئی۔

"ہماری بہو کیوں ہے آج دنگ؟" چائے کا کپ لیتے ہوئے شفقت بیگم نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

"اماں! دوبالا ہوگئے ہیں رمضان کے رنگ، پیاری امی جان کے سنگ۔"

اس نے ان کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے پیار سے کہا تو انہوں نے عافیہ کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ اور دونوں مسکرادیں۔ آسمان سے جھانکتا چاند بھی اس نظارے کو دیکھ کر کھل اٹھا اور ہر سو اپنی چاندنی بکھیر دی۔

☆☆

بہنوں کا اپنا ماہنامہ
# شعاع

مارچ 2024
کے شمارے کی ایک جھلک




## مارچ 2024
## کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

- "شہر شام ہجر" فرح بخاری کا مکمل ناول،
- "ماہ الملوک" نگہت سیما کا مکمل ناول،
- "دستور وفا" مریم عزیز کا مکمل ناول،
- "پھول زلفوں میں" فلک تنویر کا مکمل ناول،
- "چوتھی بہو" راشدہ رفعت کا ناولٹ،
- ہاجرہ ریحان، لبنیٰ آصف، صائمہ نور اور نورین زہرہ کے افسانے،
- "والعصر" امت العزیز شہزاد کا ناول،
- "سائرہ یوسف سے ملاقات" معروف فنکارہ سے ملاقات،
- "پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں" احادیث کا سلسلہ،
- دستک جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع ہر ماہ پوری محنت سے ترتیب دیتے ہیں، لیکن آپ کے خط ہمیں بتاتے ہیں کہ ہم اپنی محنت میں کتنے کامیاب ٹھہرے، ہمیں خط لکھنا نہ بھولیے گا۔

**شعاع مارچ 2024 کا شمارہ آج ہی خرید لیں**

pklibrary.com

آسیہ رئیس خان

# دوا اور روشن

وہ دنیا کا انوکھا انسان تھا جو نو برس بعد اپنے ملک، اپنے شہر لوٹنے کے باوجود ایئر پورٹ کے کیفے ٹیریا میں بیٹھا وقت کو آگے بڑھتے دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنے گھر پہنچنے کی جلدی نہیں تھی۔ ایک لمبی جدائی کے بعد اپنوں سے ملنے کی بے تابی، خوشی، جوش، جیسے سارے احساسات منجمد تھے یا کسی انجانے ڈر نے انہیں سرد کر رکھا تھا۔ اس کے اندر بس ایک خوف تھا اور کوفت تھی۔

کاؤنٹر سے تیسری کافی لے کر واپس میز پر آیا تو فون کی مخصوص آواز پر اس کا دل لمحہ بھر کو بند ہوا۔ اس شہر میں پہلی دفعہ اس کا فون گنگنایا تھا اس کے ذہن میں خیال لہرایا۔ کیا پتا یہیں کسی نے اسے یاد کیا ہو۔ اس نے فون کی اسکرین روشن کی۔ کسی پیغام کے بجائے وہ اشارہ دفتر سے موصول ہوئے ای میل کا تھا۔ فون واپس رکھتے ہوئے وہ رک گیا۔ خود کو روکتے روکتے بھی وہ ایک بار پھر، وہ چند الفاظ پڑھ رہا تھا جنہیں دہرانے کے لیے دیکھنا ضروری نہیں رہا تھا۔

”شاید تمہیں یاد ہو تم نے کہا تھا، میں تم سے کچھ بھی منوا سکتی ہوں۔ تو ایک بار آجاؤ، بڑے ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

امی اور ثاقب بھائی اسے بلا بلا کر اور سمجھا سمجھا کر تھک گئے تھے کہ وہ ضد اور غصہ ختم کر کے ہمیشہ کے لیے نہ سہی، کم سے کم ایک بار تو باپ سے ملنے آجائے۔

اور رہی اس کی بات تو یہ منوانے والا خیال تو نو سالوں سے اس کی زندگی کا سب سے بڑا خوف تھا۔

مانا کہ اس کی اپنی ضد اور باپ سے ٹھنی سرد جنگ نو برس بعد بھی جاری تھی لیکن اب، اس رن میں وہ ولولہ نہیں رہا تھا جو نو سال پہلے ہوا کرتا تھا۔

وہ خود بھی اب نو برس قبل جیسا سر پھرا نہیں رہا تھا البتہ تب سے اب تک ویسا ہی تھا وہ اس کا دل تھا اور اس میں بیٹھا ڈر کہ اسے اس کی ماننا پڑے گی۔

اس نے فون بند کر کے سیاہ کافی کو دیکھا جس کی تلخی اس کے اندر گھلی تلخیوں سے بہت کم تھی۔ وہ سب سوئے ملتے اور وہ نہیں چاہتا تھا اتنے وقت بعد وہ اپنی آمد سے سب کی نیند خراب کرے۔ وہ ایک شخص کی وجہ سے پہلے ہی سارے گھر کو بہت تنگ کر چکا تھا۔ اس نے کافی ختم کی اور بیگ گھسیٹتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

”آپ سو جائیں بڑی امی! تالا میں لگا دوں گی۔“ وہ نزلہ زکام سے تنگ تھیں۔ دوا کھانے کے بعد ان کی نیند سے بوجھل ہوتی آنکھیں اس سے چھپی نہیں تھیں۔

”ارے تمہارے بڑے ابا سونے دیں گے مجھے۔“ انہوں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”جب تک سن نہ لیں۔ گیٹ کو تالا لگا دیا ہے، نہ خود سوتے ہیں نہ مجھے سونے دیتے ہیں۔“

جب بھی رات میں ثاقب بھائی گھر نہ ہوتے، بڑے ابا کو گیٹ مقفل کرنے کی ایسی ہی فکر ہوتی تھی۔

”آپ چلیں، میں آکر ان سے کہہ دیتی ہوں۔“ اس نے آخری رکابی کھنگال کر رکھا۔

www.pklibrary.com

# مکمل ناول

pklibrary.com

"ہاں کہہ دو ذرا، تمھاری بات سمجھ میں آجاتی ہے انہیں۔" وہ کرسی چھوڑ کر کمرے کی طرف چل پڑیں۔

روزانہ مغرب کے بعد ڈیری والا دودھ دے جاتا تھا۔ آج اس نے فون کیا تھا کہ وہ دیر سے آئے گا۔ اسی کے انتظار میں اب تک گیٹ کھلا تھا۔ ورنہ رات کا کھانا ہوتے ہی، بڑی امی گیٹ مقفل کر کے فارغ ہو جاتی تھیں۔ اس نے گیلے ہاتھ خشک کیے، ایپرن اتارا اور بڑے ابا کے کمرے میں آئی۔

"بڑے ابا! بڑی امی کی طبیعت ٹھیک نہیں، اس لیے آج لاک میں لگا دوں گی، بس دودھ والا آجائے۔" اس نے دروازے میں رک کر کہا۔

"اسے فون کرو، اگر دس منٹ میں آتا ہے تو ٹھیک ورنہ کہو۔ صبح دے جائے اور لاک لگا دو۔"

ان کے لیے زیادہ چلنا پھرنا تو کافی دنوں سے آسان نہیں رہا تھا۔ ایک بار بستر پر آجاتے تو ان سب کی کوشش ہوتی تھی کہ انہیں پھر کمرے سے نکلنا نہ پڑے۔ ہال سے گزر کر پورچ کے چند زینے اترنا چڑھنا اور صحن عبور کر کے گیٹ تک جانا پھر واپس آنا، ان کے لیے خاصی مشقت تھی جو پچھلے مہینے سے مکمل بند ہو گئی تھی۔

"جی۔" وہ ان کی بات مان کر پلٹ گئی۔ باورچی خانے کی بتی بجھائی اور فون لیے باہر آئی۔ اسے امی کو بھی فون کرنا تھا۔

"پہلے گڈو سے بات کرلوں پھر امی کو لگاتی ہوں۔" اس نے سوچتے ہوئے دودھ پہنچانے والے بچے کو فون لگایا۔

دوسری سمت رنگ ہوتی رہی کسی نے اٹھایا نہیں۔ "شاید راستے میں ہو۔" وہ وہیں صحن میں ٹہلنے لگی۔

"بھابھی اور بچوں کے بنا کتنا سونا لگ رہا ہے گھر۔" بچے اور بھابھی چھٹیاں گزارنے ننھیال میں تھے اور ثاقب بھائی کل ہی انہیں لینے گئے تھے۔ وہ امی کو فون لگا رہی تھی کہ گیٹ کے دوسری طرف آہٹ ابھری۔

"کتنی دیر کردی تم نے۔"

اس نے گیٹ پوری طاقت سے اپنی طرف کھینچا مگر سامنے موجود، ودیع کو دیکھتے ہی اس کے ہاتھ سے فون چھوٹ کر زمین بوس ہوا اور وہ گونگی ہو گئی۔

وہ جواب تک خود سے قبول کرتے جھجک رہا تھا کہ کس لیے واپس آیا ہے، اس پل ایمان داری سے مان لیا وہ اسی کی خاطر یہاں موجود تھا جو دیر سے آنے کی شکایت کر رہی تھی۔

ان کے درمیان حائل وقت کی دیوار کا سایہ دونوں کے چہروں پر پڑا تھا۔ وہ اب دبلا پتلا، جھنجھلایا اور اکھڑ سا لڑکا نہیں تھا بلکہ کچھ بڑھے وزن اور داڑھی مونچھ کے اضافے کے ساتھ وہ ایک سلجھا ہوا، پروقار، ذمہ دار مرد نظر آرہا تھا، چنچل تبسم اور شوخ تاثرات سے خالی طوبیٰ اسے اپنی امی اور چچی کا پرتو لگی، سب کی فکر میں بھاگتی دوڑتی اور وقت پر کام نپٹانے کی فکر میں ڈوبی عورت۔

"جس گھر میں ابا ہوں وہاں کے مکین اور کیسے ہو سکتے ہیں!" ایک کڑوا سا خیال ابھر کر ڈوبنے سے پہلے اسے ملال میں مبتلا کر گیا۔

"اور اسے اس گھر میں قید کرنے والے تم ہو۔"

سنجیدگی کے علاوہ وہ اب بھی ویسی ہی تھی، دبلی پتلی، سیاہ گہری آنکھوں والی سلونی جس نے اس کے اندر ایک نئی دنیا آباد کی تھی۔ طوبیٰ نے یوں سینے سے سانس آزاد کی جیسے وہ پورے نو سال سے انگی تھی۔

وہ گھر سے گیا تو متوسط طبقے کا عام حلیے والا لڑکا تھا اور اس وقت جینز، شرٹ، جوتے اور بازو پر رکھا جیکٹ، سب کچھ اتنا بدلا تھا کہ وہ کسی فلم کا امیر کبیر ہیرو لگ رہا تھا۔ ودیع نے جو ایک ہاتھ ٹرالی بیگ پر رکھے تھا، جھک کر فون اٹھایا۔ فون کی اسکرین دو تین آڑی ترچھی لکیروں کے ساتھ تازہ واردات پر منہ بسور رہی تھی۔

"کیسی ہو؟" اس نے بیگ کے دستے سے ہاتھ ہٹا کر فون کے اسکرین پر پھیرا جیسے یوں کرتے ہی وہ دراڑیں مٹ جائیں گی اور پھر فون اس طرف بڑھایا۔ تب ہی گڈو کی سائیکل کی گھنٹی بجی۔

"سوری باجی! آج زیادہ ہی لیٹ ہو گیا، مہمان آئے ہیں؟" وہ زمین پر پیر ٹکا کر سائیکل روکے کھڑا حسب عادت بول رہا تھا۔ طوبیٰ نے گیٹ

کا پٹ پورا وا کیا اور ودیع کے بازو سے گزر کر گڈو کے قریب آئی۔

"کہاں سے آئے ہیں مہمان؟ میں تو ڈر رہا تھا، آپ نے تالا ہی نہ لگا دیا ہو لیکن پھر سوچا فون نہیں کیا مطلب نہیں لگایا ہوگا۔"

طوبیٰ نے اس کے ہاتھ سے بچ سی تھیلی لی اور پلٹنے لگی کہ اس نے پکارا۔

"باجی! مہمان کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں اتنا تو بتا دو۔" وہ اسے گھور کر گیٹ سے اندر آ گئی۔ گڈو بڑبڑاتا ہوا سائیکل آگے بڑھا لے گیا۔

وہ زینے کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ ودیع وہیں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی، یہاں تک آنا ایک سفر تھا اور گیٹ سے بڑے ابا کے کمرے تک جانا دوسرا۔ وہ واپس آئی اور کچھ کہے بنا ٹرالی بیگ اپنے ساتھ گھسیٹ کر پھر اندر کی طرف بڑھ گئی۔ زینے کے پاس آ کر اس نے بیگ اٹھا کر زینہ چڑھنے کے لیے ہینڈل نیچے کیا ہی تھا، پیچھے سے ودیع نے آ کر بیگ اٹھا لیا۔ ان کے ہاتھ ٹکرائے تھے۔

وہ تیزی سے بڑے ابا کے کمرے کی طرف بھاگی۔

"بڑے ابا!" وہ دستک دیے بنا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

"کیا ہوا؟" ان سے پہلے بڑی امی اٹھ بیٹھیں۔

"ابھی تک نہیں آیا گڈو؟" پھر ان کی نظر اس کے ہاتھ پر پڑی۔ "اچھا تالا لگا دیا ہے۔"

وہ واپس لپٹنے لگی تھیں کہ اس کی بات پر تیزی سے کھڑی ہوئیں۔

"باہر وہ، ودیع،" اس گھر میں یوں اس کا نام ہی کافی تھا۔ بڑی امی کے نہ قدم سنبھل رہے تھے نہ آواز۔ وہ ہائے ودیع، میرا ودیع کہتی، گرتی پڑتی کمرے سے باہر نکلیں۔ سامنے بیٹے کو دیکھتے ہی ان کی آواز بند ہو گئی۔ ان کے منہ سے بے ربط سے جملے ادا ہو رہے تھے۔ جتنا انہیں اس کی آمد کا انتظار تھا، اتنا اچانک وہ آ گیا تھا۔ وہ رو رہی تھیں، ہنس رہی تھیں اور اندر بڑے ابا اور وہ دونوں اپنی اپنی جگہ کان ہال کی آوازوں پر لگائے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا انہیں پلنگ سے اتار کر، باہر لے جائے یا ودیع کے اندر آنے کا انتظار کرے۔

"وہ اندر آئے گا؟" اس کا یقین ڈگمگا رہا تھا۔

باہر بڑی امی نے اس کی امید کے برعکس کوئی شکوہ نہیں کیا تھا۔ وہ خوش تھیں، اسے بار بار گلے لگا کر یقین کر رہی تھیں، اس کا چہرہ تھاما، ہاتھ چومے لیکن ایک بار بھی نہیں کہا "اتنے برس کیوں لگا دیے، اتنے وقت بعد کیوں آئے، میں ترس گئی تھی، مجھے کس بات کی سزا دی۔"

اس کے بن باس نے انہیں محتاط کر دیا تھا۔ کیا پتا پھر کسی بات پر وہ چلا جائے یا پھر ان کے نزدیک وہ سب سوال اور شکوے بے کار تھے کہ وہ، آ گیا تھا اور ان کے لیے یہ ہی سب کچھ تھا۔

"آؤ، اپنے ابا سے مل لو۔" وہ اس کا ہاتھ تھامے اسے ان کے کمرے میں لے آئیں۔

ان کے آنے سے پہلے ہی وہ ایک طرف ہو گئی تھی۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ باپ بیٹے دونوں سے کچھ بعید نہ تھا۔

ودیع کے لیے یہ چند قدم، سب سے کڑی مسافت تھے۔

دروازے سے ان پر نظر پڑتے ہی اس کا دل سکڑ گیا۔ اگر وہ نفرت کرنے کے قابل ہوتا تو اسے دنیا میں اس انسان سے نفرت ہو سکتی تھی لیکن اس وقت کمزور، لاغر اور ہڈیوں کے ڈھانچہ بنے شخص کو دیکھ کر اس کے اندر اداسی اتری تھی۔

اسے ویسی کمینی سی خوشی نہیں ہوئی تھی، جیسی وہ سوچتا تھا کہ ایک دن انہیں اپنے غیر مرئی تخت کے بنا دیکھ کر وہ محسوس کرے گا۔

"السلام علیکم۔" وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ان کے پاس پہنچا۔ بڑے ابا نے جواب دیا اور طوبیٰ کو لگا، وہ آج ایک معجزے کی شاہد بنی ہے۔

عجیب سی فضا تھی کمرے کی، نامانوس، بے چین، بے آرام سی۔ کوئی بندہ اپنے کردار میں نظر نہیں

آرہا تھا۔ باپ سے مجبور اضرور تاً اتنی بات کرنے والا ودیع پلنگ کے کنارے بیٹھ گیا تھا، اولاد پر حکم چلانے اور ہمیشہ سخت لہجے میں بات کرنے والے بڑے ابا کے جھکے کندھوں سے زیادہ حیران کن، ان کی گدلی دھندلی آنکھیں تھیں، شوہر اور اولاد کے درمیان ہمیشہ دباؤ اور تناؤ میں رہنے والی بڑی امی، اس وقت پرسکون تھیں۔ بس وہ ہی کل کی طرح آج بھی اپنے کردار میں تھی، تماشائی، لیکن نہیں وہ تو آج اس منظر کے پیچھے کی وجہ تھی۔

"سفر ٹھیک تھا؟" بڑے ابا نے پوچھا۔

"جی۔"

"ڈائریکٹ فلائٹ تھی؟"

"نہیں۔" وہ انہیں تفصیل بتانے لگا۔ رسمی اور عام سی گفتگو کی اہمیت اس پر آج واضح ہوئی تھی۔

وہ دبے قدموں باورچی خانے میں چلی آئی۔ دودھ اندر رکھ کے فریج بند کیا ہی تھا کہ امی کی کال آگئی۔

"امی سے کیا کہوں؟" اسے نئی فکر نے گھیرا۔

"فون کیوں نہیں اٹھا رہیں؟" بڑی امی کی آواز ابھری تو وہ چونکی۔ ان کی بیماری اور نیند اڑن چھو ہوگئی تھی۔

"امی ہیں، کیا کہوں،؟" اس نے رک رک کر الجھن بیان کی۔

"مجھے دو۔" انہوں نے اس کے ہاتھ سے فون لے کر کان سے لگایا۔

"وعلیکم السلام۔ یہیں ہیں۔ ہاں ٹھیک ہے، تمہارے بھائی جان بھی۔ ذرا رک کے بات ہی سن لو، ہاں تو۔ ودیع آیا ہے، ہاں ہاں ودیع، ابھی کچھ دیر پہلے، ہاں وہی کہنے والی تھی، اسے چھٹی نہ ملے تو تم ہی آجاؤ، ہاں، اللہ حافظ۔"

انہوں نے فون بند کر کے واپس اسے دیا۔

"ٹوٹ کیسے گیا؟"

"گر گیا تھا۔"

"ودیع کھانا کھائے گا، ہے یا کچھ باہر سے منگوالیں؟" ان کا جوش اور خوشی اسے اچھی لگ رہی تھی۔

"ہے بڑی امی! میں فریزر سے بھی کچھ نکال کر فرائی کر لیتی ہوں۔"

"وہ فریش ہو کر آرہا ہے تب تک تم کر لو، میں ثاقب اور شہاب کو فون کر لیتی ہوں۔"

"جی۔"

دوبارہ فریج کھولتے ہوئے، اسے بھی بڑی امی کی طرح خیال نہیں آیا کہ وہ فریش ہونے کدھر گیا ہے۔

دروازہ کھولتے ہی ودیع کو احساس ہوا کہ اس کا کمرہ اب کسی اور کے زیر استعمال ہے۔

"ایکسائٹمنٹ میں امی کو خیال نہیں رہا شاید۔" بیگ گھسیٹتا وہ آگے آیا۔

پہلا مرحلہ اس کی توقع سے زیادہ سہل ثابت ہوا تھا۔ جسے سوچ کر سارا وقت اس کے اعصاب سنج زدہ تھے، اس پڑاؤ کے پار ہو جانے پر وہ اب سکون کی حالت میں تھے۔

یہاں آنے کے فیصلہ کے بعد سے اس پر حاوی اعصاب شکن سوچیں بھی سست ہو کر کہیں گردن ڈالے اونگھ رہی تھیں۔ حیرت انگیز طور پر اس کے اندر سکون تھا۔

وہ اب تک خود کو یقین دلاتا آیا تھا کہ اس گھر سے دور جانا، یہاں کی غلامی کا طوق گلے سے اتار پھینکنا، یہاں کے اصولوں اور 'جیلر' سے بچ پانا اس کی خوش قسمتی تھی، وہ ہمیشہ خود کو شاباشی دیتا تھا کہ بڑے دونوں بھائیوں کے مقابلے میں وہ خود کو باپ کے سایے سے دور کر پایا تھا، لیکن اس وقت اس کے اندر اتر رہا ہر احساس اسے باور کرا رہا تھا کہ اس نے ہمیشہ اس گھر، اس جگہ اور یہاں کے لوگوں کو بے انتہا یاد کیا تھا۔ نو سال قبل وہ جس اطمینان کی خاطر یہاں سے گیا تھا وہ اطمینان اسے یہاں آکر ہی محسوس ہو رہا تھا۔

وہ پلنگ پر بیٹھ گیا جو کبھی اس کا ہوا کرتا تھا۔ سلوٹ سے پاک ست رنگی چادر سے ہوتی، اس کی نظر تکیے کے ساتھ رکھی کتاب پر پڑی۔ وہ گلزار کی نظموں کی کتاب تھی۔ اس نے پہلا صفحہ کھولا اور وہاں طوبیٰ شیخ لکھا دیکھ کر ٹھٹھک کے کمرے پر نظر دوڑائی۔ پردے پر لٹک رہے کیچر، آرائشی میز پر

رکھے لوشن، کریم، لپ اسٹک، اسکرنچیز اور دروازے کے پیچھے لگے ہینگر میں جھولتے دوپٹے اور عبایا۔

اس نے مڑ کر کھلی کتاب میں ایک بار پھر نام کو دیکھا اور درمیان سے کتاب کھولی جہاں پینسل رکھی تھی۔ صفحے پر عادتاً ہی عنوان سے نظم تھی۔

سانس لینا بھی کیسی عادت ہے
جیے جانا بھی کیا روایت ہے
کوئی آہٹ نہیں بدن میں کہیں
کوئی سایہ نہیں ہے آنکھوں میں
پاؤں بے حس ہیں، چلتے جاتے ہیں
اک سفر ہے جو بہتا رہتا ہے
کتنے برسوں سے، کتنی صدیوں سے
سانس لیتے ہیں، جیتے رہتے ہیں
عادتیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔

الفاظ سیدھے دل پہ جا کے لگے تھے۔ اس نے آہستہ سے کتاب بند کردی۔ کچھ دیر وہ شش و پنج میں رہا کہ کسی اور کمرے میں جائے یا یہیں رکا رہے۔ اب تو اسے باقی کمروں کے مکینوں کا بھی اندازہ نہیں تھا۔ اس کمرے میں اس کے ساتھ طلال رہتا تھا اور وہ جانتا تھا طلال اب پونا میں ہے۔ گھر میں کمروں کے مکینوں کے علاوہ بھی بہت کچھ بدل گیا تھا۔

ذرا دیر بعد وہ تروتازہ ہو کر باہر آیا تو بڑی امی خاندان بھر میں، اس کے آنے کی خبر سنانے میں مشغول تھیں۔ اسے دیکھ کر جلدی جلدی بات سمیٹی اور اسے لے کر باورچی خانے میں آئیں۔ طوبیٰ کباب تل رہی تھی۔ دونوں نے کرسیاں سنبھالیں اور اس نے کھانا چن دیا۔

اسے یاد تھا اس نے گھر چھوڑا اس وقت یہاں فرش پر دسترخوان بچھا کر کھانا کھایا جاتا تھا، چپ چاپ اور بنا آواز کیے کہ دسترخوان پر ابا بھی موجود ہوتے تھے۔

"وہاں کون بناتا ہے کھانا؟" بڑی امی نے مشرقی ماؤں کی پہلی پریشانی کو آواز دی۔

"خود ہی بناتا ہوں۔" وہ سارے لوازمات میز پر رکھ کر باہر آگئی۔ احتیاط سے بڑے ابا کے کمرے کا دروازہ کھولا تو اندر اندھیرا تھا۔

"کیا آج نیند کی گولی اثر کرے گی؟" اس نے اسی احتیاط سے دروازہ بند کرتے ہوئے سوچا۔

وہ فون دیکھتے ہوئے اپنے کمرے میں آئی۔ خولہ بھابھی اور طلال کے پیغام تھے۔ اس نے بنا دیکھے ہی فون بند کردیا۔ ودیع کے آنے کا سننے کے بعد کیا بات ہو سکتی تھی، اسے اندازہ تھا اور اسی لیے اسے میسج پڑھنے میں دلچسپی نہیں تھی۔ فون آرائشی میز پر رکھتے ہوئے اسے آئینے میں وہی گرے ٹرالی بیگ نظر آیا اور وہ یوں جھٹکے سے پیچھے مڑی گویا بیگ کی جگہ ودیع کھڑا ہو۔

"یہ ودیع کا کمرہ ہے۔ تھا۔" اس نے تیزی سے چاروں طرف نظر دوڑائی اور سکون کا سانس بھرا۔ اس کی سلیقہ مندی نے شرمندگی سے بچالیا تھا۔

وہ بیگ کے پاس آئی، جس پر پلاسٹک کی تھیلی میں ودیع کے اتارے ہوئے کپڑے سلیقے سے تہ کر کے رکھے تھے اور ہینڈل پر تولیہ پھیلا تھا۔

"بڑی امی شاید بتانا بھول گئیں انہیں۔"

اب تو اوپر ایک منزل کا اضافہ ہو گیا تھا جہاں خولہ بھابھی اور ان کے بچوں کے کمرے تھے۔ جب تک طلال یہاں تھا، وہ اور امی ایک کمرے میں تھیں۔ طلال کے جانے کے بعد وہ اس کے کمرے میں آگئی تھی۔

وہ آہستگی سے پلنگ کے کنارے بیٹھ گئی۔ اسے ایک دم یاد آیا اور وہ فون دیکھنے لگی۔ نو سال بعد وہ اس سے رابطہ کرنے کا حوصلہ جمع نہیں کر پائی تھی لیکن اب بڑے ابا کی زوال پذیر صحت نے اس میں وہ ہمت بھر دی تھی۔

اسے امید نہیں تھی کہ ودیع اب بھی یہ فون نمبر استعمال کر رہا ہوگا۔ وہ بس اپنی قسمت آزمانا چاہتی تھی۔ پہلی اور آخری بار کچھ کرنا چاہتی تھی۔ سارے خوف اور اندیشوں کے ساتھ وہ یہ خطرہ مول لینے کو تیار ہوئی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی اس کے بعد والی صورت حال، آر پار کی ہوگی جس میں وہ سب کچھ ہار بھی سکتی تھی۔ اس نے چیٹ کھول کر وہاں

www.pklibrary.com

موجود اکلوتا پیغام دیکھا جس پر بلیو ٹک بھی نہیں تھی۔

"تم میرے میسج کی وجہ سے آئے ہو یا کوئی اور وجہ ہے۔۔۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا تم نے میرا میسج دیکھا پڑھا بھی ہے یا نہیں، یہ نمبر تمہارے پاس ہی ہے یا کسی نئے مالک کو یہ میسج گیا ہے۔ کیا یہ اتفاق ہے میں نے میسج کیا اور کچھ دن بعد تم آگئے،؟" اس نے فون سے نگاہ ہٹا کر اس کے بیگ پر مرکوز کی۔

"تم واقعی اس گھر میں موجود ہو۔" وہ اس حقیقت پر خوش ہونا چاہتی تھی لیکن اب دل سہما تھا۔ کیا پتہ نو سال پہلے جس زنجیر سے بڑے ابا نے اسے اس گھر سے باندھا تھا وہ اسے یہیں اتار پھینکنے آیا ہو۔

اس نے انگلی میں موجود اس انگوٹھی کو دیکھا جو بڑی امی نے نکاح کے بعد، کنگن کے ساتھ اسے پہنائی تھی۔ کنگن تو اس نے اگلے دن ہی اتار دیے تھے مگر انگوٹھی، نو سال سے اس کی انگلی میں موجود تھی۔

فون سے ابھری آواز پر وہ ادھر متوجہ ہوئی۔

امی نے صوتی پیغام بھیجا تھا۔ وہ کل صبح ہی بس سے نکل رہی تھیں۔ ان کی آواز کی کھنک اور جوش پر وہ اور اداس ہوگئی۔

"یا اللہ میری امی کو اب کوئی دکھ نہ دینا!" اس نے تڑپ کے دعا کی۔ نو سال سے ان کی جان بھی تو سولی پر تھی۔

بہت دیر بعد جب اسے خیال آیا کہ کھانا ہوگیا ہوگا تو وہ باہر نکلی۔ بڑی امی اور وہ وہیں بیٹھے بات کر رہے تھے۔ وہ اس نازک موقعے پر بے تحاشا مسرت کے باوجود اس بات کا خاص خیال رکھ رہی تھیں کہ کوئی ایسی بات، منہ سے نہ نکلے جو پھر اسے ان سے دور کردے۔

ان کی ساری عمر ہی احتیاط برتتے گزری تھی۔ شوہر کا مزاج تو تھا ہی کڑوا، بچے بھی جو باپ سے نہیں کہہ سکتے تھے۔ وہ سب ماں کو سناتے تھے اور ان کی ہمیشہ ایک ہی کوشش ہوتی، کسی طرح بچوں کو یقین دلا سکیں کہ ان کے ابا یہ سب ان کی بھلائی کے لیے کرتے۔ ساری سختیاں اور پابندیاں ان کے بہتر مستقبل کو مدنظر رکھتے ہوئے عائد کی گئی ہیں۔ ان کی ممتا کا مقابلہ ہمیشہ وفادار بیوی سے رہا تھا۔ انہیں نہ شوہر غلط لگتا تھا نہ بچے لیکن ان کا اختیار، بس بچوں پر چلتا تھا۔ اب بھی لاشعوری طور پر اس کا دل نرم کرنے وہ شوہر کا بدلا مزاج اور ان کی بیماری اسے سنا رہی تھیں۔

"اس بار گئے تو ڈاکٹر کہہ رہا تھا گھر میں ہی آکسیجن کا انتظام رکھنا پڑے گا۔"

اسے دیکھ کر وہ کھڑی ہوگئیں۔

"یہ اٹھا لو طوبیٰ! تم نے ہاتھ بھی نہیں دھوئے۔" وہ بھی کرسی چھوڑ کر کھڑا ہوگیا۔

"کارنر والا کمرہ ٹھیک کردیا ہے۔"

وہ ہاتھ دھونے سنک کی طرف گیا تو اس نے برتن سمیٹتے ہوئے دھیمی آواز میں بڑی امی سے کہا۔

"اچھا، آؤ۔" انہوں نے اسے جواب دے کر ودیع کو دیکھا۔

اب ان کی آواز اور چہرے سے تھکان مترشح تھی۔ نیند بھی اب گھیرے تھی لیکن نو سال کے انتظار کے بعد ملنے والی یہ خوشی، سب پر بھاری ثابت ہو رہی تھی۔

"آپ بھی سو جائیں اب بڑی امی! ورنہ صبح طبیعت زیادہ خراب ہوجائے گی۔"

اب کے اس نے اونچی آواز میں کہا۔ ودیع میز کے پاس آیا اور اس نے ادھر جا کر جھوٹے برتن سنک میں رکھے۔ "صبح بات کریں گی امی! آپ آرام کریں، میڈیسن لی آپ نے؟"

"ہاں ہاں لے لی تھی، تم بھی سو جاؤ، اتنے لمبے سفر نے تھکا دیا ہوگا، آؤ۔"

وہ اسے تنہا چھوڑنے تیار نہ تھیں، ساتھ میں لے کر باورچی خانے سے نکلیں۔ انہیں ان کے کمرے کے دروازے تک چھوڑنے کے بعد وہ واپس ہال میں آیا۔ باورچی خانے سے آرہی آوازیں اس کے اب بھی ادھر ہی ہونے کا اعلان تھیں۔ وہ اس کے انتظار میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

یہیں اس ہال میں اس نے اسے آخری بار دیکھا تھا۔ سب گھر والوں کے ساتھ چچی کے پیچھے کھڑی بیس سال کی طوبیٰ، اس دن باقیوں کے مقابلے میں زیادہ افسردہ اور دکھی تھی۔

ہر کوئی آناً فاناً عقد اور اس کی رخصت پر حیران سا تھا۔ اتنی یکا یک تبدیلیاں اور فیصلوں حیرانی ہر کسی کو تھی لیکن اس نے اسے سب سے چھپ کر اس بری طرح ،روتے تڑپتے پہلی دفعہ دیکھا تھا اور اس منظر نے اس کا دل توڑ دیا تھا۔ وہ تو جانے سے پہلے اسے کہنا چاہتا تھا کہ ابا کے فیصلے نے کیسے سب الجھا دیا ہے مگر اس کے بعد، اس وضاحت اور صفائی کی ضرورت ہی کہاں رہ گئی تھی۔ وہ بہت ٹوٹ کے گھر سے نکلا تھا۔

''اسے اب بھی اپنے بڑے ابا پر پورا بھروسا ہوگا۔'' جانے سے پہلے اس کے اداس چہرے سے نگاہ ہٹاتے ہوئے اس نے افسردگی سوچا تھا۔

اپنے شوق اور خواب کی جو قیمت وہ ادا کر کے جا رہا تھا، اس نے اس سے سب چھین لیا تھا، وہ خالی اور کنگال تھا اور اس سارے خالی پن میں ایک ضد براجمان ہوگئی تھی۔

اسے اپنے سخت مزاج اور ظالم باپ کو سبق سکھانا تھا۔ آہٹ پر وہ خیالوں سے باہر آیا۔ وہ اسے دیکھ کر صوفے کے پیچھے ہی رک گئی تھی۔ اس نے اٹھ کر رخ اس کی طرف کیا۔

''باقی سب کہاں ہیں؟'' گھر میں محض تین افراد کی موجودگی میں اس کا سوال مناسب تھا۔

''خولہ بھابھی اپنی امی کے یہاں ہیں، ثاقب بھائی انہیں لینے گئے ہیں، شہاب بھائی اب ساتھ نہیں رہتے، طلال کی جاب پونا میں ہے، امی آج کل اس کے پاس ہیں۔''

اس نے ایک سانس میں ساری تفصیل بتا دی۔

''اچھا۔''

اس کے اچھا میں اپنے لیے ہی اچنبھا تھا کہ یہ سب تو وہ جانتا تھا پھر جانے کیوں، اس وقت بھولے بیٹھا تھا۔ اس نے گیٹ مقفل نہیں کیا تھا، وہ اسی کام سے جا رہی تھی کہ ہال میں اسے دیکھ کر رکنا پڑا تھا۔

''مجھے آئیڈیا نہیں تھا، اس لیے امی کے کہنے پر اپنے پرانے روم میں چلا گیا۔''

وہ ٹھہر ٹھہر کے کہہ رہا تھا۔ درمیان کے نو سال تکلف اور اجنبیت بن کہ جو کھڑے تھے۔ اس سے پہلے کے وہ معذرت کرتا طوبیٰ نے درمیان میں ہی اس کی بات منقطع کر دی۔

''ہال کے بعد پہلے روم میں چلے جائیں۔''

وہ کہہ کر باہر چلی گئی۔

ودیع نے وہیں سے اسے گیٹ پر قفل لگاتے دیکھا اور اس کے واپس آنے سے پہلے ہی اپنا بیگ لینے چلا گیا۔

طوبیٰ کے بتائے کمرے میں آ کر اس نے بتی بجھائی اور پلنگ پر گر گیا۔ بے شمار سوچیں تھیں، ساتھ ہی 'جیٹ لیگ' بھی، وہ ساری رات جاگتا رہا۔ آج رات نیند طوبیٰ کو بھی نہیں آئی تھی۔

☆☆☆

گزشتہ شب ہی بڑی امی سب کو فون کھڑکا چکی تھیں، اس لیے اگلی صبح اس نے خود کو مہمانوں کے لیے تیار کر لیا تھا۔

چوں کہ ثاقب بھائی کا ریزرویشن کل شام کی ٹرین کا تھا، سو وہ سب سے پہلے صبح صبح بھابھی اور بچوں کے ساتھ پہنچ گئے۔ تب ودیع سو رہا تھا۔

''اکیلا آیا ہے؟'' خولہ بھابھی کے سوال میں چھپا تجسس اسے خوب پتا تھا۔

''جی۔''

''بڑے ابا کیسے ملے اس سے؟''

''نارمل۔''

''نارمل کیا ہوتا ہے؟'' انہیں اس کا جواب اچھا نہیں لگا۔ انہیں ہر بات مفصل چاہیے ہوتی تھی پھر یہ تو بڑا خاص موقع تھا، جو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ پانے کا انہیں بڑا افسوس ہو رہا تھا۔

''وہ غصہ نہیں ہوئے نہ کوئی طنز اور شکایتیں کیں، دونوں نے دعا سلام کی اور حال احوال

پوچھا۔
"بس؟" ان کی آواز میں مایوسی تھی۔
"ہوں۔" اس نے پراٹھا توے پر ڈالا اور سرد نرم سی چادر، اپنے اوپر پڑتے ہی گرم تیل کی چھینٹیں نکل گئیں۔
"بڑی امی نے تو پوچھا ہوگا، اتنے سالوں سے اکیلا ہے یا۔" انہوں نے معنی خیز انداز میں چپ ہو کے اصل سوال، لفظوں میں ڈھالے بنا ہی پوچھ لیا۔
"مجھے نہیں پتا بھابھی! بڑی امی اور ودیع کی کیا بات ہوئی۔" خولہ بھابھی اکثر ہی اس کی برداشت آزمائی کیں لیکن آج اسے تحمل اپنانے کے لیے بہت جتن کرنے پڑ رہے تھے۔
"وہ یہیں ہیں، آپ خود ہی ان سے سب پوچھ لیجیے گا۔" اس نے چمٹے سے پکڑ کر پراٹھا پلٹا۔
"میں کیوں پوچھوں؟" وہ بدک کر پیچھے ہوئیں۔ "گھر والوں کو فکر ہونی چاہیے جب انہیں نہیں پڑی تو میں کون؟" وہ یوں ہی موقع دیکھ کر گھر والی اور پرائی ہوتی رہتی تھیں۔
ایسا نہیں تھا کہ نو سال سے وہ رشتے ناتے توڑ بیٹھا تھا اور اس کے بارے میں کسی کو کچھ علم نہ تھا۔ وہ اپنی ماں اور بھائیوں سے بات کرتا تھا لیکن خولہ بھابھی کا انداز اور سوال ایسے ہی تھے، گویا اب اس کے آنے پر ہی اس کے بارے میں سب اور سچ معلوم ہوگا۔
سب کے ناشتے ہی چل رہے تھے کہ امی بھی آ گئیں۔ ان کے واقعی خوشی کے مارے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔

☆☆☆

وہ بڑے ابا کا ناشتہ لے کر گئی تو وہ معمول کی طرح اخبار پڑھ رہے تھے۔ اس نے پھپھوں والی میز پر ٹرے رکھی اور انہوں نے اخبار اسے تھما دیا۔ اخبار رکھ کے اس نے میز کے پیسے اس طرح پلنگ کے نیچے کیے کہ ٹرے اب ان کے سامنے تھی۔
"ناشتے سے پہلے والی ٹیبلیٹ لے لی تھی؟" اس نے روز والا سوال دہرایا۔
"ہاں بیٹا! ودیع اٹھا؟" وہ جو تب سے سوچ رہی تھی کس طرح ودیع کی آمد پر ان کے خیالات کا اندازہ لگائے، انہوں نے خود ہی سوال پوچھ کر اسے حیران کر دیا۔
"نہیں۔" جلد ہی سنبھل کر اس نے جواب دیا۔
"ثاقب بھائی، خولہ بھابھی آ گئے ہیں اور امی بھی۔" وہ ناشتے کے بعد کی دوائیں نکالنے لگی۔
"آپ باہر چلیں گے کچھ دیر؟" اس نے ابلا انڈا چھیلتے بڑے ابا کو دیکھا۔ ان کے اندر کیا چل رہا ہے، اندازہ لگانا بڑا مشکل تھا۔
"ابھی نہیں، طلال بھی آیا ہے؟"
"نہیں، امی کو صبح بس میں بٹھا دیا تھا۔ ویسے اب امی عادی ہو گئی ہیں۔" اس نے دوائیوں کا ڈبہ بند کیا اور مٹھی کی ساری گولیاں ٹرے میں رکھی چھوٹی سی خالی پیالی میں ڈال دیں۔
وہ خاموشی سے ناشتہ کرنے لگے اور وہ پلنگ پر بکھرا سامان سمیٹنے لگی۔ سارے گھر میں وہ واحد ہستی تھی جسے انہوں نے کبھی ڈانٹا نہیں تھا، جس پر کوئی سختی نہیں کی تھی۔ جانے انہیں اپنی بھتیجی یتیم ہونے کی وجہ سے عزیز تھی یا پھر بیٹی ہونے کی وجہ سے۔ اللہ نے انہیں تین بیٹوں سے نوازا تھا، بیٹی نہیں دی تھی اور ان کی وجہ سے طوبیٰ نے بھی، اپنے ابا کی کمی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ طلال کے ساتھ بھی سخت تھے لیکن اس کے لیے سراپا شفقت اور محبت۔ بچپن میں شہاب بھائی اکثر اس بات پر اس سے لڑائی کرتے تھے۔ انہیں لگتا تھا وہ بس اس کے ساتھ سگی اولاد جیسا برتاؤ کرتے ہیں اور باقیوں کے ساتھ سوتیلا۔
"بڑے ابا سے پوچھوں، انہیں ودیع کا آنا کیسا لگا؟" اس نے کن انکھیوں سے انہیں دیکھا پھر فوراً ہی اپنا خیال رد کر دیا۔ مانا وہ ان سے ادھر ادھر کی باتیں کر لیتی تھی لیکن اتنی ہمت اب بھی نہیں آئی تھی۔
"تم جاؤ، کام ہوگا۔ میں دوائیاں لے لوں گا۔" انہوں نے اسے دیکھا۔
"جی۔" وہ باہر آ گئی۔

☆☆☆

ان کا دل اور پھیپھڑے بے حد کمزور ہو گئے تھے۔ دل کے جانے کون کون سے عارضے انہیں لاحق تھے۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا، جب تک یہ دوا اور علاج کی مدد سے دھڑکنے کے قابل ہے وہ جیتے رہیں گے۔ چند ماہ سے وہ اپنے کمرے تک محدود ہو کے رہ گئے تھے۔ ذرا سی جسمانی محنت سے وہ نڈھال ہو جاتے تھے، ان کا سانس پھول جاتا تھا۔ اس محنت میں زیادہ چلنا بھی شامل تھا۔ آخری بار جب ثاقب بھائی انہیں اسپتال لے کر گئے تو وہ بھی ان کے ہمراہ تھی اور وہیں ڈاکٹر کی باتیں سننے کے بعد، اس نے ودیع کو لکھا تھا۔ وہ اکثر سوچتی تھی کہ ان کی بیماری میں ودیع کی جدائی کا کتنا ہاتھ ہے۔ اس نے تو اپنی مستقل مزاجی یعنی ضد سے سب کو حیران کر دیا تھا۔ کسی نے نہیں سوچا تھا کہ وہ جائے گا تو واقعی پلٹ کر دیکھے گا بھی نہیں۔

اس کا آبائی وطن ایک چھوٹا سا دیہات تھا۔ تایا ابا اور ان کا خاندان اب بھی وہیں رہتے تھے۔ دادا پڑھے لکھے نہیں تھے، تایا ابا نے بھی چند جماعتیں پڑھی تھیں۔ دادا کی مختصر سی زمین پر کاشت کاری ایک بھرے پرے خاندان کے لیے ناکافی تھی۔ ان کے بیٹے بھی وہیں چھوٹے موٹے کام کرتے تھے۔ سب سے چھوٹا بیٹا جو بی اے کر پایا تھا، شہر میں نوکری کر رہا تھا لیکن اس کے بیوی بچے بھی گاؤں میں ہی ہوتے تھے۔

تایا ابا کے برعکس، بڑے ابا نے شہر آ کر پڑھائی جاری رکھی تھی۔ تعلیم کے حصول میں انہیں اپنے گھر سے کوئی سہارا ملا تھا نہ معاونت بلکہ اس کے لیے انہوں نے، بڑی پریشانیاں اور مشکلیں جھیلی تھیں۔ اس میں سب سے زیادہ مشکل، انہیں شہر کے طرز زندگی اور تعلیمی اداروں کے کام کاج سے ناواقفیت کی وجہ سے پیش آئی تھی۔ اپنے والد کی مرضی اور ناراضی کی پروا کیے بنا، وہ چھوٹے بھائی کو بھی اپنے ساتھ شہر لے آئے تھے۔ اس کے بعد بھی انہوں نے شادی بھلے والدین کی مرضی سے کی لیکن ان کے حکم اور خواہش کے باوجود، بیوی بچوں کو شہر میں اپنے ساتھ رکھا۔

دادا چاہتے تھے کہ وہ شہر میں نوکری کریں اور بہو اور پوتے ان کے ساتھ، گاؤں میں رہیں مگر وہ بچوں کی تعلیم اور بہتر مستقبل کے لیے کوئی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہ تھے۔

اسی وجہ سے وہ گھر میں سب کے لیے ایک سخت گیر قسم کے سربراہ بن گئے تھے۔ بچوں کو سہولیات ساری دیں لیکن رعایت، مروت ذرا بھی نہیں۔ انہیں اسکول میں پڑھائی کے علاوہ دیگر سرگرمیوں میں حصہ لینے کی اجازت نہیں تھی۔ اسکول کے بعد محلے میں جا کر کھیلنے کا قلیل سا وقت معین تھا۔ جس میں بچے کبھی مطمئن نہیں ہو پاتے تھے۔ ایک دوسرے کو سمجھنے جاننے کا جو فقدان، ان میں اور ان کے ابا میں تھا وہی ان میں اور ان کے بچوں میں بھی منتقل ہو گیا تھا لیکن ان کی نظریں جس ہدف پر تھیں اس نے دیگر مناظر پر توجہ پڑنے ہی نہیں دی۔

امتحانوں کے بعد اچھے نتائج، انہوں نے بچوں کی زندگی کا یہ ہی ایک مقصد طے کر رکھا تھا۔ وہ خود ہی سب کچھ دیکھتے تھے۔ 'اوپن ڈے' ہوتا یا 'پی ٹی اے' جہاں سب بچے ماؤں کے ساتھ آتے، ان کے ساتھ ہمیشہ بڑے ابا ہوتے۔ بڑی امی زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ انگریزی وہ الفابیٹس کی حد تک جانتی تھیں۔ نہ انہوں نے کبھی بچوں کی پڑھائی اور اسکول کے معاملے میں شامل ہونے کی کوشش کی نہ بڑے ابا نے انہیں موقع دیا۔ اسکول کے بعد بھی بچوں کے مضامین کیا ہوں گے، کس میدان وہ اپنی عملی اور پیشہ ورانہ زندگی شروع کریں گے، اور اس کے لیے ضروری تعلیمی لیاقت کی تکمیل، کالج کا انتخاب، سارے فیصلے انہوں نے ہی کیے تھے۔

ودیع کو اپنے نمبروں کی بنا پر ممبئی کے کالج میں داخلہ مل رہا تھا لیکن بڑے ابا دونوں بڑوں کی طرح اسے بھی اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہتے تھے۔ اس سے پہلے اس کے اندر باپ کی سختیوں کا ڈر تھا، ان کا طریقہ کار ناپسند تھا، غصہ بھی آتا تھا لیکن ایسے ممبئی جانے نہ دینے پر، اس کے اندر بغاوت پنپنے لگی تھی۔

چھوٹا بھائی چوں کہ ان کے ساتھ ہی رہتا تھا

اس لیے، اپنے بیٹوں جیسی سختی وہ طلال پر بھی کرتے تھے جو بھائی کی وفات کے بعد بھی جوں کی توں قائم رہی۔ بس ایک طوبیٰ تھی جسے بچپن سے انہوں نے خاص شفقت سے نوازا تھا۔ وہ سب سے چھوٹی اور گھر کی واحد بیٹی تھی، پھر باپ کی وفات کے بعد تو وہ انہیں اور عزیز ہوگئی۔ اس کے لیے ان کا دل اور رویہ ہمیشہ نرم ہی رہا تھا۔ کچھ وہ بھی مزاجاً ذمہ دار اور تابع دار تھی۔ بڑوں کے ساتھ بڑے ابا کا رویہ دیکھ کر ہی اس نے ان کی پسند والے، سارے کام اپنا لیے تھے، انہیں شکایت کا موقع کبھی نہیں دیا تھا۔

☆☆☆

بڑے ابا کی سلطنت، ان کی مرضی اور حکم کے مطابق ٹھیک ٹھاک چل رہی تھی۔ ثاقب بھائی اور شہاب بھائی اچھی نوکری کے بعد شادی شدہ ہو کر باپ بھی بن گئے تھے۔

ان سب کو زندگی میں کامیاب اور مصروف دیکھ کر ہر کوئی، اس کا سہرا بڑے ابا کے سر باندھتا تھا۔ موازنے اور مقابلے کے لیے سب کے پاس گاؤں میں برسوں پہلے جیسے، دگرگوں حالات میں ہی جی رہا تایا ابا کا خاندان تھا۔

طلال اور ودیع کی نوکری کے بعد گھر میں ان دونوں کی شادی کے چرچے ہونے لگے تھے کہ تب ہی اچانک ودیع نے شوشا چھوڑا کہ اسے، بیرون ملک ملازمت مل گئی ہے اور وہ جا رہا ہے۔ بڑے ابا نے صاف کہہ دیا۔

"کوئی کہیں نہیں جا رہا" مگر اس دفعہ گھر میں بغاوت اور حکم عدولی کی فضا قائم ہوئی تھی۔

ودیع باپ کے سامنے ڈٹ گیا کہ وہ تو جائے گا ہی چاہے اسے گھر سے نکال دیا جائے۔ یہ گھر میں آیا پہلا طوفان تھا۔

جہاں در و دیوار نے ہمیشہ، بڑے ابا کی گرج دار آواز ہی سنی تھی، آج وہ بھی ایک توانا ضدی لہجے پر حیران تھے۔ اس کی برداشت اب ختم ہوگئی تھی، اس کے پر اڑان کے قابل ہوئے تو اسے اب اپنی مرضی کا آسمان چاہیے تھا۔ وہ باپ کی قید اور پنجرے سے دور ہونا چاہتا تھا۔

اس نے اپنے تئیں سارے انتظامات کر لیے تھے اب ان کے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔

☆☆☆

اس کے ہوش اس وقت ٹھکانے آئے جب پاسپورٹ نہیں ملا۔ پہلا ہی شک ابا پر گیا اور اسے یقین نہیں آیا، اس کا باپ ایسی حرکت بھی کر سکتا ہے۔ ماں ہمیشہ کی طرح اس معاملے میں بھی بے بس تھی۔

جب پاسپورٹ کی بازیابی کے لیے وہ ان سے بحث کر رہا تھا تو انہوں نے، اپنے ازلی تحکمانہ اور بے لچک لہجے میں شرط رکھی۔

"پاسپورٹ چاہتے ہو تو جانے سے پہلے طوبیٰ سے نکاح کر لو۔"

☆☆☆

جب وہ سو کر اٹھا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ ضروریات سے فارغ ہو کر باہر آیا تو اس کا انتظار کرتے کرتے سب نے کھانا کھا لیا تھا۔

ثاقب بھائی اور چچی، یعنی طوبیٰ کی امی بڑی گرم جوشی سے ملیں۔ بچے اجنبی مہمان کی طرح اسے سلام کر کے تہذیب کے دائرے میں کھڑے تھے۔ خولہ بھابھی کی کریدتی، تلاشتی نگاہیں اسے محسوس ہو رہی تھیں۔

"کتنے بڑے ہو گئے ہیں سب!" وہ اپنے قد کے برابر پہنچ چکے عبداللہ اور عبدالرافع کو دیکھ کر حیران تھا۔

"بڑے دن بعد بھی تو دیکھا ہے تم نے۔" چچی کی بات پر وہ سر ہلا کے مسکرا دیا۔

وہ ان سے پڑھائی اور ان کی دلچسپیوں کے بارے میں پوچھنے لگا۔

"اب تم کھانا بھی کھا لو" بڑی امی سے زیادہ دیر صبر نہیں ہوا تو درمیان میں ٹوک دیا۔

"دوپہر کے کھانے کا وقت بھی گزر چکا ہے اب تو۔"

"کچھ دن نیند مجھے وہاں کے ٹائم پر ہی آئے گی امی، ایڈجسٹ ہونے میں تھوڑا وقت لگے گا۔"

اس نے انہیں سمجھایا۔
"پہلے کھالو پھر باتیں کرنا۔" وہ کھڑی ہوئیں تو وہ بھی اٹھ گیا۔
"آؤ خولہ! اسے کھانا دے دو۔" وہیں بیٹھی بہو سے کہتی اسے لیے باورچی خانے میں آئیں۔
کچھ دیر بعد خولہ تو نہیں طوبیٰ اندر آئی۔ خولہ نے اسے بھیجا تھا کہ بڑی امی تمہیں بلا رہی ہیں اور ان دونوں کو دیکھ کر وہ سمجھ گئی۔ خولہ ایسی ہی تھیں۔
"سو گئے؟" اسے دیکھتے ہی بڑی امی نے دریافت کیا۔
"نہیں، جاگ رہے ہیں۔" وہ دراز کھول کر پلیٹیں نکالنے لگی۔
"کچھ دن سے دوپہر میں بالکل نہیں سوتے، پہلے تو اچھی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی نیند لے لیتے تھے۔" وہ ودیع سے کہنے لگیں۔
"ان کے دوست آئے تھے کچھ دن پہلے تو کسی اچھے ڈاکٹر کا بتا رہے تھے، کہہ رہے تھے ایک بار اسے بھی دکھا لینا چاہیے۔ اب تم آئے ہو تو لے جانا لیکن۔"
جانے ان کے پاس ساری باتیں شوہر کی ہی تھیں یا یہ ان کی شعوری کوشش تھی باپ کی بیماری، تکالیف یا تھکن اور کمزور حالت کے ذکر سے اس کا دل پگھلانے کی۔
اسے ماں کی معصومیت پر بڑا پیار آرہا تھا۔ ان کی ساری عمر ہی اس کوشش میں گزری تھی، شوہر کی طرف سے بچوں کا دل صاف رکھیں اور بچوں کی طرف سے شوہر کا۔ وہ جانتا تھا وہ ایسا ہی کچھ ابا سے بھی کہہ رہی ہوں گی۔
طوبیٰ نے کھانا میز پر رکھا اور چلی گئی۔
کھانا ختم ہوا ہی تھا کہ شہاب بھائی، بیوی بچوں کے ساتھ آگئے۔ کل جو گھر سناٹے میں ڈوبا تھا آج وہاں آوازیں ہی آوازیں تھیں۔ بہت دیر تک باتیں کرنے کے بعد سب کچھ دیر آرام کی غرض سے کمروں میں چلے گئے۔ وہ چوں کہ ذرا دیر پہلے ہی سو کر اٹھا تھا اس لیے کچھ دیر کمرے میں وقت گزارنے کے بعد پھر باہر آگیا۔
شہاب بھائی اور بھابھی ثاقب بھائی کے ساتھ اوپر گئے تھے۔ نیچے ایک بار پھر خاموشی کا راج تھا۔ دھیمی آوازوں کے تعاقب میں وہ ہال کے دروازے پر آیا۔ طوبیٰ پورچ میں بیٹھی دانیہ کے بال بنا رہی تھی۔
"آنٹی! مجھے ناں،"
"دانیہ اگر تم یونہی ہلتی رہیں تو میں نہیں بناؤں گی چوٹی۔" اسے 'فرنچ بریڈ' کا شوق تھا۔ جب آنی اس سے بنواتی اور ناہید بھابھی کا کہنا تھا کہ اس کے بعد وہ دو تین دن تک بال ہی کھولنے نہیں دیتی تھی۔
"میں کہاں ہل رہی ہوں؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔
"بات نہیں کرو بس۔" منہ کھلتے ہی زبان کے ساتھ اس کا سارا جسم متحرک ہو جاتا تھا۔
"مجھے ایک بات کی ٹینشن ہے، آپ وہ دور کر دیں تو پھر میں کچھ نہیں بولوں گی۔"
"تمہیں کاہے کی ٹینشن؟" وہ دھیرے سے ہنسی۔
"کیا آپ ان انکل کے ساتھ چلی جائیں گی جو آئے ہیں؟" اس کے ہاتھ رک گئے۔ دانیہ نے اسے پہلی بار دیکھا تھا اس لیے باقیوں کے مقابلے میں اس کے لیے یہ چاچو قطعی اجنبی تھے۔
"پھر میرے بال کون بنائے گا، مما کو تو آتی ہی نہیں، آپ کسی کو سکھا کے جائیں۔ سب سے اچھا تو یہ ہوگا کہ جائیں ہی نہیں آپ۔"
"میرے جانے کی بات کس نے بتائی تمہیں؟" اس نے آہستہ سے دوبارہ اس کے بالوں کی لٹیں ایک دوسرے میں پھنسائیں اور دھیرے سے پوچھا۔
"کسی نے نہیں۔ میں نے مما اور بڑی آنٹی کی بات سنی تھی، انکل آپ کے ہزبینڈ ہیں آپ نے یہ بتایا کیوں نہیں مجھے؟" طوبیٰ جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگی۔
"بتائیں ناں، کیوں نہیں بتایا؟" دانیہ نے اس کی خاموشی پر اصرار کیا۔
"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"یعنی وہ آپ کے ہزبینڈ نہیں ہیں اور آپ ان کے ساتھ نہیں جائیں گی۔" وہ خوش ہوگئی۔

"پھر ممانے کیوں کہا۔ میں بتادوں گی انہیں۔"

"تم کسی سے کچھ نہیں کہو گی اور خدارا اب خاموش رہو۔"

"طوبیٰ آنٹی!" ذرا توقف کے بعد وہ منمنائی۔ "میں کنفیوز ہوگئی، انکل آپ کے ہزبینڈ ہیں یا نہیں، اتنا بتادیں۔"

"اللہ جانے یہ آج کل کے بچے، کبھی 'بچے' ہوتے بھی ہیں یا نہیں۔" طوبیٰ نے دل میں سوچا۔

"جاؤ۔ بن گئے تمہارے بال۔" اس نے آخر کے بچے بالوں کے گروہیئر بینڈ کو بل دیے اور پیٹھ تھپتھپا کے اسے جانے کو کہا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی اور رخ اس کی طرف کیا۔ کچھ کہنے جارہی تھی کہ پیچھے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے چونک گئی۔ طوبیٰ نے بھی مڑ کے دیکھا اور پھر جھٹ آگے دیکھنے لگی۔

"آپ ہی بتادیں انکل۔۔" دانیہ نے ودیع کو دیکھتے ہوئے پوچھا اور طوبیٰ نے اس کا فراک کھینچ کر اسے روکنے کی ناکام کوشش کی۔

"کیا آپ آنٹی کے ہزبینڈ ہیں اور انہیں لینے آئے ہیں؟"

جو کام بڑے بڑے نہیں کر پائے تھے، دانیہ نے کر دکھایا۔ طوبیٰ اس کی طرف پشت کیے ساکت بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اس نے کہاں سے دانیہ کی باتیں سنی ہیں؟ اور ودیع اس افتاد پر یوں کھڑا تھا مانو ہیں سے تیز رفتار بال آکے سیدھا، سر پر لگی ہو اور جھنجھنایا دماغ سمجھنے سے قاصر تھا کہ کیا ہورہا ہے۔

اس نے کبھی سوچا نہیں تھا، اسے اس سادہ اور سیدھے سے سوال کا جواب دینا پڑے گا وہ بھی سات آٹھ سال کی بچی کو جو جواب طلب نظروں سے مسلسل اسے دیکھے جارہی تھی۔

"ہوں۔" اس نے اقرار میں سر ہلا کے ہنکار بھرا۔ دانیہ کا چہرہ اتر گیا۔

طوبیٰ کھڑی ہوئی، دانیہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے گھسیٹتی ودیع کے بازو سے گزرتی اندر چلی گئی۔ دانیہ کو یہ سوال جواب کسی سے نہ کہنے کی ہدایت دینا فضول تھا۔ اسے چھوڑ کر وہ اپنے کمرے میں آگئی۔

"ہوں۔" سارے کمرے میں جیسے ودیع کی سنجیدہ آواز پھیلی تھی۔

"پاگل مت بنو۔ بھلا دانیہ کو اور کیا کہا جاسکتا تھا، اس نے نہیں کہا ہے نہ ہاں۔" وہ خود کو سمجھانے لگی۔

وہ دل و جان سے اس 'ہوں' کو اقرار ماننا چاہتی تھی لیکن خود حقیقت شناس ہونے کا احساس اسے روک رہا تھا۔

ہال میں تنہا کرسی پر بیٹھا ودیع اس کے اس طرح جانے کو 'ڈی کوڈ' کررہا تھا۔

"کیا اسے میرا "ہاں" کہنا اچھا نہیں لگا؟"

☆☆☆

گھر میں وہ بھی ملنے آرہے تھے جو اسے یاد نہیں تھے۔ اسے سب کے ساتھ بیٹھ کر ان سب سوالوں کے جواب دہرانے پڑتے جو پردیس میں تنہا رہنے والے سے پوچھے جاتے ہیں۔ کچھ تو صرف اس لیے ملنے آتے تاکہ وہ انہیں یا ان کے کسی سگے کو بھی باہر بلالیں۔ کچھ کو وہاں جانے، رہنے اور سروائیو کرنے کی ساری تفصیل درکار ہوتی تھی۔ اسے لگنے لگا تھا وہ پردیس جا کر کام کرنے والوں کے لیے کوئی کنسلٹنگ فرم چلا رہا ہے۔

اس کے دوستوں نے بھی خبر ملنے پر اس سے رابطہ کیا تھا۔ وہ ان سے ملنے گھر سے نکلا تو دیکھا اس کا شہر بھی بدل گیا تھا۔ نو سال بعد کئی نئی جگہیں، نئی چیزیں آگئی تھیں اور کچھ پرانی چیزیں اب ندارد تھیں۔ شہر کا چپہ چپہ گھومتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اسے اپنا شہر کتنا پیارا تھا جو سیرابی اب اس کے اندر اتری تھی اس نے اسے اپنے شہر کی اہمیت کا احساس کرایا تھا۔

"تو کیا میں اتنے سالوں سے محسوس کرنے کی حس کھو بیٹھا تھا؟" ہر احساس پر وہ خود سے پوچھ رہا تھا۔

"یا مجھ پر صرف دو ہی احساس حاوی تھے؟"

ایک باپ سے جڑا تھا اور ایک طوبیٰ سے۔

شام میں ثاقب بھائی آئے تو سموسے کے لفافے ان کے ہاتھ میں تھے۔

"تمہارے فیورٹ سموسے۔" انہوں نے طوبیٰ کو آواز دی اور لفافے اسے تھما دیے۔

"تم نکالو، تب تک میں چینج کر کے آتا ہوں۔"

اسے ان سموسوں سے کیا کیا نہیں یاد آ گیا تھا۔

☆☆☆

ابا دفتر کے کسی کام سے دوسرے شہر گئے تھے اور اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ سارا دن پتنگ بازی میں لگا رہا تھا۔ پتنگ اڑاتے اور لوٹتے ہوئے وہ گھر سے دور جانے کہاں کہاں بھٹکتا رہا اور جب اندھیرا ہونے کے بعد فون کی 'ڈیڈ بیٹری' کے ساتھ رات کو گھر پہنچا تو اس کے 'ڈیڈ' ہونے کا سامان سامنے موجود تھا۔ ابا شام سے گھر آ گئے تھے اور بیلٹ ہاتھ میں تھامے بے قراری سے اس کے استقبال کے لیے گیٹ پر ہی ٹہل رہے تھے۔ ان پر نظر پڑتے ہی ہاتھ سے پتنگوں اور مانجھے کے ساتھ طوطے بھی اڑ گئے اور ابا اسے عمر بھر کے لیے دوبارہ ایسی عیاشی سے باز رکھنے پر اڑ گئے۔ اس دن بالآخر امی کی مداخلت پر اس کی دھنائی رکی تھی۔

وہ دن بھر کی بھاگ دوڑ سے پہلے ہی تھکا ہوا تھا رہی سہی کسر پٹائی نے پوری کر دی۔ جسم کا رواں رواں درد سے چیخ رہا تھا لیکن وہ بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ اس میں رونے اور دہائی دینے کا بھی دم نہیں بچا تھا۔ مار بھی بڑے دنوں بعد پڑی تھی ورنہ نویں جماعت کے بعد ثاقب بھائی اور شہاب بھائی کی روایت قائم رکھتے ہوئے ابا نے اسے بھی پیٹنا چھوڑ دیا تھا۔

"اسی لیے تمہیں روک رہا تھا کہ مت جاؤ۔ بڑے ابا نہ بھی آتے شام میں تو انہیں کسی نہ کسی سے پتا چل ہی جانا تھا۔" طلال افسوس سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"پلیز، چپ رہو اس وقت مجھ میں سننے کی تو دور مرنے کی بھی ہمت نہیں ہے۔" اس نے بے زاری سے بدقت کہا۔ اسے اس وقت زندگی اور دنیا کی ہر چیز سے اکتاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

تب ہی ہلکے سے دروازہ کھول کے طوبیٰ نے اندر جھانکا۔ اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا اور دعا کی کہ وہ چلی جائے۔ طوبیٰ نے اندر داخل ہو کے دروازہ بند کیا۔ اس کے ہاتھ میں ڈھکی ہوئی پلیٹ تھی۔ اپنے پسندیدہ سموسوں کی خوشبو نتھنوں سے ٹکراتے ہی وہ دھن اور پٹائی کی شرمندگی سب بھول گیا۔ اچانک اسے یاد آیا وہ کتنا بھوکا ہے۔ وہ کھانا سوچتے سوچتے ہی گھر آیا تھا کہ ہاتھ دھوتے ہی باورچی خانے میں گھسے گا۔

طوبیٰ نے خاموشی سے پلیٹ بستر پر اس کے سامنے رکھی اور پھر اوپر ڈھکی پلیٹ ہٹا دی۔ وہ سموسوں پر جھپٹا ہی تھا کہ طلال نے ہاتھ پر چپت ماری۔

"ہاتھ تو دھو لو۔" وہ پھرتی سے اٹھ کر ہاتھ دھونے بھاگا۔ اس پل وہ سب بھول گیا تھا۔

"یہ کون لایا؟" طلال نے کچھ تعجب سے پوچھا۔

"بڑے ابا کے آنے کے بعد امی کے ساتھ بازار گئی تھی، واپسی میں اس 'شرما جی' کی طرف سے گزرے تو لے لیے۔" اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ امی کو اس راستے سے لائی تھی۔

"تھینک یو۔ تھینک یو۔" اس نے چادر پر پھیر کر ہاتھ خشک کیے اور سموسہ اٹھایا۔ اس کا حال یوں تھا مانو تارک الدنیا ہونے کا فیصلہ کرتے ہی کسی نے اس کے آگے زمانے بھر کی رنگینیاں رکھ دی ہوں۔

"اس احسان کے بدلے تم میری جان بھی مانگ لو کبھی تو دے دوں گا۔" اس نے اتنا بڑا لقمہ توڑا تھا کہ بھرے منہ سے بمشکل بول سکا۔

"بس۔ سموسوں جتنی قیمت ہے تمہاری جان کی؟" طلال نے مسخرے سے کہا۔

"یہ عام سموسے ہیں نہ عام پچویشن۔ اس وقت ان کی قیمت اور قدر کا اندازہ اس بات سے لگا لو کہ میں اس کے بدلے طوبیٰ کو اپنی جان دینے کو تیار

ہوں۔" وہ کسی قحط زدہ بھوکے کی طرح کھا رہا تھا۔

"مجھے نہیں چاہیے کسی کی جان۔" اس نے گھبرا کے اس تیزی سے کہا جیسے وہ اپنی شہ رگ پر چھری رکھے ہو۔

"طوبیٰ!" اس نے نوالہ حلق سے اتار دیے ہوئے ہاتھ روکا۔

"تم یہ سموسے یاد دلا کر مجھ سے کچھ بھی منوا سکتی ہو، آئی پرامس، انکار نہیں کروں گا۔"

"انکار نہیں کروں گا۔۔" طلال نے اس کی نقل اتاری۔

"پیچھے سے بڑے ابا کی آواز آئے گی اور کون طوبیٰ، کون سے سموسے، کیسا پرامس!" طلال نے آگے آ کر ایک سموسہ اٹھایا۔

"تم آزما لینا طوبیٰ! ان سموسوں کی قسم۔" اس نے طلال کو گھورتے ہوئے پلیٹ اس کی پہنچ سے دور کی۔

طوبیٰ نے ٹرے میز پر رکھی تو وہ ماضی کے منظر سے باہر آیا۔ وہ سنجیدہ سی شکل لیے واپس جا رہی تھی۔

"تمہیں بھی تو سب یاد آ رہا ہوگا۔" اس نے اسے باورچی خانے میں غائب ہوتے دیکھا۔

دونوں نے ہی اب تک اس چند سطری پیغام کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس نے ٹرے میں رکھے تازہ سموسوں کو دیکھا۔ اس کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں لیکن اس وقت اس واقعے کے علاوہ اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔

"ضروری نہیں وہ میسج ملا ہی ہو۔ کیا پتا وہ نمبر اب کسی اور کے یوز میں ہو اور اسے ایک انجان نمبر سے آئے عجیب سے میسج میں کوئی دلچسپی نہ ہو۔" اندر وہ خود کو سمجھا رہی تھی۔

"اگر واپس آنے کی وجہ وہ میسج ہوتا تو اب تک کچھ تو کہا ہوتا۔"

دل یقین کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس پیغام کی وجہ سے آیا ہے لیکن ذہن کو سارے شواہد اس کے خلاف محسوس ہو رہے تھے۔

☆☆☆

اسے صبح چار پانچ بجے کے بعد ہی نیند آتی تھی۔ وہ ٹی وی دیکھنے کے ارادے سے ہال میں آیا تھا اور وہاں طوبیٰ کو دیکھتے ہی قدم رک گئے۔ اسے دیکھتے ہی وہ جانے لگی تھی کہ ودیع نے پکارا۔

"طوبیٰ!" اسے رک کر اسے دیکھنا پڑا۔

"بیٹھو۔" آگے جا کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"تم سے بات ہی نہیں ہو پائی ابھی تک۔" طوبیٰ کو لگا وہ لمحہ آ گیا ہے جس سے وہ بچ رہی تھی۔ سست قدم اٹھاتی وہ صوفے کے دوسرے کنارے پر بیٹھی اور پاس پڑا کشن اٹھا کے گود میں رکھ لیا۔

ان کا بچپن ساتھ گزرا تھا۔ اسکول بھی ایک ہی تھا تاہم ان میں کوئی خاص یا غیر معمولی قربت نہیں تھی۔ ثاقب بھائی اور شہاب بھائی کی نسبت وہ طلال اور ودیع کے ساتھ زیادہ وقت گزارتی تھی۔ عمر میں بڑا ہونے کے باوجود وہ طلال کو نام سے بلاتی تھی۔ اول اول سب نے اسے 'بڑے ابا غصہ ہوں گے' کہہ کر سمجھایا، ڈرایا لیکن جب بڑے ابا نے کوئی اعتراض نہیں کیا تو اس کی عادت پکی ہو گئی۔ پھر وہ طلال کی طرح ودیع کو بھی نام سے مخاطب کرنے لگی۔

جیسے ایک گھر میں رہنے والے بہن بھائیوں اور کزنز کے تعلقات ہوتے ہیں، ان کے بھی ویسے ہی تھے۔ وہ اکثر طلال اور اسے بڑے ابا کے عتاب سے بچا لیا کرتی، ان کے لیے بہانے بنا لیتی اور کبھی جھوٹ بھی بول دیتی تھی۔ بڑے ابا گھر میں ہوتے تو سب ہی اپنی جگہ خاموشی سے کام میں یا پڑھائی میں لگے ہوتے تھے لیکن ان کی غیر موجودگی میں وہ تینوں اکثر ساتھ بیٹھ کر پڑھتے، گیمیں لگاتے یا پھر ٹی وی پر کچھ دیکھ لیتے تھے۔

وہ چاہتا تھا، دونوں درمیان کے نو سال بھلا کر بات کریں۔ اگر وہ اس سے کترا رہی تھی تو یہ اس کا مسئلہ تھا، اسے ہی حل کرنا تھا۔ یہ ہی سوچ کر اس نے

آج پہل کی تھی۔

"تم نے آگے یونیورسٹی جوائن نہیں کی؟" اس نے اپنے جانے کے وقت سے بات شروع کی تھی۔ اُن دِنوں اس نے ہی زور وشور سے اسے بتایا تھا کہ اب وہ ماسٹرز کے لیے یونی ورسٹی کیمپس جایا کرے گی۔

"نہیں۔" وہ سر جھکا کے انگلی میں پڑی انگوٹھی گھمانے لگی۔

"میری وجہ سے؟" وہ ایسی دوٹوک بات کبھی نہیں کرتا تھا جیسی اس وقت کر رہا تھا۔ اصل 'وجہ' کسی کی زبان پر نہیں آ رہی تھی۔

"ہاں۔" وہ بھی ایسی ایمان دار پہلے نہ تھی۔

"کچھ وقت بعد تو کنٹی نیو کر سکتی تھیں۔" وہ مسلسل اسے دیکھ رہا تھا۔

"وقت گزرنے کے بعد تو سب کچھ اور مشکل ہوتا گیا۔" اچانک اس نے سر اونچا کیا۔ اسے بھی چھپن چھپائی والا کھیل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ ٹین ایجرز نہیں تھے، گزرے وقت نے انہیں پختگی اور بالیدگی عطا کی تھی اور دو سلجھے اور سمجھ دار انسانوں کو اس عجیب اور بے آرام کرنے والی صورت حال سے گفتگو کا پل ہی نکال سکتا تھا۔

"اور تمہارے لیے؟ وقت گزرنے کے ساتھ تمہیں آسانیاں ملیں؟" طوبیٰ نے پوچھا۔

"میں آسانیوں کی تلاش میں نہیں گیا تھا۔"

وہ پھر آنکھیں جھکا کر انگوٹھی سے چھیڑ خانی کرنے لگی لیکن کچھ دیر سوچنے کے بعد جھجکتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔

"تم جس بھی مقصد سے گئے تھے، کیا وہ پورا ہوا؟"

وہ کہہ دیتا، میں تو ملازمت کے لیے گیا تھا اور وہ مقصد اب تک پورا ہو رہا ہے لیکن وہ اتنے اجنبی بھی نہیں تھے۔

"آئسلی، مجھے نہیں پتا۔" وہ کندھے اچکا کر بولا۔

"تم اتنے سالوں سے ایک ہی جگہ تھے؟"

خاموشی اور اس پر نگی ودیع کی نظریں ہی نہیں اسے اپنے چہرے کے تاثرات پر بھی بھروسا نہیں تھا اس لیے گھبرا کے پوچھا۔

"نہیں، میں نیدرلینڈ، لکسمبرگ کے بعد اب لندن میں ہوں، تمہیں نہیں پتا؟ ثاقب بھائی، شہاب بھائی اور طلال بھی جانتا ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ کیا بتاتی کہ اس کے سامنے کوئی اس کا ذکر کرتا ہی نہیں تھا۔ جانے وہ اپنی دانست میں اسے دکھ سے بچاتے تھے یا کوئی اور وجہ تھی۔ اگر بات چل بھی رہی ہوتی تو اسے دیکھتے ہی سب موضوع بدل دیتے۔ کچھ کھوج کی کوشش اس نے بھی کبھی نہیں کی۔

پھر چپ کی چادر تن گئی۔ جتنی باتیں ان کے دلوں میں تھیں، اس کے لیے رات بھی کم تھی لیکن شرط انہیں زباں پر لانا تھی۔

"تم نے کہا۔" ذرا دیر بعد ہال میں ودیع کی دھیمی آواز ابھری۔

"وقت گزرنے کے بعد سب اور مشکل ہو گیا تھا، تمہارے لیے مشکل تھا۔" اس سے یہ سوال بھی ظلم تھا لیکن وہ جاننا چاہتا تھا۔

طوبیٰ نے زخمی نگاہ سے اسے دیکھا پھر ایک گہری سانس لے کر پوری اس کی طرف گھومی اور پیر بھی صوفے پر رکھ لیے۔ اس کے اندر کوئی تار چھڑ گیا تھا چنگاری کیسے نہ نکلتی۔

"تمہیں پتا ہے یہاں تمہارے متعلق کیا کیا باتیں مشہور ہیں؟" وہ اس کے جواب کے لیے رکی نہیں۔

"تم نے وہاں شادی کر لی ہے، تمہاری بیوی کوئی گوری ہے، تمہارے بچے بھی ہیں، کسی کو یقین ہے تمہاری بیوی کوئی پاکستانی یا بنگلہ دیشی ہے، کچھ کے پاس تمہاری بیوی کی تصویریں بھی ہیں، بہت سوں کا خیال ہے، تم اسی لیے باہر جا رہے تھے کہ مجھ سے شادی نہ کرنا پڑے، اور اکثریت اس بات پر

تعلق ہے کہ اس لیے واپس نہیں آرہے تھے کہ تمہیں میرے ساتھ نہ رہنا پڑے، کچھ کو لگتا ہے تم کب کا مجھے طلاق دے چکے ہو، لیکن گھر والے خاص طور پر بڑے ابا یہ سب سے چھپا رہے ہیں۔ نو سال تک کوئی کسی کے نام پر بیٹھا نہیں رہتا ہو لازمی مجھ میں کوئی عیب، کوئی خامی ہے یا ایسی بات ہے، جس کی وجہ سے میں اس گھر میں ہوں تو...... کسی کے لیے بڑے ابا بڑی امی ہماری کفالت کا خراج اس طرح وصول کر رہے ہیں۔" وہ سانس لینے کو ذرا رکی۔

"لوگوں کے سوال، نظریں، قیاس سب مجھے نو سال سے اس گھر سے باہر نکلنے نہیں دیتے، میں نے لوگوں سے ملنا چھوڑ دیا ہے لیکن اس بات پر بھی دنیا مجھے بھولی نہیں بلکہ اس سے ان کے تجسس کو مزید ہوا ملتی ہے اور وہ خود ہی خبر لینے یہاں چلے آتے ہیں۔ نو سال بعد وہ اولین جوش نہ سہی مگر لوگ بھولے کچھ نہیں ہیں، جہاں بھی مجھے اور تمہیں جاننے والے چار لوگ مل جائیں، ہاٹ ٹاپک یہ ہی ہوتا ہے۔ امی اور بڑی امی سب سے کیسے نپٹتی ہیں وہ الگ داستان ہے اور اپنے ہی گھر کی ممبر اس ٹاپک کو کیسے زندہ رکھے ہے وہ الگ۔ ان سب کا نچوڑ یہ ہے کہ آج بھی سب کو لگتا ہے۔"

"تمہیں کیا لگتا ہے؟" اس نے ذرا اونچی آواز میں پوچھ کر اسے روکا اور وہ چونک کے اسے دیکھے گئی۔ گو اس کی آواز دھیمی تھی پھر بھی تیز لہجے اور مسلسل بات کے بعد یکا یک ہال میں سناٹا چھا گیا تھا۔

"ان سب میں تمہیں کیا سچ لگتا ہے؟" اس نے سوال آسان کیا۔

"تم ہی بتا دو، کیا سچ ہے۔"

"کچھ بھی نہیں۔" جانے وہ اسے کیا باور کرانا چاہتا تھا، کون سا یقین اس تک پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ ایک دم ڈھیلی پڑ گئی۔ اسے احساس ہوا وہ جذبات کی رو میں بہہ کر لڑکھڑا گئی تھی۔

وہ چاہ کے بھی اسے اپنے نو سال کے بن باس کی وجہ نہیں بتا پا رہا تھا۔ وہ اس کے جانے کی وجہ نہیں تھی لیکن یہ بھی سچ تھا، وہ اسی کی وجہ سے اتنے برس لوٹ نہیں سکا تھا۔

ایک بار پھر ان کے درمیان چپ بکل مار کے بیٹھ گئی۔ وہ دونوں ہی نو سال قبل اس کے جانے سے ذرا دیر پہلے بدلے رشتے پر ایک لفظ منہ سے نہیں نکال رہے تھے جب کہ ان کے ذہن و دل کی ہر بات اور سوچ اس تعلق کا طواف کرتی تھی۔

"سوری۔" اس کی آواز میں ندامت تھی۔

"میں نے تمہیں اتنی مشکلیں دیں اور اتنے سال تک دیں۔"

"یہ محض میری مشکلیں نہیں تھیں، انہیں سب نے جھیلا ہے۔"

"یعنی مجھے سب سے سوری کرنا ہوگی۔" وہ دھیمے سے مسکرایا۔ طوبیٰ یونہی نظریں جھکائے خاموش رہی۔

"ثاقب بھائی اور شہاب بھائی اپنے بچوں کے ساتھ کیسے ہیں؟" کچھ دیر بعد اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ثاقب بھائی بڑے ابا کے بالکل الٹ ہیں اور شہاب بھائی بیلنس کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ثاقب بھائی نے تینوں بیٹوں کے ساتھ دوستانہ رویہ رکھنے کی بھی کوشش کی لیکن سوائے چھوٹے عبدالرافع کے ان کے ساتھ بڑے دونوں فری نہیں ہو سکے۔ عبدالرحمان کا ٹینتھ کا رزلٹ اچھا تھا لیکن ٹوئلتھ میں بہت ہی خراب جب کہ اس نے کالج، اسٹریم، ٹیوشن کلاس سب اپنی مرضی سے منتخب کیا تھا۔ رزلٹ کے بعد اسے کسی بھی اچھے کالج یا اس کی مرضی کی فیلڈ میں ایڈمیشن نہیں ملا۔ ثاقب بھائی نے بھاری ڈونیشن دے کر آئی ٹی میں جیسے تیسے ایڈمیشن کروایا۔ اب بھی وہ سارے سبجیکٹ کلیئر نہیں کر پاتا ہے اور اس کی اپنی لاجک ہے جس کے مطابق اس میس کی سب سے بڑی وجہ ثاقب بھائی ہیں۔"

"سب کا کیلیبر مختلف ہوتا ہے، ضروری تو نہیں

pklibrary.com

ہر کوئی ڈاکٹر انجینئر ہی بنے، اسے کوئی آسان فیلڈ چوز کرنے دی ہوتی۔" اس کا لہجہ خود بخود تن سا گیا تھا۔

"ثاقب بھائی نے پڑھائی کے معاملے میں کبھی بچوں پر اپنی مرضی تھوپی نہ اچھے نمبروں کا پریشر ڈالا۔ آئی ٹی میں جانے کا فیصلہ عبدالرحمان کا اپنا تھا۔"

"ایسا ہی ہونا چاہیے۔"

اسے کہنا تو بہت کچھ تھا لیکن وہ چپ ہوگئی۔ اس کا ماننا تھا کہ ثاقب بھائی اس کی قابلیت اور ذہنی استعداد جانتے تھے تو انہیں بیٹے کو سمجھانا چاہیے تھا، اسے منانا اور راضی کرنا تھا کہ یہ اس کے لیے مشکل ہوگا۔

"اور شہاب بھائی کی فیملی؟" کچھ توقف کے بعد اس نے دوسرا سوال کیا۔

"وہ تمہارے جانے کے بعد ہی الگ ہوگئے ہیں، کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا تھا، بس انہیں بچوں کے لیے الگ اسپیس چاہیے تھی۔" اس کے قدم نے دوسروں میں بھی ہمت پیدا کردی تھی تو بڑے ابا بھی بیٹے کی بغاوت کے بعد کمزور پڑ گئے تھے۔ انہوں نے پھر کسی پر، کسی بھی معاملے میں اپنی مرضی تھوپنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"ان کا بڑا بیٹا توصیف کوئی ڈیزائننگ کورس کر رہا ہے، توقیر اسکول میں ہے اور چھوٹی دانیہ تو ابھی پرائمری میں ہے، تم نے تو دانیہ کو اب دیکھا ہوگا۔" دانیہ کے ساتھ ہی اسے اس کا کارنامہ بھی یاد آ گیا۔

"تصویر بھیجی تھی شہاب بھائی نے اور وہ مجھے بالکل امی جیسی لگی تھی۔" وہ مسکرایا، یاد اسے بھی تھا۔

"ہاں، اس میں بڑی امی کی شباہت ہے۔" وہ مسکرائی تو جانے کیوں ودیع کو اس تبسم میں اداسی گھلی محسوس ہوئی۔ نین نقش کے ساتھ اس نے دادی کی گلابی رنگت بھی چرائی تھی۔

"مجھے اب نیند آ رہی ہے۔" وہ ایک دم کشن صوفے پر رکھتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم بھی سو جاؤ۔" اسے کہتی وہ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے رک کر پلٹی۔

"کبھی بڑے ابا کے پاس بھی چلے جایا کرو۔"

"ہوں۔" اس نے سر ہلایا اور وہ آگے بڑھ گئی۔

ودیع کے تصور میں تھا کہ طوبیٰ کا رویہ اس کے ساتھ اکھڑا اور سرد ہوگا۔ اس کے ذہن سے وہ شدت سے روتی طوبیٰ کبھی نکلی ہی نہیں تھی۔ وہ شبیہہ پوری جزئیات کے ساتھ اب بھی اس کی یاد میں زندہ تھی۔

وہ نکاح دونوں کے لیے کسی صدمے سے کم نہ تھا۔ طوبیٰ کے لیے اپنے جذبات کے باوجود اس وقت اس کے دکھ کی وجہ کچھ اور تھی لیکن تب طوبیٰ کے رونے کی وجہ ایک ہی ہو سکتی تھی کہ ابا نے اس کے ساتھ بھی زبردستی کی تھی، اس دن اس کا رونا عام سی گریہ زاری نہیں تھا۔ وہ شاذ ہی روئی تھی لیکن اس دن کی تڑپ اور بے قراری کچھ الگ تھی اور اب اس کا عام سا انداز اسے مزید الجھا رہا تھا۔ مرضی کے خلاف نکاح اور پھر نو سال تک پلٹ کر نہ پوچھنے پر وہ اس کے ساتھ جتنا برا سلوک کرتی جائز تھا لیکن وہ نہ اس کی آمد پر خوش محسوس ہوئی تھی نہ ناراض یا دکھی۔ اس کے رویے نے ودیع کے لیے 'وہ کیا چاہتی ہے؟' اس سوال کا جواب پانا مشکل کر دیا تھا۔

"بڑے ابا اور ان کی بیٹی۔" اس نے سیدھا ہو کر سر پیچھے گرایا۔

"نہ پہلے آسان تھے نہ اب آسان ہیں!"

☆☆☆

اسے بڑے ابا کے کمرے میں آئے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ باہر سے شور ابھرا۔ اس نے ابھی ان کا مزاج ہی پوچھا تھا۔

"بڑے بھیا اور بھابھی آئے ہیں۔" بڑی امی نے آ کر اطلاع دی۔

"مجھے لے چلو باہر۔" وہ ٹانگوں سے چادر ہٹاتے ہوئے گویا ہوئے۔ ودیع ان سے پہلے کھڑا ہوگیا۔ کچھ ہچکچایا پھر جھک کر انہیں پلنگ سے اتر کر

کھڑے ہونے میں مدد کی۔ بڑی امی تو نہال ہی ہوگئیں۔

جب وہ اس کا سہارا لیے ہال میں آئے تو بیک وقت ساری آنکھیں ان کی جانب اٹھ گئیں۔ اس منظر نے حاضرین کے خدشات کو زور کر کے ان کے اندر ایک خوش گوار سا احساس جگا دیا تھا۔

اس نے انہیں صوفے پر بٹھایا اور تایا ابا کے پاس جا کر ان سے ملنے لگا۔ تایا ابا کے پاس اس کی حرکت کی سرزنش، ضد کے نقصانات، لاتعلقی کی شکایتیں، صلواتیں، سمجھانے والی باتیں مشورے اور اپنی زندگی کے تجربات سے سیکھے سبق تھے۔ وہ سر جھکائے سب سنتا رہا اور سنتے سنتے ہی اسے ادراک ہوا کہ یہ سب وہ اپنے ابا سے سننے کی توقع کر رہا تھا۔

وہ دانیہ، توقیر اور عبدالرافع کے ساتھ لوڈو کھیل رہی تھی مگر اس کے کان پیچھے چل رہی گفتگو پر لگے تھے۔

"تاریخ رکھ لی؟" تائی امی ہمیشہ اپنا پان دان ساتھ لاتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ دیورانیوں کو پان بنا کر دے رہی تھیں۔

"ابھی نہیں۔" امی نے کن انکھیوں سے بیٹی کو دیکھا اور اسے کھیل میں گم دیکھ کر مطمئن ہوگئیں۔

"کیا کہہ رہا ہے ودیع، ساتھ لے جائے گا یا ہمیشہ کے لیے پردیس چھوڑ کے آیا ہے؟"

"ابھی یہ سب پوچھا نہیں بھابھی۔" بڑی امی نے یوں کہا جیسے جیٹھانی کے سپرد کیے کام میں ان سے کوتاہی ہوگئی ہو۔

"اے لو! تو اتنے دن سے کر کیا رہی ہو تم دونوں؟ نو سال کیا کم تھے جو اور دن گنوائے جا رہی ہو۔" انہوں نے بڑی امی کو پان کی گلوری تھمائی اور نم ململ کے کپڑے میں چھپا دوسرا پان اٹھا کر اس کی ڈنٹھل مروڑی۔

"تیاری شروع کرو، دعوتیں دو، طوبیٰ کو بھیجنا ہے ساتھ تو اس کی تیاری پکڑواؤ اور ان سب سے پہلے ایک تاریخ پکی کرو۔ کہو تو ان سے کہتی ہوں، ابھی بیٹھ کر فیصلہ ہو جائے گا۔"

"نہیں بھابھی۔۔" بڑی امی نے تیزی سے کہا اور اس کی امی جو جوش میں تائی امی کو ہاں کہنے جا رہی تھیں، سختی سے لب بھینچ کر انہیں دیکھنے لگیں۔

"پہلے میں اس کے ابا سے بات کرتی ہوں۔ اتنا تو طے ہے کہ اب طوبیٰ کی رخصتی ہونی ہی ہے۔" انہوں نے دیورانی کا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔

"آپ اپنی طرف سے پوری تیاری رکھیں جب فون کروں، سب کو لے کر آجائیے گا بس۔" آخر میں انہوں نے خوش دلی سے ماحول بدلا۔

طوبیٰ نے شکر کیا کہ وہاں خولہ بھابھی موجود نہیں تھیں۔ وہ تائی امی کی بہو کو اپنے ساتھ اوپر لے گئی تھیں۔ اسے علم تھا وہاں کیا باتیں ہو رہی ہوں گی پھر بھی یہاں ہو رہے مذاکرے میں ان کا شامل نہ ہونا زیادہ سود مند تھا۔

"طوبیٰ آپی!" عبداللہ نے اندر آکر اسے پکارا۔

"پاپا چائے کا کہہ رہے ہیں۔"

وہ اٹھ کر باورچی خانے میں آگئی۔

☆☆☆

تایا ابا دو دن رکے رہے اور یہ وقت اس کے لیے بڑا کڑا ثابت ہوا۔ انہوں نے اس کی شادی کا ذکر سب کے سامنے چھیڑ دیا تھا غنیمت تھا کہ اس وقت ودیع موجود نہیں تھا۔

"جب اور جیسا ودیع کہے گا۔" بڑے ابا کے جواب نے جہاں سب کو مطمئن کیا کہ اب کوئی نیا پنگا نہیں ہوگا وہیں اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ انہوں نے تو بچوں کا بھلا چاہا تھا، ذمہ دار باپ کے فرائض نبھائے تھے اور آخر میں وہ کس قدر بے بس اور مجبور تھے اور اس میں کچھ ہاتھ اس کا بھی تو تھا۔

☆☆☆

"میری تو خود کچھ سمجھ میں نہیں آتا اس گھر میں چل کیا رہا ہے،" وہ جو سگریٹ کی طلب میں تاریک حصے میں جا رہا تھا کہ اوپر جانے والی سیڑھیوں سے

آتی خولہ کی آواز پر رک گیا۔

''شادی، رخصتی کی بات کوئی منہ سے نکال نہیں رہا نہ وہاں اس نے کون سے گل کھلا رکھے ہیں، یہ کوئی پوچھتا ہے، وہ۔ وہ تو آگے پیچھے گھومتی رہتی ہے اس کے، رات میں جب بھی دیکھو دونوں کسی کونے کھدرے میں دبکے ہوتے ہیں، اور نہیں تو کیا، اب بلی کے گلے میں گھنٹی باندھے کون! اور تو اور۔'' ان کی بات جاری تھی لیکن وہ پلٹ گیا۔ ان کی بکواس اور مبالغہ آرائی پر اسے غصہ آرہا تھا۔

بے خیالی میں اندر آتے ہوئے وہ سگریٹ سلگا چکا تھا۔ کش لیتا ہوا وہ راہداری میں آیا اسی وقت طوبیٰ اپنے کمرے سے نکلی اور اسے اس دیدہ دلیری سے کش لگاتے دیکھ پہلے حیرت اور صدمے سے آنکھیں پھیل گئیں پھر ایک دم گھبراہٹ طاری ہوئی۔

بڑے ابا بھلے کمرے تک محدود تھے لیکن گھر اب بھی ان کے بنائے اصولوں پر چل رہا تھا۔ ان کا رعب اور دبدبہ اب بھی اتنا تھا کہ اس گھر میں سگریٹ کی بو بھی ممنوع تھی اور اس وقت سب سوئے بھی نہیں تھے۔ وہ کچھ کہتی اس سے پہلے ہی ہال سے عبداللہ اور عبدالرافع کی آواز ابھری اور اس نے بنا سوچے سمجھے ودیع کا بازو پکڑ کر اپنے کمرے میں گھسیٹ لیا۔

''پاگل ہو گئے ہو تم؟'' وہ برہم تھی۔

''گھر میں بچے بھی ہیں، ان کے سامنے سگریٹ پیو گے؟''

''پہلے بڑوں کے سامنے پینا منع تھا، اب بچوں کے سامنے بھی؟''

''اس گھر میں سگریٹ ہی منع ہے۔ اللہ کرے بچے بوکا پیچھا کرتے ادھر نہ آجائیں۔'' اس نے ہاتھ مار کے دھوئیں کے مرغولے اور بو دور کرنی چاہی۔

''دنیا بہت بدل گئی ہے طوبیٰ! بچے اس بات پر خوش ہوں گے کہ کوئی اس گھر میں سگریٹ پیتا ہے اور بوکا پیچھا کرنے کے بجائے اسے راز رکھیں گے تاکہ اگلی دفعہ کوئی ان کا راز بھی چھپا سکے۔'' اس نے آگے بڑھتے ہوئے ایک لمبا کش لیا اور جلتی سگریٹ میز پر دھرے پانی کے جگ میں ڈال دی۔

''کیا پتا چھپ چھپا کر یہ کام کب سے اس گھر میں ہو رہا ہو اور کسی کو خبر نہیں۔'' وہ پلٹ کر گویا ہوا۔

''تم اتنا منفی کیوں سوچتے ہو؟'' اس نے وہیں کھڑے کھڑے دھیرے سے پوچھا۔

''منفی، مثبت کی بات نہیں جو ماحول اور حقیقت سے قریب ہے، وہ بات کر رہا ہوں۔ میں نے سگریٹ فرسٹ ایر میں شروع کی تھی۔''

''تم تب سے اسموکنگ کر رہے ہو؟'' اسے دھچکا لگا تھا۔

''میں عادی نہیں ہوں۔ لیکن وہاں کے موسم میں کبھی کبھی پینی پڑتی ہے۔'' اس نے اس کا صدمہ کم کرنا چاہا۔

''ویسے پابندیاں سب سے بڑی موجد ہیں چور راستوں کی، تم بھی اس بات کی گواہ ہو۔'' وہ مسکرایا۔

''میں، ؟'' اس نے تعجب سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''ہاں۔ مجھے ابا سے بچانے کے لیے تم نے بھی چور راستہ انونیٹ (دریافت) کیا تھا۔'' وہ جانے کس چور راستے کی بات کر رہا تھا، اسے تو کئی یاد آگئے۔

''مجھے ہندی ٹیسٹ میں دو مارکس ملے تھے تب تم نے اپنے ٹیسٹ پیپرز کے ساتھ مکس کر کے میرے پیپر پر بھی ابا کے سائن لیے تھے۔'' تعلیمی میدان میں ان چاروں کے مقابلے میں اسے ہمیشہ رعایت حاصل رہی تھی۔ وہ زبانی اپنے نمبر سنا دیتی تو بڑے ابا مان جاتے۔ باقیوں کے پرچوں کی طرح پوسٹ مارٹم کر کے اور ہر غلطی پر تھپڑ رسید کرنے کے بعد دستخط نہیں کرتے تھے بلکہ وہ پرچے ان کے سامنے رکھتی اور وہ نمبر کہتی جاتی وہ بنا دیکھے ہی سنتے ہوئے دستخط کرتے جاتے۔ اس بار اس نے اپنا ایک پرچہ کم کر کے اس کی جگہ درمیان میں ودیع کا جوابی پرچہ رکھ دیا تھا اور ودیع سے کہا تھا وہ بہانا بنا دے کہ

ہندی کے استاد نے جوابی پرچے دیے ہی نہیں۔ یہ چال بازی عام کلاس ٹیسٹوں میں ہی ممکن ہو پائی تھی۔

طوبیٰ کو اچھی طرح یاد تھا۔ اس بنا دستخط والے پرچے کی وجہ سے بطور سزا اسے ایک پیریڈ کلاس کے باہر کھڑے رہنا پڑا تھا۔ وہ خاموشی سے جگ میں تیرتے سگریٹ کو دیکھنے لگی۔

"تمہیں یاد ہے، مجھے تب کرکٹ گیم کارڈز جمع کرنے کا کتنا شوق تھا؟" اچانک اس نے پوچھا۔ کرکٹرز کی پیشہ ورانہ تفصیل اور رینکنگ والے کارڈز اس کے پاس بے شمار تھے۔ طوبیٰ نے سر ہلایا۔

"ابا بھی نجی کمرے میں آکر تلاشی شروع کر دیتے تھے، ان کے ڈر سے وہ سارے کارڈز چھپانے کے لیے ایک جگہ بنائی تھی میں نے، کیا پتا اب بھی کارڈز ہوں وہاں۔" اس نے پلنگ کے ساتھ رکھی تپائی پلنگ سے دور کی۔ وہ اس کے پیچھے آکر کھڑی ہوگئی۔ ودیع نے تپائی ہٹا کر پلنگ کو تھوڑا دائیں طرف دھکیلا پھر فرش پر بیٹھ کر پلنگ کے نیچے، پہلی قطار والی ٹائلیں انگلیوں سے بجا کر دیکھنے لگا۔ ایک جگہ رک کر اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی پھر تپائی پر رکھی کتاب سے پینسل نکال کر اس کی مدد سے ٹائل اس جگہ سے اٹھانے کی کوشش کی۔ کچھ دیر بعد ٹائل ہٹائی تو اس کے نیچے دو ڈھائی انچ گہرا خلا تھا۔

"حق ہا! کارڈز تو نہیں ہیں لیکن خفیہ تہہ خانہ اپنی جگہ موجود ہے۔" وہ خود ہی محظوظ ہو کر ہنس دیا۔

"تم بھی چاہو تو یہ سیکرٹ جگہ یوز کر سکتی ہو۔" بچپن کی یادوں اور باتوں نے اس کی طبیعت بشاش کر دی تھی۔ طوبیٰ بس مسکرا کر پیچھے ہوگئی۔ اس کے پاس کیا تھا جو یوں چھپانا پڑتا۔ اس نے ٹائل اسی جگہ لگایا پھر پلنگ اور تپائی سابقہ جگہ پر سرکائی۔ یہ سلیقہ تنہا رہنے نے اسے سکھایا تھا۔

"اتنے سالوں میں اس پر کبھی بیڈ یا ٹیبل کا فوٹ نہیں پڑا اور نہ ٹائل ٹوٹ کر اندر دھنس جاتی۔" یہ سچ تھا کہ کئی چیزوں کی جگہیں بدلیں تاہم کمرے کا حدود اربعہ ایسا تھا کہ پلنگ ہمیشہ اسی جگہ رہا۔

وہاں سے ہٹنے یا پلنگ پر بیٹھنے کے بجائے وہ پلنگ سے پیٹھ لگا کر فرش پر بیٹھ گیا۔

"تم اس کمرے میں کب سے ہو؟"

"تمہارے بعد طلال تو یہیں تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں ادھر آگئی۔" وہ فرش پر بیٹھا تھا تو اسے یوں کھڑے ہو کر اس سے بات کرنا عجیب لگ رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے آرائشی آئینے کے اسٹول پر بیٹھ جائے یا اس کی تقلید میں فرش پر، فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ کتنے سوال اس کے اندر مچل رہے تھے۔ کیا وہ ہمیشہ کے لیے واپس آگیا ہے اس لیے اپنے کمرے کے متعلق بات کر رہا ہے، وہ اب اس کمرے میں رہنا چاہتا ہے، کچھ دن کے لیے یا ہمیشہ کے لیے۔

"پتا نہیں کیوں اچانک ہی مجھے اس وقت اس کمرے سے جڑی بہت سی باتیں یاد آرہی ہیں۔" اسے خود بھی اپنے عجیب رویے کا احساس تھا۔

"تم یہاں رہنا چاہتے ہو تو کوئی مسئلہ نہیں۔ میں اپنا سامان دوسرے روم میں شفٹ کر لیتی ہوں۔" اس نے فوراً کہا۔

"میں کل شفٹ کرلوں گی۔"

"نہیں۔" اس نے درمیان میں ہی روکا۔

"میں اُدھر بھی ٹھیک ہوں، بس ایسے ہی پرانی باتیں یاد آرہی ہیں۔" وہ اس کے پیچھے دیواروں کو دیکھنے لگا۔

"بیٹھ جاؤ۔" اس نے اپنی گدی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ وہ لگاتار سر اونچا کیے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ پیچھے ہو کر آرائشی میز کے پاس فرش پر بیٹھ گئی۔

"اتنے سال پورب میں رہنے کے بعد اب تمہیں یہاں کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہوگا۔" مرمت اور دیکھ بھال کے باوجود مکان کا یہ حصہ پرانا تھا۔ اس نے اسے فون پر بات کرتے سنا تھا، اس کا 'انگلش ایکسنٹ (لہجہ) سن کر اسے پہلی احساس ہوا کہ وہ اتنا طویل عرصہ وہاں رہتے ہوئے وہیں کا باسی لگنے لگا

ہے۔اس کا لباس اور حلیہ تو بدل ہی گیا تھا، اس پر اس لہجے میں انگریزی بولتا وہ اسے اجنبی لگا۔اس کی بات سن کر وہ دھیرے سے ہنس دیا۔ اس ہنسی میں تو سالوں کا اکیلا پن اور حسرتیں تھیں۔طوبیٰ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

''گھر گھر ہوتا ہے طوبیٰ!'' ودیع نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ یہ اعتراف ایک طرح سے اس کی شکست تھا اور یہ وہ اسی کے سامنے کر سکتا تھا۔

''نو سال سے میں بنجارے سی زندگی جی رہا ہوں۔'' طوبیٰ کا دل کیا پوچھے۔

''تو کیا اب خانہ بدوشی سے توبہ کر لی ہے؟''

مگر وہ خاموش رہی۔ وہ 'کیوں بنجارے سی زندگی جی رہے ہو؟' نہیں پوچھنا چاہتی تھی کہ اس کا جواب اسے معلوم تھا لیکن اسے 'اب کیا؟' کا جواب سننے کی بے چینی تھی۔

''تم اکیلے رہتے ہو، میرا مطلب کے فلیٹ شیئرنگ ہے یا تم ہی ہوتے ہو؟'' اس نے اپنی بے چینی کے ہاتھوں مجبور ہو کے بات آگے بڑھائی۔

''یہاں سے جانے کے بعد دو سال سے زیادہ تو شیئرنگ میں رہا۔''

اس نے کہنا شروع کیا اور پھر اس کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے وہ وہاں اپنے قیام اور کام کی تفصیل اس قدر مفصل بیان کرنے لگا کہ اسے نہ وقت کا اندازہ رہا نہ اس نے نیند سے بے حال ہوتی طوبیٰ پر توجہ دی۔ اتنی باتیں وہ عرصے بعد کر رہا تھا، پہلی بار وہ خود پر گزری سنا رہا تھا، اسے یہ اتنا اچھا لگ رہا تھا کہ سناتے ہوئے وہ کھو سا گیا تھا۔

وہاں کی زندگی اس کے لیے آسان نہیں تھی اور پہلی بار کسی نے پوچھا تھا۔ سر جھکا کر بولتے ہوئے جب اس نے اوپر دیکھا تو ایک دم رک گیا۔

وہ اس کی طرف کروٹ لیے ہتھیلی پر گال رکھے سو گئی تھی۔ وہ جس انداز میں بیٹھی تھی اسی انداز میں لیٹ گئی تھی۔ اس کے گھٹنے مڑے ہوئے تھے۔

اس نے دیکھا ہی نہیں کہ وہ جمائیاں روکتے روکتے بے حال ہو گئی تھی لیکن اسے درمیان میں ٹوکنا، روکنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ ذرا نہیں بدلی تھی۔ اسے آج بھی بڑے ابا کی محبت کے ساتھ ساتھ بڑے ابا کے عتاب کا شکار بننے والوں کی بھی اتنی ہی فکر تھی۔

وہ پیچھے مڑا اور ہاتھ بڑھا کے پلنگ سے تکیہ لیا پھر اٹھ کر اس کے پاس آیا۔

''کہیں جاگ نہ جائے۔'' وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر جھک کر احتیاط سے اس کے سر کے نیچے تکیہ رکھ دیا۔ سیدھا ہونے کے بجائے وہ پنجوں کے بل وہیں بیٹھ گیا۔

اس کے چہرے پر عمر کی پختگی تھی، الہڑ پن کی جگہ سنجیدگی تھی، انداز گفتگو کا ٹھہراؤ چہرے پر بھی ٹھہرا نظر آتا تھا، سانولے چہرے میں اتنے وقت بعد بھی معصومیت تھی لیکن ہمیشہ اس کی شخصیت کا حصہ رہنے والی شوخی اور شرارت ندارد تھی۔

''کیا یہ میں نے چھین لی ہے؟'' اس نے ہلکے سے اس کے گال کو چھوا۔

اس نے اتنے برس اسے سوچا تھا، چاہا تھا اور صبر کیا تھا۔ اس کی طلب تھی یا تھکن جو وہ باپ کے ساتھ بندھی ضد سے ذرا دیر کو نظر پھیر کر یہاں چلا آیا تھا لیکن اب بھی اسے دل کا حال سنانے سے قاصر تھا۔ وہ جب بھی ارادہ کرتا، روتی بلکتی طوبیٰ چھم سے اس کے سامنے آجاتی اور اپنی آخری امید وہ جتنی دیر ہو سکے قائم رکھنا چاہتا تھا۔

ذرا دیر بعد وہ اٹھا اور پلنگ سے لحاف اور دوسرا تکیہ لے کر واپس آیا۔ لحاف اس کے اوپر پھیلا کر اس سے ذرا فاصلے پر تکیے پر سر رکھ کے وہ بھی لیٹ گیا۔ بتی اسی طرح جل رہی تھی۔

''تم نے مجھے کیوں بلایا ہے طوبیٰ؟'' وہ دل میں سوئی طوبیٰ سے جواب مانگ رہا تھا۔

اتنے برسوں میں جو ضد ختم نہیں ہوئی تھی، وہ باپ کو دیکھ کر ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ ان سے شکایتیں اور ناراضی اپنی جگہ لیکن انہیں اس حالت میں دیکھ کر

اس کا دل دکھی تھا، اسے افسوس تھا۔ اس کے اندر بار بار پرانے جلالی اور سخت گیر باپ کی شبیہہ ابھرتی تھی۔ اس نے جانا کہ اس کا ذہن باپ کو اسی روپ میں قبول کرتا ہے۔ وہ انہیں ویسا ہی دیکھنا چاہتا تھا۔ کمزور، لاغر اور محتاج سے باپ کو دیکھ کر اس کے اندر "ظالم کا یہ ہی انجام ہونا چاہیے۔" جیسا کچھ نہیں گونجا تھا اور اسے اس بات پر حیرت تھی کیوں کہ وہ خود کو یہ ہی یقین دلاتا رہا تھا کہ ایک دن ابا کو ان کی غلطیوں، سختیوں کی سزا ملے گی۔ اس وقت تو اسے تنفر سے گردن تان کر انہیں جتانا چاہیے تھا لیکن وہ خود اپنے اس بوجھل سے ردعمل پر حیران تھا۔

طوبیٰ کے چہرے پر نظر جمائے وہ بڑے ابا کو سوچتا جانے کب سو گیا۔

☆☆☆

"تم اتنی بولڈ ہو، مجھے اندازہ نہیں تھا۔" خولہ بھابھی نے اسے شانے سے دھکا دیا تو وہ اس افتاد پر گرتے گرتے بچی۔

"بولڈ؟" اسے خاک سمجھ میں آیا۔

"اب بنو مت، کل رات ودیع تمہارے کمرے میں ہی تھا۔" اسے جس قدر زور کا جھٹکا لگا اس نے باہر خود کو اتنا ہی شانت رکھا۔

"ہاں، باتیں کرتے کرتے وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ وہ صبح سو گیا لیکن مجھے تو کام ہوتے ہیں۔" اس نے کشن جھٹک کر واپس جگہ پر رکھتے ہوئے عام سے انداز میں کہا اور زبردستی کی جمائی لی۔

"اب دوپہر میں ہی سونے کو ملے تو ملے۔"

"لیکن وہ تمہارے کمرے میں آیا کیوں تھا؟" وہ اپنے نام کی ایک ہی خولہ تھیں۔

"اسے یاد آیا تھا کہ کمرے میں اس کی ایک خفیہ جگہ تھی، بڑے ابا سے بچا کے کارڈز وغیرہ چھپانے کی، وہ دیکھنے آیا تھا کہ اب بھی ہے یا نہیں۔"

"پھر... مطلب ملی وہ جگہ؟"

"ہاں... پلنگ کے نیچے والی ایک ٹائل نکل جاتی ہے، اس کے نیچے وہ چیزیں چھپاتا تھا۔ آپ کو دیکھنا ہے؟" وہ ایک دم ان کی سمت مڑی۔

اسی وقت بکھرے بال اور الجھے حلیے کے ساتھ جمائیاں لیتا ودیع ہال میں آیا۔

"خولہ بھابھی کو بھی سیکریٹ جگہ دکھا دو۔" اس نے بلا سوچے سمجھے کہا۔

"آں؟"

"اب رہنے بھی دو۔" خولہ بھابھی نے منمناتے ہوئے اس کی آستین کھینچی۔ اس نے پلٹ کر صوفے کے کشن ٹھیک کرتے ہوئے خود کو شاباشی دی۔

"مما!" اوپر سے عبدالرافع حلق پھاڑ کر چلایا۔ "میرا بلیو اسپورٹس ٹی شرٹ نہیں مل رہا ہے۔"

"کرسی پر رکھا ہے نکال کے۔" وہ اس کے جتنی ہی اونچی آواز میں کہتی اوپر والی سیڑھیوں کی طرف چلی گئیں۔

"سوری..." وہ اس کے پاس آیا۔

"کل رات میری آنکھ لگ گئی تھی۔"

طوبیٰ جانتی تھی آنکھ پہلے اس کی لگی تھی اور اس کے بعد ودیع کو کمرے سے چلے جانا چاہیے تھا، اسے تکیہ اور لحاف یاد تھا اور سامنے سویا ودیع بھی۔

"خولہ بھابھی کو جواب دینا مشکل ہو جاتا ہے اور ان سے کوئی بات چھپ بھی نہیں سکتی۔"

"میں خیال رکھوں گا۔" اس نے اس کی بات کے درمیان ہی تیزی سے کہا۔ طوبیٰ نے ایک نظر اس پر ڈالی اور چلی گئی۔ وہ وہیں صوفے پر گر گیا۔

☆☆☆

آج گھر میں سب اکٹھا تھے۔ طلال موجود تھا اور عبدالرحمان بھی چاچو سے ملنے آیا تھا۔

کھانے کے بعد سارے مرد سب کو نیچے چھوڑ کو خود اوپر چلے آئے تھے۔ پورچ میں کرسیوں پر بیٹھ کر کام، دفتر اور سیاست پر گفتگو کرتے کرتے بات گھر، زندگی اور بچپن پر چلی آئی۔

"دیکھو! ابا فطرتاً نیک انسان ہیں۔ ان میں کوئی شخصی برائی بھی نہیں تھی مثلاً کام چور یا غیر ذمہ دار

pklibrary.com

www.pklibrary.com

نہیں تھے، اپنے کام اور پیشے میں ایمان دار تھے، رشتے داروں کے ساتھ بھی ان کا رویہ صلہ رحمی والا تھا بس وہ ہم بچوں کے معاملے میں اسٹرکٹ (سخت) تھے۔" ثاقب بھائی کہہ رہے تھے۔

"صرف اسٹرکٹ، ؟ ابا ہمارے لیے پورے ہٹلر تھے۔" شہاب بھائی نے تصحیح کی۔

"اب انہیں اتنا بھی وائٹ واش نہ کریں۔ ان کے مزاج اور رویے نے ہماری شخصیت اور مزاج میں کئی خلا اور زخم چھوڑے ہیں۔" اس نے حتی المقدور لہجہ سادہ رکھا تھا۔

"اس سے انکار نہیں لیکن تم اسے کولیٹرل ڈیمج سمجھو لو جو ہمیں ایک بہتر مستقبل دینے میں ہوا۔"

"یہ بہتر مستقبل بنا کسی کولیٹرل ڈیمج کے بھی دیا جاسکتا تھا۔" شہاب بھائی نے کہا۔

"ویسے پھر آپ نے اپنے تینوں بچوں کے ساتھ بڑے ابا کے بالکل متضاد رویہ کیوں رکھا؟" طلال نے پوچھا۔

"ہمارا اپنے بچوں کے ساتھ اچھا برا جیسا بھی رویہ ہوتا ہے اس کی سب سے پہلی وجہ ہمارے ماں باپ کا ہمارے ساتھ روا رکھا گیا سلوک ہوتا ہے۔ دادا نے بچوں کی ایجوکیشن یا فیوچر پر کوئی توجہ نہیں دی تھی، اسکول جانا ہے جاؤ نہ جانا ہے نہ جاؤ۔ ہم نے تایا کو دیکھا ہی ہے، اب بھی گاؤں میں کیسی زندگی گزار رہے ہیں، ان کے بچے بھی ویسے ہی ہیں۔ ابا نے خود اپنی زندگی بدلی، سنواری اور پھر ہماری بھی۔ انہوں نے چاچا کو بھی اپنے پاس شہر بلایا، انہیں پڑھایا، کسی قابل بنایا، ان کی کوشش تھی وہ محرومیاں ہمارے حصے میں نہ آئیں۔ جو انہوں نے بھگتیں ان کا طریقہ کیسا تھا یا اس نے ہمیں کس بری طرح متاثر کیا انہوں نے اس نکتے پر توجہ نہیں دی۔ ان کی ترجیح اور مقصد ہمارا پڑھ لکھ کر ایک اچھی نوکری حاصل کر لینا تھی اور دیکھ لو ابا اس میں کامیاب ہیں۔" ثاقب بھائی نے باری باری ان دونوں کو دیکھا۔

"انہیں اپنے ابا سے شکایت تھی، ہمیں اپنے باپ سے شکایت ہے، میرے بچوں کو مجھ سے ہوگی، ان کے بچوں کو بھی ان سے ہوگی، یہی سچ ہے۔ ہم اپنے والدین کی کمیوں، خامیوں اور غلطیوں کو سمجھتے ہیں، ان سے سیکھتے ہیں اور انہیں خود نہ دہرانے کا عزم کرتے ہیں اور مزے کی بات بتاؤں، یہی سائیکل ہمارے بچے بھی دہرائیں گے۔

"آپ کا مطلب ہے ابا کا تربیت کا انداز ٹھیک تھا؟ ان کی ہم پر لگائی بندشیں اور سختیاں صحیح تھیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا لیکن اب میں ان کے اس اسٹائل کے پیچھے کی وجہ اور مقصد کو سمجھتا ہوں۔ میں نے سوچا تھا جو ہمارے ساتھ ہوا، میں اپنے بچوں کے ساتھ وہ سب نہیں کروں گا۔ میں نے خود کو ابا سے یکسر مختلف باپ بنایا۔ بچوں پر سختی نہیں کی اور اب پریشر کے بنا تعلیم مکمل کرنے والے میرے بچے مجھے دوش دیتے ہیں کہ میں نے انہیں ٹھیک سے گائیڈ نہیں کیا۔ عبداللہ نے میری نرمی اور چھوٹ کا وہ فائدہ اٹھایا کہ بالکل ہی لاپروا ہو گیا۔ جب وہ نائنتھ میں فیل ہوا تب مجھے احساس ہوا کہ سختی نہ کرنا اور ایسا چیک رکھنا کہ بچے کو ذمہ داری کا احساس ہو، دو الگ باتیں ہیں۔ عبدالرحمان کہتا ہے بطور باپ میں اس کے رجحانات بہتر سمجھتا تھا اور مجھے اسے کنوینس کرنا چاہیے تھا کہ آئی ٹی اس کے بس کی بات نہیں۔" وہ اداسی سے مسکرائے۔

"خولہ کو بھی شکایت ہے کہ میں بچوں کے فیوچر اور ایجوکیشن کے معاملے میں ڈھیلا ہوں۔"

"اور آپ شہاب بھائی؟" وہ ان کی طرف متوجہ ہوا۔

"میں تو آج تک یہ ہی طے نہیں کر پایا کہ مجھے کیسا باپ بننا ہے ابا جیسا سخت یا ثاقب بھائی جیسا نرم، جب بچوں کو ڈھیل دوں تو یاد آتا ہے کہ ثاقب بھائی کو ایسا کر کے کیا ملا، سختی کرتا ہوں تو اپنے دن یاد آجاتے ہیں۔ ابا اور ثاقب بھائی کے بیچ بیچ میں کہیں شہاب بھی آجاتا ہے۔" وہ ہنسنے لگے۔

"میں نے تو ہمیشہ بہ حیثیت باپ، خود کو بڑے ابا جیسا ہی تصور کیا ہے۔" طلال نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے ابھی سے تمہارے بچوں سے ہمدردی ہے۔" ودیع نے کہا۔

"میں نے تو درمیانی راہ پر چلنے کی کوشش کی لیکن۔ کچھ ملغوبہ قسم کی پیرنٹنگ اسٹائل (تربیت) ہوگئی ہے میری۔" شہاب بھائی کی بات وہ سب ہنس دیے۔

"کبھی سخت ہو جاتا ہوں کبھی نرم، کبھی بچوں کا دوست بننے کی کوشش کرتا ہوں تو کبھی بالکل ابا بن جاتا ہوں۔۔ سچ کہوں تو جب بچے میری بات ہنسی مذاق میں اڑا دیتے ہیں تو لگتا ہے ابا ہی درست تھے، ہماری اولادیں ہماری طرح فرماں بردار نہیں اور ابا کی اتنی سختیاں جھیلنے کے بعد ہم اپنے بچوں سے تھوڑی تو عزت ڈیزرو کرتے ہیں۔"

"ابا کا دور الگ تھا، ہمارا الگ اور انہوں نے اپنے دور سے جو سیکھا، وہ ہم پر لاگو کرنے کی کوشش کی، یہ ہی سچویشن ہماری اور ہمارے بچوں کی ہے۔ ہم کوشش کرتے تو ہیں وقت کے ساتھ چلیں، حالیہ وقت کو مقدم رکھیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ ہمارا اپنے والدین کے رویے کا تجربہ، تجزیہ اور اثر نہیں جاتا، ہم اسے خود سے الگ رکھ ہی نہیں پاتے۔" ثاقب بھائی پرسوچ سے کہہ رہے تھے۔

"ہر بچے کا مزاج مختلف ہے اور ہر دور کا ماحول الگ، ایک ہی قاعدہ، سیم سا اصول ہر بچے اور ہر ماحول میں نہیں لگایا جا سکتا، ہمیں بطور پیرنٹ ہر لمحے انوالو ہونے کی ضرورت ہے اور بچے کے مزاج کے مطابق اسٹریٹجی بدلنا بھی ضروری ہوتا ہے اور یہ دانائی کی باتیں مجھے وقت گزرنے کے بعد اب سمجھ میں آئی ہیں۔" وہ ہنس پڑے۔

"ثاقب بھائی۔ یہ بھی تو سچ ہے کہ ایک وقت کے بعد ہم اپنے والدین اسپشلی اباؤں کو بہتر سمجھنے لگتے ہیں یعنی جب ہم خود اس مقام پر پہنچتے ہیں اور جہاں چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں وہاں۔" شہاب بھائی کہتے ہوئے اچانک اس کی طرف مڑے۔

"ویسے تم ہمارے تجربوں سے سیکھ لو، لیٹ باپ بننے کا فائدہ ہوگا تمہیں۔" وہ مسکرا دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا آج سے پانچ سات سال پہلے وہ اس موضوع پر بات کرتے تو ان کے خیالات ایسے ہی ہوتے؟ شاید نہیں۔ حالات کے پڑھائے سبق کا درست خلاصہ ایک خاص وقت کے بعد ہی سمجھ میں آتا ہے۔

"ویسے تم نے کیا سوچا ہے؟ ابا سے بات کی طوبیٰ کے بارے میں؟"

ثاقب بھائی کے اچانک سوال پر وہ سب ہی ٹھٹھک گئے۔

طلال کی موجودگی میں؟ اس نے بے آرامی سے پہلو بدلا۔ طلال سے اس کا رابطہ کبھی نہیں ٹوٹا تھا پھر بھی طلال نے کبھی اسے طوبیٰ کے نام کی دہائی نہیں دی تھی، اسے اس کی خاطر واپس آنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ وہ اس کا سالا بننے کے بجائے دوست اور بھائی ہی بنا رہا تھا۔

"ابھی تک نہیں کی۔" وہ تینوں اسے جواب طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے، اسے کہنا پڑا۔

"مطلب۔ تمہارا ارادہ تو ہے نا، تم نے کچھ اور تو نہیں سوچ رکھا ہے؟" شہاب بھائی نے جھجکتے ہوئے طلال کو دیکھا۔

"ظاہر ہے۔" اس نے کہا اور ان تینوں کے چہروں پر سکون پھیلا۔

"تم خود سے نہیں کہہ پا رہے تو کہو، میں بات کرتا ہوں۔" ثاقب بھائی نے بڑے بھائی ہونے کا ثبوت دیا۔

"ویسے حیرت ہے کہ ابا نے اب تک تم سے اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔"

اب تو شہاب بھائی جیسی حیرت اسے بھی ہونے لگی تھی۔

"میں جلد ابا سے خود ہی کروں گا بات۔" اس نے موضوع وہیں ختم کرنے کے لیے مضبوط لہجے

میں کہا۔
اس رات ثاقب بھائی کی باتوں نے اسے سونے نہیں دیا۔

☆☆☆

وہ بڑے ابا کے ناشتے کے برتن لے کر واپس آئی تو خولہ نے بغور اسے سر سے پیر تک دیکھا۔
"مانا بہت وقت ہو گیا ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ تمہارے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی ہو۔"
اس بے تکی تمہید پر اس کی پیشانی ناگواری کے اظہار میں شکن زدہ ہو گئی۔
"اب تو کچھ بن سنور کے رہا کرو، آخر شوہر ہے وہ تمہارا۔" وہ اس کی سادگی پر اکثر چوٹ کرتی رہتی تھیں لیکن آج اس کے پیچھے کا مقصد اسے بہت برا لگا۔
"آپ میری فکر چھوڑ دیں بھابھی! اور اپنے شوہر کے لیے مجھے کیا کرنا ہے کیا نہیں، یہ مجھے طے کرنے دیں۔" اس نے غصہ چھپایا نہیں تھا۔
کمرے میں آتے آتے اس کے آنسو گرنے لگے تھے۔ اپنی کم صورتی کے احساس کے ساتھ خولہ کے مشورے کے پیچھے چھپی بات اسے اپنی ذات کی ہتک محسوس ہوئی تھی۔ وہ صاف صاف نہیں کہہ سکتی تھیں کہ اسے اداؤں اور دوسرے ہتھکنڈوں سے رجھاؤ کہ ایسے تو تم میں متوجہ کرنے والی کوئی بات نہیں، ان کی بات کا یہ ہی مطلب اس کے کانوں میں گونجا تھا۔
اس کا سہما دل ودیع کے رویہ اور باتوں پر خوش ہونے ہی لگا تھا کہ انہوں نے اس کے سامنے یہ آئینہ رکھ دیا۔
"میں اسے ناپسند نہیں۔" وہ آئینے کے سامنے کھڑی ودیع کی نظریں اور باتیں یاد کر رہی تھی۔
"شاید اس وقت میں اسے اچھی نہ لگتی ہوں لیکن اب اچھی نہیں تو بری بھی نہیں لگتی ہوں۔" اس کے دل و دماغ یک زبان کہہ رہے تھے اور خولہ کی بات سے بگڑا مزاج ٹھیک ہونے لگا۔ خولہ کے بجائے اپنے دل دماغ کی سنتا عقل مندی تھی۔
وہ بڑی امی سے کام کی کوئی بات کرنے باہر جا رہی تھی کہ پورچ سے آتی ودیع کی آواز پر رک گئی۔ اس کی دانست میں اس کی امی اور بڑی امی وہاں بیٹھی تھیں۔
"ایسا کچھ نہیں ہے امی۔"
"تو بیٹا! اب اپنے ابا سے بات کر لو۔ سب نے بہت صبر کیا ہے۔ طلال اور منیزہ نے بھی دباؤ نہیں ڈالا، تقاضا نہیں کیا لیکن ہم مزید ان کا صبر نہیں آزما سکتے، یہ زیادتی ہو گی۔ ایسا نہیں ہے کہ انہیں پروا نہیں تھی، وہ بھی بہت فکر مند تھے، لوگوں کے سوالوں کا سامنا انہیں بھی کرنا پڑتا تھا مگر اس گھر کے حالات وہ سمجھتے ہیں پھر طوبیٰ نے بھی شاید انہیں روک رکھا ہو گا کہ وہ اپنی ذکر سے اپنے بڑے ابا کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تم وہیں نوکری کرنا چاہتے ہو، کرو مگر اب اسے ساتھ لے جاؤ بیٹا، اپنا سنسار شروع کرو، تمہیں بھی اب خود کو ان آسودگیوں سے دور نہیں رکھنا چاہیے۔"
وہ دم سادھے ودیع کی آواز کی منتظر تھی کہ گیٹ کے باہر بجے ہارن نے اسے موقع نہیں دیا۔ ودیع اٹھ کے گیٹ کھولنے چلا گیا اور وہ گہرا سانس بھرتی واپس آ گئی۔
کمرے میں آ کر وہ بے چینی سے ادھر سے ادھر ٹہلنے لگی۔ اسے فیصلہ کرنا تھا کہ ودیع کو سچ بتا دے یا اس سچائی کے بنا ہی اسے فیصلہ کرنے دے۔ اتنا تو وہ جان گئی تھی کہ وہ اس سے پیچھا چھڑانے نہیں آیا اور اس ادراک نے اس کے اندر اپنی خطا کے احساس کو بڑھا دیا تھا۔

☆☆☆

نو سال پہلے کا وہ فیصلہ کن دن وہ کیسے بھول سکتی تھی جس نے ان سب کی زندگیوں کا رخ موڑ دیا تھا۔ وہ بڑے ابا سے بحث کے بعد اپنی فائلیں اور فولڈرز لیے جانے کس کام سے باہر گیا تھا۔ گھر میں قبرستان جیسا سناٹا اور وحشت پھیلی تھی۔ اس سے قبل

ایسی جرأت کسی نے نہیں کی تھی۔

''اب کیا ہوگا؟'' بہت دیر وہ بھی سہمی سی اپنے کمرے میں دبکی سوچتی رہی پھر دبے پاؤں باہر نکلی تاکہ ودیع کو اپنی طرف سے سمجھاتے، قائل کرنے کی کوشش کرے۔ دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو کمرہ خالی تھا۔ وہ مایوس سی باہر آئی کہ زینے پر بیٹھ کر اس کے آنے کا انتظار کرے گی۔

''کہاں چلے گئے؟ کب تک آؤ گے؟'' اس نے اسے پیغام بھیجا۔

زینے کے پاس پہنچی تو نیچے پڑی بلیو رنگ کی چیز نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ وہ اسے اٹھا کر سیدھی ہوئی ہی تھی کہ آہٹ پر مڑی، بڑے ابا نے بھی اس کے ہاتھ میں پاسپورٹ دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے ہاتھ بڑھایا اور طوبیٰ نے انہیں تھما دیا۔ انہوں نے کھول کر دیکھا اور اندر چلے گئے حالاں کہ انہیں دیکھ کر لگ رہا تھا وہ گھر سے باہر جانے کے لیے تیار ہوئے تھے۔

''یہ غصے اور عجلت میں گھر سے نکلتے ہوئے شاید ودیع کے فولڈر سے گرا ہوگا۔''

اس نے سوچا اور وہیں بیٹھ گئی۔ اس کی واپسی کے انتظار میں شام کا اندھیرا پھیلنے لگا لیکن وہ نہیں آیا۔ آخر بڑی امی اور امی کی آوازوں پر اسے اٹھ کر اندر جانا پڑا۔

جانے وہ کب واپس لوٹا تھا اور اسے پاسپورٹ کی خبر کب ہوئی تھی لیکن رات میں بڑے ابا نے جو کہا، وہ سن کر تو اس کے سر پر آسمان گرا تھا۔

''پاسپورٹ چاہتے ہو تو جانے سے پہلے طوبیٰ سے نکاح کرلو۔''

ہر کوئی اس انوکھی بات پر سکتے میں تھا۔ گھر میں طلال اور ودیع کے لیے لڑکیاں دیکھنے کی باتیں ہوتی رہتی تھیں حالاں کہ وہ دونوں ''تین چار سال تک شادی کا ارادہ نہیں'' کہہ چکے تھے۔ اسے اپنی امی اور بڑی امی کی خواہش کی بھنک بھی تھی، یہ ہی اس کے دل کی تمنا بھی لیکن یہ اس طرح منوایا جائے۔ وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔

بڑے ابا کا جملہ ختم ہوتے ہی ودیع نے اس قدر حیرت، بے یقینی اور جلال سے اسے دیکھا تھا کہ اس کی ہستی وہیں ڈھے گئی۔ ایک ذرا سی آس جو تھی وہ بھی ٹوٹ گئی۔

اسے اپنے بارے میں کوئی خوش گمانی نہیں تھی۔ گوری چٹی شکلوں والے خاندان کی وہ واحد سانولی لڑکی تھی۔ نقوش عام سے ہوں تو گوری رنگت پر اسے بھی حسینوں میں شمار کرلیا جاتا ہے پر یہاں تو صورت بھی عام سی تھی اور رنگت بھی۔ بڑی امی، امی، خولہ اور ناہید بھابھی سب ہی اجلی گلابی جلد کی مالک تھیں۔ ایسے میں ودیع کا اسے اس حیثیت سے ناپسند کرنا بڑی عام سی اور ممکن بات تھی۔

ایک دن بعد کی اس کی ٹکٹ تھی۔ وہ یہاں نوکری سے استعفیٰ دے کر بیرون ملک میں تین سال کا معاہدہ قبول کر چکا تھا۔ اس نے بالا ہی بالا سب کچھ طے کر کے آخری وقت گھر میں اطلاع دی تھی پھر بھی بڑے ابا نے اس کے لیے کوئی راہ نہیں چھوڑی تھی۔

آخر پاسپورٹ کی بازیابی کے لیے اس نے سب کے سامنے اسے بطور منکوحہ قبول کرلیا اور وہ ٹوٹ پھوٹ گئی۔ وہ اسے پسند نہیں کرتا تھا لیکن اب وہ اس سے نفرت کرتا تھا۔ اس کا پچھتاوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ آزاد ہونا چاہتا تھا اور اس نے اسے پہلی قید سے بڑی جیل میں ڈال دیا تھا۔

''کاش وہ پاسپورٹ نہ اٹھاتی، اٹھا لیا تو چھپا لیتی بڑے ابا کو نہ دیتی!''

وہ کتنے دن دل تھامے انتظار میں رہی کہ اب اس نے طلاق بھیجی کہ جب بھیجی لیکن جب مہینوں گزر گئے تو اسے یقین ہوگیا کہ بڑی امی نے اسے کوئی قسم دے کر روک رکھا ہے اور وہ مزید ملال میں گھر گئی کہ اس کے ساتھ ہر کوئی جبر اور زبردستی ہی کر رہا تھا۔

خولہ بھابھی الگ اسے بار بار احساس دلاتی رہتیں کہ بے چارے کے ساتھ بہت برا ہوا ہے۔

عام حالات میں اس بے جوڑ رشتے پر وہ کبھی مان ہی نہیں سکتا تھا۔

الٹے سیدھے دلائل اور نئے نئے نکتے اٹھا کر، خوف دلا کر اس نے امی اور بڑی امی کو رو کے رکھا تھا کہ اس کی شادی، رخصتی کو لے کر ودیع پر کوئی دباؤ نہ ڈالا جائے نہ تقاضا کیا جائے۔

لیکن بڑی امی کچھ وقت ہی اس کی بات مان سکیں۔ وہ اور ثاقب بھائی ہی تھے جو اس سے طوبیٰ کو ساتھ لے جانے کا کہتے تھے، اس سے اس موضوع پر بات کرتے تھے۔ وہ ہر بار 'ہاں آؤں گا' اتنا کہتا تھا اور انہیں یہ ہی اطمینان ہو جاتا کہ کم سے کم وہ یہ رشتہ ختم کرنے کی بات نہیں کرتا ہے۔ جس ثابت قدمی سے وہ باہر رہ رہا تھا، اس بات نے بھی ان سب کو محتاط کر دیا تھا۔ سب کے دلوں میں ڈر تھا کہ اسے مزید کوئی ضد نہ دلائی جائے۔ دوسرے وقت کے ساتھ ذمہ داریاں بڑھیں تو دونوں بھائی مصروف بھی زیادہ ہو گئے تھے۔ خود اپنے بچوں میں الجھ کے رہ گئے تھے۔

بڑے ابا کو یقین تھا، وہ سال دو سال یا اپنا معاہدہ ختم ہونے پر تو واپس آ ہی جائے گا، تاہم گزرے وقت نے انہیں اس کی ضد کا احساس کرایا۔

ان کی مان کر وہ انہیں ہی سزا دے گیا تھا، اس انکشاف نے انہیں توڑ کے رکھ دیا تھا۔

طوبیٰ کی زندگی کی ویرانی بھی ان کی وجہ سے تھی، اس پر وہ صابر بچی نہ آہ کرتی تھی نہ اف۔ اس کی تابع داری اور محبت نے انہیں اور جھکا دیا۔ انہوں نے تو یہ سوچا تھا کہ نکاح کر کے وہ اس کی واپسی یقینی بنا رہے ہیں۔ ان کی شرط نے دو زندگیاں ویران کر دی تھیں، یہ احساس جرم انہیں سر تا پا بدل گیا تھا۔ انہوں نے ثاقب اور شہاب کے بچوں کے معاملات سے خود کو بالکل الگ کر لیا تھا۔

''کیا میں نے زندگی میں بچوں پر صرف ظلم اور سختیاں ہی کی ہیں؟ میں نے ان کے لیے کوئی اچھا کام نہیں کیا؟''

راتوں کو نیند نہیں آتی تو وہ بیوی سے پوچھتے اور وہ اٹھ کے بیٹھ جاتیں۔

''آپ نے وہ سب کیا ہے جس کی وجہ سے آج آپ کے بچے خود مختار اور کام یاب ہیں، معاشرے میں مقام اور عزت رکھتے ہیں۔ آج نہیں تو کل بچے بھی سمجھ جائیں گے۔ آپ ایسا نہ سوچا کریں،'' وہ انہیں یقین دلانے کی کوشش کرتیں اور وہ افسردگی سے مسکرا دیتے کہ وہ انہیں بہلا رہی ہیں۔

☆☆☆

وہ کمرے سے باہر نکلی تو فیصلہ کر چکی تھی۔

دستک سن کر ودیع نے اندر آنے کی اجازت دینے کے بجائے اٹھ کے دروازہ کھولا اور سامنے طوبیٰ کو دیکھ کر واضح حیران ہوا۔

''مجھے کچھ بات کرنی ہے، اندر آ جاؤں؟'' اس کا سوال اس کی یہاں موجودگی سے زیادہ اچنبھے والا تھا۔

اس نے دروازے سے ہٹ کر اسے اندر آنے کی جگہ دی۔ وہ دروازہ بند کر کے پلٹا تو وہ کمرے کے وسط میں کھڑی سراپا اضطراب اور اضطرار تھی۔

''ودیع!'' اس نے خود کو وقت نہیں دیا مبادا ارادہ بدل ہی نہ جائے اور بنا کسی تمہید کے کہنا شروع کیا۔

''اس دن تمہارا پاسپورٹ مجھے زینے پر پڑا ملا تھا اور میں نے ہی وہ بڑے ابا کو دیا تھا۔ اگر اس وقت میں نے تمہیں وہ واپس کر دیا ہوتا، کہیں چھپا دیا ہوتا یا بڑے ابا کے مانگنے پر انہیں انکار کر دیتی تو وہ سب نہ ہوتا۔ بڑے ابا تمہیں نکاح کے لیے مجبور نہ کرتے اور نہ تمہیں اتنے سال پردیس میں گزارنا پڑتے۔

مجھے اس وقت بھی اس بات کا بہت افسوس اور دکھ تھا، آج بھی ہے کہ تمہیں اپنا خواب پورا کرنے کے لیے اس طرح بلیک میل ہونا پڑا، تمہیں زبردستی ایک ان چاہے اور ناپسندیدہ رشتے میں بندھنا پڑا اور پھر اس سے بچنے کے لیے تمہیں سب سے دور رہنا پڑا

اور اب پھر تمہیں ہر کوئی پریشر ائز اور بلیک میل کر رہا ہے۔ ان سب کی وجہ میں ہوں، نہ میں وہ پاسپورٹ بڑے ابا کو دیتی نہ۔"

جس تیزی سے وہ بول رہی تھی اسی رفتار سے اس کے آنسو بھی گر رہے تھے۔ پاسپورٹ والی بات اس کے لیے نئی ضرور تھی لیکن اب وہ بات اہم نہیں رہی تھی۔

"طوبیٰ!" اس نے پاس آ کر اسے شانوں سے تھام کر روکا۔

"ان سب کی ذمہ دار تم نہیں ہوئے" وہ اور تیزی سے رونے لگی۔

"تم غصہ کرو گے، مجھے برا بھلا کہو گے تو مجھے برا نہیں لگے گا۔" اس نے گردن ہلکی سی خم کر کے التجائیہ انداز میں کہا اور روتے ہوئے مسکرائی۔

"مجھے کبھی تم پر غصہ نہیں آیا طوبیٰ۔" اس نے گرفت مضبوط کرتے ہوئے اسے ہلکے سے جھنجھوڑا۔

"تم اتنے وقت سے یہ سب سوچتی رہی ہو؟" اس کی آواز تاسف سے لبریز تھی۔

"میں تم سے یا اس رشتے سے بچنے کے لیے سب سے دور نہیں تھا۔" اس نے ایک ہاتھ شانے سے ہٹا کر اس کے آنسو صاف کیے۔

"پھر نو سال تک تم آئے کیوں نہیں ودیع؟" اس نے آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"یہ جاننے کے لیے تمہیں پہلے مجھ سے یہ پوچھنا چاہیے کہ میں کیا سوچ کر گیا تھا؟" اس نے دوسرا ہاتھ بھی اس کے شانے سے ہٹایا اور تھوڑا پیچھے ہو کر گہری سانس لی۔

"تم کیا سوچ کر گئے تھے ودیع؟" طوبیٰ نے پہلے سوال کے انداز میں ہی پوچھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے، میں کیوں گیا تھا؟"

"تمہیں تو ہر حال میں جانا تھا جس کے لیے تم نے بڑے ابا کی شرط بھی منظور کر لی تھی، تمہارا خواب، تمہاری خواہش باہر جانا تھی، وہ پوری ہو گئی تو۔"

"نہیں طوبیٰ!" وہ تڑپ کے آگے آیا۔ "میری خواہش، میرا خواب تم تھیں جسے ابا نے مجھ سے چھین لیا تھا۔" اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"ابا مجھے جانے دیتے، کچھ وقت بعد مجھے واپس آ ہی جانا تھا لیکن وہ کیسے مجھے میری پسند اور مرضی سے کچھ کرنے دے سکتے تھے؟ انہوں نے ساری عمر ہمیں غلاموں کی طرح اپنی مرضی پر نچایا، انہیں ہماری ڈور ہلانے اور ہمیں اسی کے مطابق حرکت کرتے دیکھنے کی عادت تھی، ان کے مطابق ہماری زندگیوں پر اختیار صرف ان کا تھا۔ پتا نہیں انہوں نے یہ جان بوجھ کر کیا تھا یا انجانے میں کہ میری خوشی، میری خواہش کو انہوں نے اپنی ضد بنا لیا، انہوں نے مجھے اپنی مرضی کرنے کی سزا دینے، اپنے آگے جھکانے کے لیے تمہیں استعمال کیا تھا، میں نکاح سے انکار کر کے باہر نہ جاتا تو وہ جیت جاتے اور نکاح کر کے باہر جاتا تو بھی ان کی شرط مان کر انہیں جتا دیتا، ہر حال میں جیت ان کی تھی اور یہ مجھے قبول نہیں تھا۔ میں انہیں شکست دینا چاہتا تھا ایسی کہ سارے بدلے پورے ہو جاتے، میں انہیں دکھانا، جتانا چاہتا تھا کہ وہ ہر بار اپنی مرضی نہیں چلا سکتے، ہر بار انہیں ان کی پسند کے نتائج نہیں مل سکتے، ان کی ساری جوڑ توڑ ناکام بھی ہو سکتی ہے، ان کی حکم عدولی بھی ہو سکتی ہے، ان کے منصوبے فیل بھی ہو سکتے ہیں، جبر کا انجام ساری عمر کا پچھتاوا بھی ہو سکتا ہے اور۔۔۔"

"اور میں ودیع، میرے بارے میں کیا سوچا تھا؟ بڑے ابا کی چہیتی ہونے کی سزا مجھے بھی ملنی چاہیے، مجھے بھی ان کی بات مان لینے پر زندہ درگور ہو جانا چاہیے؟" ودیع کو مخاطب کرتے ہوئے پہلی دفعہ اس کا لہجہ ٹوٹا بکھرا سا تھا۔

"نہیں طوبیٰ!" وہ اس کے اتنے قریب آیا کہ ایک قدم کا فاصلہ بھی نہیں رہا۔

"میں خود کو سولی پر لٹکائے بنا انہیں ہرا نہیں سکتا تھا۔ انہیں غلطیوں کا احساس ہو، اس لیے ضروری تھا کہ میں یہ دکھ، یہ ہجر سہتا اور"

"اگر تمہیں مجھ سے محبت تھی تو میرا احساس کیوں نہیں کیا۔؟ کیا یہ دکھ تمہارا اکیلے کا تھا؟ سولی پر صرف تم لٹکے تھے؟ مجھ سے کیوں نہیں پوچھا، مجھے اس سزا میں شامل ہونا بھی ہے یا نہیں، میں یہ دکھ اٹھانا چاہتی بھی ہوں یا نہیں، مجھے اتنے سالوں کی دوری منظور ہے یا نہیں؟"

وہ بری طرح رونے لگی اور ودیع کو یقین نہیں آیا، ایسی حیرانی تھی کہ پل بھر کو اس سے گویائی ہی چھن گئی۔

"تم خود کو سزا دے رہے تھے، بڑے ابا کو شکست اور میں۔۔؟ میری حیثیت، میری فیلنگز، میری مرضی،" ودیع نے خود پر قابو پا کر اس کے ہاتھ ہاتھوں میں لیے۔

"سوری طوبیٰ۔" ہاتھ اوپر اٹھا کر اس نے سر جھکا کر ان پر ماتھا ٹکایا۔ اس کے انداز میں ندامت اور تڑپ تھی۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا اس پروسس میں، میں تمہیں اتنا ہرٹ کر رہا ہوں۔" اسے واقعی اس انکشاف نے ہلا دیا تھا۔

دونوں کے مفروضے غلط تھے لیکن المیہ یہ تھا کہ اس بات پر اس لمحہ خوش کوئی نہیں تھا۔

"میں نے صرف اپنے لیے یہ سزا چنی تھی، میں یہاں آنے سے اس لیے ڈرتا تھا کہ تم مجھ سے اپنی بات منوا کر یہ رشتہ ختم کرنے کا نہ کہہ دو یا ابا ہی میری حرکت پر مجھے تم سے الگ ہونے کا حکم نہ صادر کر دیں اور تم اپنے بڑے ابا کی بات ایک بار پھر مان جاؤ۔"

"تم پاگل ہو ودیع؟ کیسی باتیں کر رہے ہو تم۔ تم ایک لڑکی سے نکاح کر کے اسے نو سال تک پلٹ کر نہ دیکھو اور سوچو کہ یہ صرف تمہارے لیے سزا ہے، ایسا کیسے کر سکتے ہو تم، وہ بھی اس وقت جب تمہیں اس لڑکی سے محبت کا دعوا بھی ہے؟"

اس نے ودیع کی گرفت سے ہاتھ چھڑا کر اس کے سینے پر مارا۔ ودیع نے اسے سنبھالنے سمیٹنے کی کوشش کی لیکن طوبیٰ زخمی اور بپھری تھی۔ اس سے یہ اعتراف، یہ اظہار سنبھل نہیں رہا تھا۔ اسے اب تک اتنا غصہ نہیں آیا تھا جتنا یہ جان کر آیا کہ وہ اس کی محبت میں گرفتار اس سے دور تھا۔ اسے اب اپنے اتنے سالوں کے غم اور پچھتاوے کا غصہ بھی اس پر آ رہا تھا۔

"تم سے بڑا بے وقوف اور خود غرض اس دنیا میں نہیں ہوگا۔" اس نے پوری قوت لگا کے خود کو اس سے دور کیا۔

"میں اب تک یہ ہی سوچتی رہی کہ تمہیں میں پسند نہیں تھی اور بڑے ابا نے زبردستی تمہارے ساتھ باندھ دیا، اس بات پر تم ناراض ہو اور اس بات پر تمہارا نہ آنا مجھے قبول بھی تھا لیکن تم مجھ سے محبت کے باوجود، مجھے اپنے ساتھ رکھنے کی خواہش کے باوجود محض اپنی ضد اور انا کی خاطر نو برس گنوا کے آئے ہو، وہ بھی اپنے بوڑھے، بیمار اور پیار کرنے والے باپ کو سبق سکھانے، سزا دینے اور اب چاہتے ہو میں تمہاری محبت کا یقین کر لوں،" اس نے دریا بنے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔

"کاش تم نہ آتے ودیع! تم جاؤ واپس اور اب کبھی مت آنا۔" وہ جانے لگی۔

"طوبیٰ!" اس نے سامنے آ کر راستہ روکا۔

"ایم ریئلی سوری۔ تم میری بات تو سنو،" وہ اس کے پاس سے نکل کر جانے لگی تھی کہ اس نے بازو پکڑ کر روکا۔

"سب کچھ تو سن لیا اور کیا رہ گیا ہے سننے کے لیے؟" اس نے بازو چھڑایا۔

"مجھے تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنی، یہی سمجھو تم کہ میں نے تمہیں اسی لیے بلایا تھا تاکہ یہ رشتہ ختم کر سکوں، ختم کر دیا۔ اب جاؤ۔" اس نے ودیع کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

"میں گھر میں سب سے بات کر لوں گی۔ تم اپنی ریٹرن ٹکٹ بک کروا لو۔" وہ تیزی سے باہر نکلی اور اپنے پیچھے دروازہ زور سے بند کیا۔

ودیع کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا ہنسے، روئے، اس کے پیچھے جا کر اسے منائے یا یہیں بیٹھ کر ماتم کرے۔

☆☆☆

صبح وہ دیر سے جاگی اور اس کے بعد بھی سستی سے بستر پر پڑی رہی۔ جب باہر کا شور کم ہوا اور چائے کی طلب نے ناراض ہو کے دھپ دھپ کرتے ہوئے سر کا رخ کیا تو وہ اٹھ کر باورچی خانے میں آئی۔

وہ جو شور کم ہونے پر سمجھ رہی تھی، سب ناشتے سے فارغ ہو کر کام کاج پر نکل گئے ہیں اور بقیہ کمروں میں بند ہیں، بڑے ابا کے کمرے کا کھلا دروازہ اور اندر ٹھونس کر بھرے سارے افراد کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

چائے بناتے ہوئے اس اجتماع پر غور کرتے ہوئے خیال آیا کہ کہیں بڑے ابا کی طبیعت نہ بگڑ گئی ہو اور وہ تیزی سے بھاگنے کے ارادے سے پلٹی ہی تھی کہ خولہ سے ٹکرا گئی۔

"توبہ!" انہوں نے سر سہلایا۔ "کہاں جانے کی جلدی ہے اب تمہیں؟"

"وہ بڑے ابا،" دل تو کر رہا تھا انہیں ہاتھ سے ایک طرف دھکا دے کر بھاگے لیکن خولہ کے ساتھ تحمل کی عادت سی ہو گئی تھی۔

"ہاں بڑے ابا ہی پلان بنا رہے ہیں سارے اب بھی، آخر تمہاری اور اس گھر کی۔ مطلب ان کی اولاد کی آخری شادی ہے۔" وہ فوراً اپنے تاثرات چھپانے کے لیے پلٹ کر چائے کپ میں نکالنے لگی۔ اس کا پارہ ایک دم آسمان چھو گیا تھا۔

"ویسے امید نہیں تھی مجھے ودیع خود سے بات کرے گا اور بڑے ابا بلا بلا چوں چراں مان جائیں گے۔ ذرا باقی سب کی بھی چائے بنا لو، میں تب تک۔"

"آپ خود بنا لیں، میرے سر میں درد ہے۔" اس کا دماغ ایسے گھوما تھا کہ وہ ان سے روا رکھا جانے والا تحمل، عادت سب بھول کر ہکا بکا کھڑی خولہ کو دیکھے بنا اپنا کپ لیے کمرے میں آ گئی۔

اس چالاکی نے اسے مزید بھڑکا دیا تھا۔ غصے نے واقعی اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم کر دی تھی، ذہن ماؤف تھا۔ وہ بس بے انتہا غصے میں تھی اور بہت کچھ کرنے کی خواہش میں پاگل ہو رہی تھی۔

ذرا دیر بعد خیال آیا کہ مجلس برخاست ہوتے ہی امی اور بڑی امی ادھر آئیں گی تو وہ سنبھل گئی۔ جا کے منہ دھویا، حلیہ درست کیا اور آئینے کے سامنے آئی تو چہرہ دیکھتے ہی ودیع کے الفاظ کانوں میں گونجنے لگے۔

"میری خواہش، میرا خواب تم تھیں!"

"اونہہ!" اس نے سر جھٹکا۔ "نو سال۔" وہ اس بے وقوفی، اس ظلم کو ہضم نہیں کر پا رہی تھی۔

"بڑے ابا سے ودیع کو اتنی نفرت تھی۔" کہیں سے اڑتا اڑتا آیا خیال ذہن پر سایہ فگن ہو گیا۔

"محبت اتنی کمزور اور نفرت اتنی طاقت ور،" وہ آئینے میں خود کے عکس سے باتیں کرنے لگی۔

"نہیں نفرت تو نہیں۔ یہ ضد تھی۔۔ ضد اور بڑے ابا کو غلط ثابت کرنے کا جنون۔"

"لیکن بڑے ابا یہ تو ڈیزرو نہیں کرتے۔۔" افسوس پھر غصے میں ڈھل گیا۔

"اس نالائق نے کیوں نہیں سمجھا!"

☆☆☆

عین توقع کے مطابق ذرا دیر بعد امی اس کے کمرے میں آئیں۔

اگلے اتوار کو تقریب تھی اور اس کے بعد ودیع کے ساتھ اس کی روانگی۔ ان کے پیچھے بڑی امی بھی چلی آئیں اور وہ سعادت مند و مثالی بیٹی کی طرح غصے سے جھکے سر کو شرم سے جھکا سر جتاتی ان کی سنتی رہی۔

اسے شرم کے پیچھے چھپ کے سارا دن کمرے میں بند رہنے کا بہانا مل گیا تھا۔ اگلے دن صبح ہی صبح اسے پتا چلا ان دونوں کا اپائنمنٹ ہے میرج رجسٹریشن کے سلسلے میں جو اس کے ویزا کی درخواست کے لیے اہم اور ضروری تھا۔ ساتھ ہی

اسے بتایا گیا کہ جلد ہی اسے ویزا کے لیے ودیع کے ساتھ ایمبیسی بھی جانا ہے اور وہ تلملا کے رہ گئی۔

"کیا ثاقب بھائی، بڑی امی یا امی نے ودیع کے ساتھ پہلے ہی سب طے کر لیا تھا؟" یہ سب راتوں رات تو نہیں ہو سکتا تھا۔

اسے جانے کے لیے تیار ہونا پڑا۔ جو ودیع سے کہہ دیا تھا اور اس پر جتنا بھی غصہ تھا، وہ یہ گھر میں کسی کو نہیں بتا سکتی تھی۔ عبایا پہننے سے پہلے سوچا کہ بڑے ابا کی دوپہر کی دوائیاں نکال کر رکھ آئے۔ ادھ کھلے دروازے کو ہاتھ بڑھا کے پورا کھولتی اس سے قبل ثاقب بھائی کی آواز پر رک گئی۔

"ڈیپنڈنٹ ویزا اتنی جلدی شاید نہ ملے اس لیے اس وقت ٹورسٹ ویزا پر ہی جائے گی۔"

"اچھا۔" بڑے ابا کی نحیف سی آواز سوچ کے وزن سے بھاری محسوس ہو رہی تھی۔

"ودیع بیٹا! تمھاری مجھ سے جو ناراضی اور غصہ ہے اسے طوبیٰ پر...."

"میں آپ سے ناراض نہیں ہوں ابا نہ مجھے کسی پر غصہ ہے۔" اس نے یہ مشکل بات بمشکل کہہ ڈالی۔

"ابا!" ثاقب بھائی نے ودیع کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ دیا۔

"آپ کا سخت مزاج کبھی ہمیں گراں گزرتا تھا اس وقت ہمیں اتنی سمجھ نہیں تھی لیکن اب غصہ ناراضی جیسی کوئی بات نہیں ہے۔ ودیع نے اتنا وقت کیوں لگایا، پہلے کیوں نہیں آیا، ان سب پر اب بات کریں نہ ہی غور تو بہتر ہوگا۔"

اولاد کو والدین کی بے غرض محبت اور نیت کا یقین آجائے تو پھر پہاڑ جیسے شکوے شکایتیں بھی پس پشت پر چلے جاتے ہیں اور ثاقب بھائی اس مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں ان کے پاس یہ یقین تھا۔

"ابا!" وہ ثاقب بھائی کا ہاتھ آہستگی سے ہٹا کر ان کے قریب فرش پر بیٹھ گیا۔

"میں اپنے تین سال کے کانٹریکٹ کے بعد واپس آنے والا تھا اور اس وقت آپ مجھے طوبیٰ سے شادی کا کہتے تو میں خوشی خوشی مان جاتا کہ طوبیٰ مجھے اس وقت بھی پسند تھی لیکن اس وقت شادی کی شرط مجھے ضد دلا گئی تھی۔ آئی نو میں نے غلط سمجھا اور اس کے بعد بھی غلط کیا لیکن اب میں سب ٹھیک کرنا چاہتا ہوں۔"

اسے لگنے لگا تھا کہ ابا کو بھی احساس ہے کہ ان کا رویہ غلط اور ضرورت سے زیادہ سخت تھا جس نے بچوں پر برا اثر ڈالا اور اب وہ یہ ہی بات جتا کر انہیں شرمندہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

اس نے ان کے کمزور سے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"آپ میری ساری بدتمیزیوں، نادانیوں اور بے وقوفیوں کے لیے مجھے معاف کر دیں۔" ان کا طنطنہ اور ان کی حکومت کو سرنگوں دیکھنے کی شدید خواہش کے ہوتے ہوئے بھی اسے بیمار اور لاغر باپ کو دیکھ کر رتی برابر خوشی نہیں ہوئی تھی۔ بڑے ابا نے ڈبڈبائی آنکھوں کے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"جیتے رہو بیٹا۔" وہ مزید کچھ کہہ رہے تھے لیکن وہ واپس کمرے میں آگئی۔ جانے انہوں نے کیا کہا ہوگا لیکن وہ اپنے بڑے ابا کو بچوں سے معافی مانگتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اسے بہت رونا آرہا تھا۔ یہی سب بہت پہلے بھی ہو سکتا تھا، یہ دوریاں کب کی سمٹ جاتیں اگر وہ پہلے آجاتا۔

"اگر تم پہلے میسج کر دیتیں!" اندر سے آواز آئی۔

وہ ثاقب بھائی کے ساتھ ان کی کار میں رجسٹرار کے دفتر آئے تھے۔

وہاں سے واپسی پر جب وہ ودیع کے ساتھ باہر آئی تو ثاقب بھائی کا کہیں پتا نہیں تھا۔ معاملہ سمجھتے ہی اس نے دائیں طرف سے آرہے رکشا کو روکنے کے لیے آگے جا کر ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ ودیع نے پیچھے سے لپک کر اس کا ہاتھ نیچے کیا۔

"ثاقب بھائی کسی کام سے گئے ہیں، تب تک ہم بات کر لیں۔" وہ جتاتے ہوئے مسکرایا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے جو یہاں ہو سکتی ہے مگر گھر میں نہیں، دوسرے مجھے تم سے کچھ نہیں کہنا سننا۔" اس نے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

"میرج رجسٹرار کے آفس کے باہر کھڑے ہم لڑ رہے ہیں اور تمہیں پتا ہے، دو انسانوں کے میرڈ ہونے کا ثبوت لڑائی سے بڑھ کر کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔"

وہ لب بھینچے چپ رہی۔

"مجھے تو یہ بھی نہیں پتا تمہیں کہاں کے سموسے اچھے لگتے ہیں۔" کچھ دیر اس کے تنے سے چہرے کو دیکھتے رہنے کے بعد ودیع نے افسوس سے کہا۔

"کہیں کے پسند بھی ہوتے تو میں نہ ان کے لیے جان دے سکتی ہوں نہ کچھ مان سکتی ہوں۔" اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہی اس نے تنک کر کہا۔

"جان تو تمہاری مجھے بھی عزیز ہے، بس مانو گی کیسے یہ بتا دو۔" وہ قریب ہوا اور وہ دور۔

"تم کسی خوش فہمی میں مت رہو، میں صرف بڑے ابا کی وجہ سے چپ ہوں اور تمہاری یہ حرکتیں میرے غصے کو مزید ہوا دے رہی ہیں۔"

"شکریہ۔" اس نے احترام سے سر خم کیا۔ بس کون سی حرکتیں غصہ دلا رہی ہیں، ان کی نشان دہی کر دو۔"

"یہ جو تم فضول ہیرو بننے کی کوشش کر رہے ہو وہ اور یاد رکھو، زبانی محبت کے دعوے مجھے امپریس نہیں کرتے، خود کو اس زعم سے باہر نکالو، نو سال سے تم جو کر رہے تھے، وہ محبت ہرگز نہیں تھی، رکشا!" اس نے بروقت آواز دی تھی۔ رکشا اس کے سامنے آن رکا۔ اندر بیٹھتے ہی اس نے۔ 'چلو بھیا' کہا تو وہ ہوش میں آ کر رکشا میں سوار ہوا ورنہ طوبیٰ کا ارادہ اسے چھوڑ کر نکل جانے کا تھا۔

"کہاں جانا ہے؟" ڈرائیور نے میٹر گراتے ہوئے پوچھا۔ طوبیٰ نے محلے کا نام بتایا۔

"ذرا لمبے راستے سے لے چلنا بھیا۔" ودیع نے مسکین سی صورت بنا کے التجا کی۔ ڈرائیور کی ہنسی باہر ابل پڑی۔ سخت تاثرات کے ساتھ بے نیازی سے باہر دیکھتی لڑکی اور گاہے گاہے اس پر نگاہ ڈالتا مسکین سا لڑکا۔

"دیکھیں بھیا! جہاں لو ہوتا ہے وہیں لڑائی بھی،" ڈرائیور کی معلومات کے مطابق اس جگہ سے رکشا میں سوار ہونے والے جوڑے کورٹ میرج کیسز ہی ہوتے تھے سو اس نے اپنی دانست میں شغل شروع کیا۔

"لیکن بھابھی! پہلے ہی دن آپ کو تھوڑی تو رعایت کرنا چاہیے۔"

"سائیڈ میں روکو رکشا ابھی۔" طوبیٰ نے پرس کا گرتا اسٹریپ شانے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"ارے آپ تو،" وہ کھسیانی سی ہنسی ہنسا۔

"روکو۔" اب کے اس کی آواز اتنی تیز تھی کہ اس نے رفتار کم کرتے ہوئے رکشا سڑک کے کنارے لگا دیا۔

"سوری۔" اس کے پیچھے ڈرائیور کو پیسے پکڑاتے ہوئے ودیع نے کہا۔

"اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" ڈرائیور کو اس سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ ودیع اس کے پیچھے لپکا جواب اوبر بک کرنے کے لیے فون میں ایپ کھول رہی تھی۔

"طوبیٰ!" اس نے اس کے ہاتھ سے فون لے لیا۔

"تم ابھی میرے ساتھ میرج رجسٹر کر کے آئی ہو اور مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتیں؟" اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"تم نے سب کو اتنی کڑی اور لمبی سزا دی ہے کہ اب میرے پاس اپنے کسی فیصلے سے انہیں پھر دکھی کرنے کا اختیار بھی نہیں رہا۔" طوبیٰ نے اتنی ہی بے رخی سے جواب دیا۔

"مجھے اس کا افسوس ہے، میں شرمندہ ہوں، اپنی غلطیاں سدھارنا چاہتا ہوں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ تم مجھے موقع دو۔"

''موقع کیوں۔ تمہیں اپنی خطاؤں کا بدلہ نہیں چاہیے، جیسا تم بڑے ابا سے لینا چاہتے تھے؟''

''میں نے کب روکا، تم بدلہ ہی لے لو۔''

''تو پھر اگلے نو برس تم میری ضد بھگتو۔''

''یار!'' وہ کراہا۔ ''میں جان اور مان گیا ہوں، ضد بہت بری چیز ہے اور تم اتنی ظالم نہیں ہو، میرے تو بال بھی سفید۔''

وہ ایک دم رک گیا۔

وہ جو کہنے جا رہا تھا۔ وہ اسے اس وقت سوچنا چاہیے تھا جب نو سال آہستہ آہستہ سرک کر زندگی مختصر کر رہے تھے۔ وہ خود ساختہ ہجر ختم ہونے کے بعد زیادہ تکلیف دہ تھا۔ طوبیٰ کی آنکھیں بھر آئیں جنہیں چھپانے کے لیے اس نے چہرہ ایک طرف کرلیا۔ وہ فون جیب میں ڈالتا آگے آیا اور اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔

''کیا ضروری ہے، میرے جیسی نادانی تم بھی کرو؟ نو سال کی تلافی کے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی ہے اور جانتی ہو، تمہاری ناراضی ہمارا کتنا قیمتی وقت چھین رہی ہے؟''

''یعنی قصور اب بھی تمہارا نہیں ہے!'' اس نے روتے ہوئے خفگی سے کہا۔

''سارے قصور، ساری غلطیاں میری ہیں، بس تم مان جاؤ اور مجھے معاف کردو، پلیز۔''

تب ہی قریب سے ابھرے تیز ہارن پر دونوں ہڑبڑا گئے۔ ثاقب بھائی گاڑی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ سرخ ہوگئی۔

''یقیناً نو سال لمبا وقت ہے،'' انہوں نے سر ہلایا۔

''لیکن ہاتھی نکل گیا ہے تو دم کے لیے کیوں بے صبرے ہو رہے ہو؟'' گھر میں تو سب کے ہی مزاج شوخ ہو رہے تھے۔

''بے صبری کا طعنہ تو زندگی بھر مجھے کوئی نہیں دے سکتا۔'' اس نے فخریہ انداز میں گردن اکڑائی۔

''بس تھوڑی پرائیویسی درکار ہے جو گھر میں میسر نہیں۔'' اس نے طوبیٰ کا ہاتھ پکڑا۔

''اس لیے آپ جائیں گھر، ہم پہنچ جائیں گے، کیوں طوبیٰ؟'' اس نے اسے دیکھ کر تائید چاہی۔

اسے غصے کے اظہار میں ہاتھ چھڑانے کا ثاقب بھائی کی کار میں بیٹھ جانا چاہیے تھا لیکن وہ ہاتھ چھڑا نہیں پائی اور سر جھکا دیا۔

ثاقب بھائی نے ہنستے ہوئے گاڑی گھر کی سمت موڑ دی اور وہ اس کا ہاتھ تھامے آگے بڑھا۔

''روایت تو منہ میٹھا کرنے والی ہے مگر موقع 'شرماجی' کے سموسوں کی ٹریٹ کا ہے۔''

''میں نے یہ نہیں کہا کہ میں مان گئی ہوں۔'' اس نے ساتھ چلتے ہوئے جتایا۔

''میں نے نوٹ کرلیا کہ تم مانی نہیں ہو۔'' اس نے چلتے چلتے اپنا وہ ہاتھ اونچا کیا جس میں اس کا ہاتھ جکڑ رکھا تھا۔

''یہ اس لیے کہ نو سال بعد تم کہیں راستہ نہ بھٹک جاؤ۔'' اس نے آنکھ سے ہاتھ کی سمت اشارہ کیا۔

''احتیاطاً دوسرا ہاتھ بھی دے دو۔'' وہ رک کر اس کے سامنے آیا۔

''یہ لندن نہیں ہے جہاں راستوں پر رومانس ہوتا ہے۔'' آس پاس سے گزرنے والے انہیں گھورے جا رہے تھے۔

''تمہارا مطلب ہے یہ رومانس ہو رہا ہے؟ نہیں رکو۔ مطلب تمہاری رومینٹک امیجینیشن بس اتنی ہے؟'' اس نے ایک بار پھر اپنی گرفت میں دبا اس کا ہاتھ اونچا کیا۔

''تم نے تو نو سال میں بڑی ترقی کرلی ہے!'' اس نے آنکھیں چھوٹی کرکے چبا چبا کے کہا۔

''کوئی بات نہیں، تمہیں نو دن میں سکھا دوں گا۔'' اس نے شرارت سے ایک آنکھ دبائی اور وہ ہاتھ چھڑا کے آگے بڑھ گئی۔ ودیع ہنستے ہوئے اس کے پیچھے لپکا۔ اب یہ ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلنے، بھاگنے، لپکنے اور پھر قدم ملانے کی مشقت عمر بھر کی تھی۔

☆☆

www.pklibrary.com

صوفیہ بٹ

# احد

## پندرہویں قسط

"میں جانتا ہوں کہ وہ وہاں نہیں رہے گی مگر آپ کو کیا لگتا ہے کہ ضامن مصطفیٰ آبائی حویلی سے اٹھ آیا ہے تو جڑوں سے کٹ گیا ہے۔ یا جادو کی چھڑی گھما کر اپنے سیلن زدہ ماحول، فرسودہ روایات اور طرز زندگی کو بدل ڈالا ہے۔ نہیں۔" انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ کہیں بھی چلا جائے، کہیں نہ کہیں سے وہ رنگ جھلک ہی جائیں گے، آج اسے خولہ کی ذات میں جو باتیں ایڈ مائر کر رہی ہیں، کل وہ ہی چبھیں گی۔ ثروت! اس نے باپ دادا کے قدموں میں گری ہوئی بیویاں دیکھی ہوں گی ساری عمر۔ کل اسے اپنے شانہ بشانہ چلتی بیوی شاید برداشت نہ ہو۔"

"زید۔ آپ صرف تاریک پہلوؤں پہ نظر رکھ رہے ہیں۔ روشن رخ بھی تو دیکھیں ناں۔"

وہ دودھ فریج میں رکھ کر اپنا کپ کاؤنٹر سے اٹھا کر ان کے سامنے آ بیٹھیں۔ رات کے کھانے کے بعد جب چائے کا دور چلتا تو یہیں بیٹھ کر ہی دن بھر کی باتیں ہوتی تھیں ان دونوں میاں بیوی کی۔ ورنہ تو پروفیسر صاحب بڑے مصروف بندے تھے۔

"روشن رخ۔ مثلاً۔ مصطفیٰ امین صاحب کی بیگمات، وہ کنواری بہنیں، وٹہ سٹہ۔ کل اگر ضامن مصطفیٰ پہ قربانیاں دینے کے لیے مجبور کر دیا گیا تو کیا کریں گے ہم، کیا کرلے گی خولہ؟ ثروت! یہ لوگ ان رسم و رواج، ان روایات میں یوں جکڑے ہوتے ہیں کہ لاکھ وہ خود کو آزاد کروالیں، ان کا ایک پاؤں شکنجے میں پھنسا رہتا ہے۔" پروفیسر زید ابصار "سب کچھ اچھا اچھا رہے گا۔" جیسی خوش فہمی میں مبتلا ہو کر اپنی بیٹی کی زندگی کا فیصلہ نہ کر سکتے تھے۔

ثروت خاموشی سے چائے کے گھونٹ بھرنے لگیں۔ وہ کچھ دیر انہیں دیکھتے رہے۔

"ہمارے پاس اپنی بیٹی کے لیے اور بھی بہتر آپشن ہیں۔" انہوں نے جیسے بیوی کو تسلی دی۔

"خولہ کا دل اس رشتے کی طرف مائل ہے۔" انہوں نے آہستگی سے کہا۔

"یہ محسوس کر کے تو میں ابھی تک انکار نہیں کر پا رہا۔" انہوں نے بے بسی سے کہا۔ "خولہ! میری اتنی سمجھ دار بیٹی اور یہ بیوقوفی۔" وہ تاسف سے سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

یہیں۔ ہاں یہیں اسی مقام پر محبت کسی فاتح کی طرح گردن اکڑا کر مسکراتی ہے۔ تحمل، سمجھ، شعور۔ ان کے سامنے تو بالمقابلہ جیتتی آئی ہے وہ آج تک۔

پروفیسر صاحب اتنی کتابیں پڑھ کر، عمر بھر کے تجربے کے بعد بھی جان نہ پائے تھے کیا۔

☆☆☆

رات کے اس پہر جب گرم لحاف یا کمبل میں سے نکلنا بڑا ہی مشکل امر تھا، نہر کنارے شہر کی طرف بھاگتی ہوئی موٹر سائیکل پہ سوار جوان کے جسم پہ کوئی سوئیٹر، کوئی گرم چادر نہ تھی۔ اس وقت وہ سردی گرمی کے احساس سے عاری تھا۔ وقت پہ کہیں پہنچنا اور پھر واپس آنا اس کے لیے زندگی اور موت کا سوال تھا۔

ایک گھنٹہ تین منٹ بعد موٹر سائیکل پھر ٹھیک اسی جگہ سے گزر رہی تھی۔ اب رخ بدل چکا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور مرد تھا، جو اس کے پیچھے بیٹھا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا۔

رات کے اس پہر جگائے جانے پہ وہ خفا تو نہیں تھا مگر نیند سے بھری آنکھوں کے ساتھ اس کم درجہ حرارت میں گرم بستر سے نکلنا بڑا امتحان ثابت ہوا تھا اس کے لیے۔ گھر سے نکلنے سے پہلے اس نے سوئیٹر پہنا اور اب بجتے ہوئے دانتوں کو ایک ہی جگہ جمانے کی کوشش میں ناکام ہوتا ہوا سوچ رہا تھا کہ

## مکمل ناول

سوات سے لائی ہوئی اونی چادر بھی اوڑھ ہی لیتا تو ٹھیک تھا۔اس نے بیگ کو بھینچ کر سینے سے لگا لیا جس کی وجہ سے سردی کے تھپیڑے اب کم محسوس ہو رہے تھے۔

پندرہ منٹ بعد وہ ایک گھر میں داخل ہوئے اور پچیس منٹ بعد باہر نکل آئے۔

"کوئی سوئیٹر پہن لو اللہ کے بندے۔" بیگ والے نے اسے موٹر سائیکل کی طرف بڑھتا دیکھ کر کہا تھا۔مگر جواب کوئی نہیں ملا۔اگلے چند سیکنڈ بعد موٹر سائیکل اسٹارٹ ہو چکی تھی۔بیگ والا تاسف سے سر ہلاتا ہوا اس کے پیچھے بیٹھا۔موٹر سائیکل ایک دفعہ پھر انہی رستوں پہ بھاگنے لگی۔

دوبارہ جس وقت وہ گھر میں داخل ہوا، فجر کی اذان کے لفظ فضا میں گونج رہے تھے۔وضو کے لیے آستین چڑھاتی عورت نے اسے گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو اس کی طرف بڑھی۔اس کی فکر بھی میں بدلی۔

"مرنی ہے تو مرنے دو۔اس کے پیچھے اپنے آپ کو بھول بیٹھو گے کیا۔"

جواب میں بیٹے نے نظر اٹھا کر ماں کی طرف دیکھا۔کیا تھا اس ایک نگاہ میں کہ عورت پھر ایک لفظ کہہ نہ پائی۔

سامنے کھڑا بے حال سا اپنے آپ سے غافل سایہ لڑکا اس کا وہ بیٹا تھا، جس کی وجاہت کے قصے ہر زبان پہ رہتے تھے۔جو کوئی لباس، جوتا پہنتا۔۔کوئی ہیئر کٹ لیتا تو خاندان بھر کے لڑکے اس کو فیشن سمجھ کر اپنا لیتے۔کیا حال کر لیا تھا اس نے اپنا۔

بیٹے کی حالت نے کئی ماہ سے ماں کے سجدے طویل کر دیے تھے۔اسے تہجد گزار بھی بنا دیا تھا۔صدقہ و خیرات کے لیے ہاتھ مزید کھل گیا تھا۔اپنے بیٹے کے درد کی دوا کے لیے وہ اور بھی کچھ سوچے بیٹھی تھی مگر صرف سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔وہ سنے بھی تو ماں کی۔

☆☆☆

ٹی وی چل رہا تھا۔مگر کون سا چینل کون سا پروگرام کون سا ڈرامہ لگا ہوا تھا، لاؤنج میں بیٹھی واحد ناظرہ بے خبر تھی۔اس کی تمام تر حسیات عرصہ ہوا، جیسے رخصت ہو گئی تھیں۔اب اسے ایک ہی منظر دکھائی دیتا تھا، ایک ہی آواز سنائی دیتی تھی۔ایک ہی درد محسوس ہوتا تھا۔وہ جہاں جیسے بیٹھی ہوتی، کئی گھنٹے بیٹھی رہتی۔آشنا چہروں کو اجنبی نگاہوں سے تکتی رہتی اور نا آشنا چہروں پہ اسی کا گمان ہوتا۔

جس وقت مرنضی گھر میں داخل ہوا، اسے اسی جگہ بیٹھے چار گھنٹے گزر چکے تھے۔

"میں کال کر رہا تھا تمہیں۔موبائل کہاں ہے تمہارا؟" مرنضی نے سلام کرنے کے ساتھ ہی پوچھا، وہ چونکی نہیں بلکہ خالی خالی نظروں کے ساتھ اسے دیکھتی رہی۔

"کیسی ہو۔کھانا کھایا؟" وہ اس کے قریب آ بیٹھا اور اس کا ہاتھ تھام کر نرمی سے پوچھا۔

وہ جواب دینے کے بجائے سوچنے لگی کہ اس نے کھانا کھایا ہے یا نہیں۔اسے یاد نہیں آیا۔

"آپ کے لیے کھانا لگاؤں؟" وہ ایک دم سے اپنی جگہ سے اٹھی۔

"ہاں بھوک تو بہت لگ رہی ہے۔میں بھی اتنا بزی رہا کہ لنچ کر نہیں سکا۔کیا پکا ہے آج۔" وہ اٹھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

اس کو یاد نہیں آیا کہ اس نے آج کھانے میں کیا بنایا تھا۔مرنضی نے اپنا سوال دہرایا نہیں۔اس کا ہاتھ تھام کر کچن میں آ گیا۔

"آپ کی پسند کا سالن بنا ہے۔" کڑاہی کا ڈھکن اٹھانے سے پہلے اسے یاد آ گیا تھا۔

"واؤ۔قیمہ مٹر۔" وہ اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔اس نے بیوی سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ اس نے خود پکایا ہے یا میڈ کھانا بنا کر گئی ہے۔خوشبو بتا رہی تھی کہ اس نے سالن خود بنایا تھا۔وہ اب فریج میں سے آٹا نکال کر چپاتیاں بنانے لگ گئی تھی۔وہ کاؤنٹر کے پار اسٹول پہ بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔اسے وہ دن یاد آئے جب سب کچھ نارمل تھا۔اچھا تھا بہت اچھا تھا۔

پھر وہ حادثہ۔

"میں تین روٹیاں تو کھا ہی جاؤں گا۔" ایک

خوفناک یاد سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ اٹھ کر جلدی سے بیوی کے پاس گیا اور ماتھے پہ آئے اس کے بال پرے کرتے ہوئے بولا۔

☆☆☆

"ذرا دل نہیں کانپتا ان کا انسانی جان لیتے ہوئے۔ کوئی خوف خدا نہیں انہیں۔ چینل چینج کریں پلیز۔" ثروت کا تو رواں رواں کانپ اٹھتا تھا ایسی خبریں سن کر اور دیکھ کر۔

"چینل چینج کرنے سے حقائق بدل جائیں گے کیا؟ ماما یا کاروکاری جیسی قبیح رسم کا خاتمہ ہو جائے گا؟" چائے کا بڑا سا مگ دونوں ہاتھوں میں تھام کر فلور کشن پہ بیٹھی خولہ نے ماں کے فق چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی یہ کمزور دل ماں اس کے ساتھ دو دن عدالت چلی جاتی تو دنیا کے چہرے سے کافی نقاب اتر جاتے۔

"پتا نہیں بے چاری عورت سانس بھی کیسے لیتی ہے ایسے وحشی جاہل مردوں کے بیچ۔" ان کی نگاہوں میں ابھی نیوز چینل پہ دکھایا جانے والا وہ درندہ صفت بھائی گھوما جس نے اپنی بہن کو گولیوں سے بھون کر اپنے آپ کو غیرت مند ثابت کر دیا تھا۔

"کہیں پتا تو پتا چل جائے گا ممز۔" بیگم کے کہنے پہ چینل تبدیل کر کے بظاہر نیشنل جیوگرافک پہ ایک جزیرے کی سیر کرتے ہوئے پروفیسر زید ابصار نے ٹی وی اسکرین سے نظریں ہٹائے بغیر عجیب سے لہجے میں کہا۔

"جب آپ اپنی لاڈلی بیٹی کو اسی خاندان میں بھیجیں گی جہاں یہ خونی کھیل بڑے فخر سے کھیلے جاتے ہیں۔"

چائے کا وہ سیاہ رنگ کا مگ خولہ کے لبوں سے جڑا رہ گیا۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" ثروت کا دل دہل گیا۔

"ضامن مصطفیٰ کے خاندان میں بھی دو لڑکیوں کو کاری کیا گیا۔ جن میں سے ایک ضامن مصطفیٰ کی سگی پھوپھی تھی۔"

"میرے اللہ۔" ثروت نے دل پہ ہاتھ رکھا۔

"وہیں کہیں حویلی میں دفن ہے وہ۔"

"آپ کو کس نے بتایا؟"

"جس خاندان میں بیٹی دینے کا سوچا جا رہا ہو، اس کے بارے میں جاننے کا حق تو ایک باپ رکھتا ہی ہے ناں۔"

خولہ نے پاس پڑی شیشے کی تپائی پہ مگ رکھا اور جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے ایک نظر باپ پہ ڈالی اور ٹی وی لاؤنج سے باہر نکل گئی۔ پروفیسر صاحب کی نظروں نے ٹی وی اسکرین سے ہٹ کر بیٹی کا تعاقب کیا۔

اپنے کمرے میں آ کر اس نے کرسی کھینچی اور میز پہ سامنے رکھی مشہور فاطمہ کیس کی فائل کھول کر اپنے سامنے کر لی۔ چند لمحوں بعد جھٹکے سے اسے بند کر دیا اور اٹھ کر کمرے میں چکر کاٹنے لگی۔ اس کے چہرے اور آنکھوں کی سرخی گلابی ہونے لگی تھی۔ اضطراب میں یوں بھی کوئی کمی نہ آئی تو بیڈ سے ٹیک لگا کر کارپٹ پہ بیٹھ گئی۔ ایک قطرہ اس کی آنکھ سے ٹپکا، پھر دوسرا اور اس کے بعد دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر کھل کر رو دی۔

ثروت کمرے میں داخل ہوئیں تو اسے روتے دیکھ کر تڑپ اٹھیں۔

"خولہ! میری جان۔ کیوں رو رہی ہو؟" انہوں نے زبردستی اس کے ہاتھ چہرے سے ہٹا کر اس کے آنسو پونچھے۔ وہ خاموشی سے اپنا نچلا لب کاٹتی رہی۔ آنسوؤں کو جو باہر نکلنے کا موقع ملا تھا تو تیزی سے ایک دوسرے کے تعاقب میں بھاگتے چلے آ رہے تھے۔ ثروت بڑی مشکل میں تھیں۔ دماغ جیون ساتھی کی باتوں کی طرف جاتا تھا اور دل تھا کہ بیٹی کی خوشی چاہتا تھا۔

"بتاؤ ناں خولہ۔ اپنے بابا کی بات سن کر پریشان ہو گئی ہو؟" انہوں نے پھر پیار سے پوچھا۔ جانتی تو وہ بھی تھیں مگر چاہتی تھیں کہ ان کی بیٹی اپنے دل کی بات شیئر کرے۔

"ماما! بابا کو ضامن مصطفیٰ کا خاندان، ان کا ماحول، ان کے باپ کی بیویاں، ان کے رسم و رواج سب نظر آتے ہیں۔ لیکن ضامن مصطفیٰ نظر نہیں آتے۔"

وہ خولہ بنت زید جو سوچتی تھی کہ ماما اور بابا کے ہر فیصلہ کو خاموشی سے قبول کرلے گی، اس کے دل نے اسے جانبداری دکھانے پہ مجبور کر ہی دیا۔

"ماما! آپ بابا سے کہیں کہ وہ ایک نظر ضامن مصطفیٰ پر بھی ڈالیں، ان میں کیا کمی ہے وہ بتائیں، ان کے اندر کیا خامیاں ہیں، وہ گنوائیں۔"

"بیٹا! والدین کو ہر پہلو سے دیکھنا پڑتا ہے۔ اگر وہ بھی اولاد کی طرح صرف دل سے سوچنے لگیں تو۔"

"ٹھیک ہے ماما! آئی ایگری کہ والدین کو سب کچھ دیکھنا پڑتا ہے مگر یہ بھی تو زیادتی ہے ناں کہ سب سے اہم شخص کی ذات کو اس کے اوصاف کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔ ماما میں یہ نہیں کہہ رہی کہ بابا میرے لیے غلط فیصلہ کریں گے یا وہ غلط بات کر رہے ہیں۔ مگر ماما یہ بھی تو سوچیں ناں کہ انسان کو یہ چوائس کب ملتی ہے کہ وہ کس گھر، کس خاندان، کیسے ماحول میں پیدا ہونا چاہتا ہے۔ یہ تو بعد کی بات ہے ناں کہ اس کے پاس یہ اختیارات آتے ہیں کہ وہ اپنے لیے کیا چنتا ہے۔ پلیز ضامن مصطفیٰ کی اس خاندان میں پیدائش کو اس کا دوش نہ جانیں۔ یہ دیکھیں کہ اس نے اپنے لیے کون سی راہیں چنی ہیں۔" اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ کسی شخص کے لیے یوں لڑے گی مگر لڑ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے میں کروں گی تمہارے بابا سے بات۔"

"ماما! میں پھر کہہ رہی ہوں کہ بابا غلط نہیں ہیں مگر میں یہ چاہتی ہوں کہ وہ ایک دفعہ ضامن مصطفیٰ کو ہر شے سے الگ کر کے دیکھیں۔"

"میں سمجھ رہی ہوں بیٹا کہ تم کیا کہنا چاہ رہی ہو۔ ان شاء اللہ تمہارے بابا بھی سمجھ جائیں گے۔" ثروت نے اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے نرمی سے کہا۔

☆☆☆

اور رات وہ مر گئی تھی۔

کچھ عورتیں افسوس کے لیے آئی بیٹھی تھیں۔ امی ان کے بیچ سے اٹھ کر برآمدے میں آئی تھیں جب نگاہ اس پہ پڑی۔ ناشتا یونہی رکھا تھا، اس نے لقمہ تک نہ لیا تھا۔ موبائل ہاتھ میں تھا مگر ہاتھ جامد تھا۔

"آج کراچی کے لیے نکلو گے؟"

"جی۔" اس نے اپنی ماں کی طرف دیکھا نہیں تھا۔ سر جھکا کر جواب دے دیا۔ اور پھر خالی ذہن کے ساتھ موبائل کی اسکرین پہ انگلی پھیرنے لگا۔

"میں ذرا ان عورتوں کے لیے چائے کا کہہ دوں پھر پیکنگ کرتی ہوں۔"

"پیکنگ میں کر چکا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"ناشتا۔ ناشتا تو کرو بیٹا۔"

"بھوک نہیں۔" مختصر سا جواب دے کر وہ ان کے قریب سے گزر کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ وہ وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔

رات وہ مر گئی تھی۔ انہوں نے ہی تو کہا تھا "مرتی ہے تو مر جائے۔" اور وہ مر گئی۔ اس سے پہلے بھی انہوں نے یہ لفظ کسی اور کے لیے کہے تھے، اور وہ بھی مر گئی تھی۔

انہیں سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بددعا جیسے لفظ قبول ہو جاتے تھے پھر ان کی دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں۔

☆☆☆

"لگتا ہے آپ کا اور اس لڑکے کا بہت ہی گہرا اور ایک جیسا رشتہ ہے اس بچے سے۔ وہ بھی آتا ہے اور اس قبر کو آپ کی طرح موتیا سے ڈھک جاتا ہے۔" ضامن مصطفیٰ نے اس چھوٹی سی قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس کو ابھی ابھی وہ موتیا کی کلیوں سے مہکا کر اور اس کے مکین کو دعاؤں کی سوغات پیش کر کے آرہی تھی۔

"لڑکا؟" پہلے تو وہ ان کی بات نہ سمجھتے ہوئے اچنبھے میں پڑی پھر ایک دم ہوشیار ہو گئی۔ "اس قبر پہ میرے علاوہ جو بھی آتا ہے آپ نے اسے۔ اسے دیکھا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"کب کب آتا ہے وہ یہاں؟ او مائی گاڈ۔ میں بھی کتنی پاگل ہوں۔" اس نے اپنے ماتھے پہ ہاتھ مارا۔

"آپ تو اکثر یہاں آتے ہیں۔ آپ سے انفارمیشن مل سکتی تھی۔ مگر میرا دھیان ہی نہیں گیا۔ کب آتا ہے وہ یہاں۔"

"وہ جوان مہینے میں دو تین دفعہ ضرور آتا ہے۔"

"کب؟ کس دن؟ کیا کسی مخصوص دن یا وقت پہ؟"

"نہیں مخصوص دن پر تو نہیں۔ مگر اکثر جمعہ یا اتوار کی صبح۔" وہ بہت سکون سے اس کے سوالوں کا جواب دے رہے تھے۔

"کیا وہ اس ہفتے آئے گا۔" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی تھی۔ "آپ میرا ایک کام کریں گے؟" پوچھ کر جواب کا انتظار نہیں کیا۔ "اب جب بھی وہ آپ کو نظر آئے۔ آپ مجھے فوراً انفارم کر دیجیے گا پلیز۔"

ضامن مصطفیٰ نے ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے "اوکے" کے سے انداز میں سر ہلایا۔

"نہیں۔ جب تک میں آؤں، شاید وہ نہ رکے۔ مجھے جمعے اور اتوار کی صبح خود آنا ہوگا۔"

وہ خود کلامی کر رہی تھی۔ ضامن مصطفیٰ اسے دیکھتے رہے۔

"ٹھیک ہے۔ آپ رہنے دیں۔ جمعہ کی صبح میں خود آجاؤں گی۔ آپ کو وقت کا اندازہ ہوگا ناں کہ وہ کس وقت تک قبرستان آتا ہے۔"

فیصلہ لینے کے بعد اس نے ضامن سے پوچھا۔

"اس سے ملنے کے لیے آپ کو گھر سے بہت سویرے نکلنا ہوگا۔ ویسے آپ میرے ساتھ بھی آسکتی ہیں اگر آپ کے بابا کو برا نہ لگے تو۔"

"میرے بابا ایسے تھوڑی ہیں۔" وہ فوراً بولی۔ "ان کے مجھ پہ کیے گئے اعتماد اور اعتبار نے تو مجھے اس مقام تک پہنچایا ہے۔ جہاں میری شناخت ہے، عزت ہے۔" اس کے لہجے میں اپنے بابا کے لیے ڈھیروں پیار تھا، عزت تھی، فخر تھا۔

"ہاں انہیں آپ پر اعتماد ہے، اعتبار ہے۔ لیکن مجھ پر شاید نہیں۔"

وہ خاموش رہی۔ ان کی بات کی تردید کر پائی نہ ہی تصدیق۔

"خولہ! کیا میں مصطفیٰ امین کو آپ کے گھر جا کر اپنا کیس مزید خراب کر چکا ہوں؟"

اب بھی اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کی نظریں بدستور ہاتھ میں موجود خالی کرسٹل جار پر جمی رہیں۔ اسے ضامن مصطفیٰ کا اپنے بابا کے لیے یہ طرز تخاطب عجیب لگا بہت۔

"خیر میں اچھے جواب کا منتظر ہوں۔ آپ کے بابا کو اپنے اطمینان کے لیے جتنا وقت درکار ہے، وہ بے شک لیں۔ ضامن مصطفیٰ گھبرا کر مایوس ہو کر رستہ بدلنے والوں میں سے نہیں۔"

اب کے اس نے ان کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔ ضامن کو اس مسکراہٹ میں اطمینان کی کوئی جھلک دکھائی نہ دی۔ وہ مایوس بے شک نہ تھے مگر واپسی انہیں بھی ستانے لگے تھے۔

☆☆☆

جمعہ کی صبح نماز فجر ادا کرنے کے بعد وہ ٹیرس پہ آگئی۔ گلابی اور سفید پھولوں کو چھو کر ان کی مہک اپنے سنگ لائی ہوا نے اس کا استقبال کیا۔ اس نے ایک بازو ریلنگ پہ ٹکاتے ہوئے حسب عادت ان پھولوں کو چھوا۔ اسی لمحے گیٹ کے پار ضامن مصطفیٰ کی گاڑی آکر رکی۔ وہ باہر نکل کر گیٹ کی طرف چلے آئے۔ وہ وائٹ شرٹ اور بلیک ٹراؤزر میں ہمیشہ سے مختلف لیکن ہمیشہ کی طرح بہت اچھے لگ رہے تھے۔ وہ نیچے جانے کے بجائے انہیں دیکھتی چلی گئی جو ایوب چاچا کے سلام کا سر ہلا کر جواب دے رہے تھے۔

"بابا! آپ نہیں جانتے، آپ کی بیٹی کے لیے یہ شخص کیا ہو گیا ہے۔ لگتا ہے اس سے پہلے اس کے بعد کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔"

ایوب چاچا اندر اطلاع کرنے آگیا تھا۔ گاڑی سے ٹیک لگائے انتظار میں کھڑے ضامن کی نگاہ یونہی اوپر بالکونی کی طرف اٹھی۔ اسے وہاں دیکھ کر وہ ذرا سا مسکرائے اور دایاں ہاتھ ہلایا۔ وہ جیسے ہوش میں آگئی۔ جلدی سے کمرے میں آکر اس نے ہیئر برش اٹھاتے ہوئے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تو

بابا تھے یہ ہاتھ مارا۔ ابھی تک وہ رات والے لباس میں تھی جو سلوٹوں سے بھرا پڑا تھا۔ جلدی سے کاہی رنگ کا سادہ سا ایک سوٹ نکال کر تبدیل کیا اور سائیڈ ٹیبل پر پڑا کرسٹل جارا ٹھا کر نیچے آ گئی۔

بابا مارننگ واک کے لیے جا چکے تھے۔ ماما کو اپنے جانے کا بتا کر وہ باہر آئی اور لان میں آ کر جار موتیا کی کلیوں سے بھرنے لگی۔ جب تک وہ گیٹ سے باہر آئی، ضامن کو انتظار کرتے بیس پچیس منٹ ہو چکے تھے۔

"السلام علیکم۔ سوری سوری میں نے کافی دیر کر دی۔" اس نے معذرت کی۔

ایک نرم سا جملہ ان کی زبان تک آیا مگر انہوں نے ہونٹوں سے ادا نہ کیا۔ محض مسکرا دیے اور اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا۔

سورج ابھی درشن دینے کو وقت چاہتا تھا۔ دن رات لاکھوں لوگوں کا، لاکھوں گاڑیوں کا بوجھ سہنے والی کراچی کی سڑکیں اس وقت بہت سکون میں تھیں۔

"آپ روز قبرستان جاتے ہیں؟" خولہ نے پوچھا۔ وہ چار پانچ دفعہ قبرستان جا چکی تھی اور ایسا صرف ایک مرتبہ ہوا تھا کہ ضامن مصطفیٰ وہاں نہیں تھے اس لیے اس نے یہی اندازہ لگایا۔

"ہوں۔ صبح شام۔ اپنی ماں سے ملنے جاتا ہوں۔" ماں کے ذکر پہ ان کی سنہری آنکھوں کی چمک میں مزید اضافہ ہو جاتا تھا۔ لہجے میں نرمی کے ساتھ ساتھ مٹھاس اتر آتی۔ یہ روٹھا روٹھا سا بندہ محبت کا امیر لگنے لگتا۔

"صبح و شام! آپ اتنا وقت نکال لیتے ہیں کیا؟" اسے حیرت ہوئی۔

"ماں کے لیے کس کے پاس وقت نہیں ہوگا خولہ۔"

"یہ تو آپ کہہ رہے ہیں، ورنہ میں نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جن کی بوڑھی ماں اپنے کمرے میں انتظار کرتی رہ جاتی ہے اور اولاد کو اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ دو قدم اٹھا کر ان کو اپنی صورت ہی دکھا دیں۔"

"ان سے زیادہ بدنصیب کون ہوگا؟" انہوں نے مختصر سا تبصرہ کیا۔

"ماں سے اتنا پیار اور اپنے بابا کے ساتھ اتنی خفگی۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

ضامن مصطفیٰ کے ہونٹ بھنچ گئے۔ خولہ جانتی تھی کہ اب وہ خاموش رہیں گے۔ وہ انہیں کسی حد تک سمجھ چکی تھی۔ جس موضوع پہ انہیں بات نہ کرنی ہو وہ اسے ٹال کر دوسری طرف نہیں آتے تھے بلکہ ہونٹ سی لیتے تھے۔

وہ چھوٹی قبر مرجھائی ہوئی کلیوں سے ڈھکی تھی۔ لگتا تھا کہ جس دن وہ یہاں آئی تھی اس کے بعد اس قبر پہ کوئی نہیں آیا تھا۔ اس نے تازہ کلیاں وہاں بکھیریں اور دعا مانگ کر ضامن مصطفیٰ کی والدہ کی قبر کی طرف آ گئی۔ وہاں بھی دعا مانگی۔ کافی انتظار کے بعد بھی چہرہ دکھائی نہ دیا جس کے لیے آج وہ یہاں آئی تھی۔ اب تو سورج سارے پردے ہٹا کر درشن دے چکا تھا۔ وہ کچھ مایوس سی دکھائی دینے لگی۔

"آپ یہاں ٹھہریں، میں گورکن سے اس لڑکے کے بارے میں کچھ معلومات لینے کی کوشش کرتا ہوں۔" ضامن نے کہا۔ وہ دونوں ساتھ چلتے ہوئے قبرستان سے باہر آ گئے تھے۔

"رہنے دیں۔ میں یہ کوشش کر چکی ہوں۔ اس نے میری معلومات میں کچھ خاص اضافہ نہیں کیا۔ اس نے ایک لڑکے کو اس قبر کے پاس دعا مانگتے، کلیاں بکھیرتے، روتے، باتیں کرتے تو دیکھا ہے مگر وہ کون ہے، اسے بھی خبر نہیں۔" اس نے انہیں منع کرتے ہوئے بتایا۔

"خولہ! ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھیں۔"

"ایک بچے کی قبر پہ دو لوگ آتے ہیں۔ پھول بکھیر کر چلے جاتے ہیں، اور ایک دوسرے سے انجان ہیں۔ عجیب بات نہیں یہ؟" جو الجھن ان کے دماغ میں تھی، انہوں نے سلجھانے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ "اس بچے کے ساتھ آپ کا کیا رشتہ ہے خولہ؟"

"اس قبر میں ابدی نیند سوئے وجود سے میرا کوئی تعلق یا رشتہ ہو نہ ہو، اس لڑکے کا ضرور ہے اور یہ ہی جاننے کے لیے میں یہاں آتی ہوں۔" خالی جار

www.pklibrary.com

گاڑی کے بونٹ پہ رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

اس کا جواب ضامن کو مزید الجھا گیا تو وہ انہیں مختصر لفظوں میں سب کچھ بتاتی چلی گئی۔

"میں عبدالہادی کو اس کا حق دلوا کر رہوں گی۔" آخر میں اس کا لہجہ پرجوش ہو گیا تھا۔ وہ اسے دیکھتے رہ گئے۔

"کبھی اپنے حقوق کے لیے بھی جنگ کی ہے آپ نے؟"

"ضرورت ہی نہیں پڑی۔ بن مانگے مل جاتا ہے۔" خولہ بنت زید کے لہجے میں مان تھا، فخر تھا، اور کچھ کچھ غرور بھی۔

"آپ کو یقین ہے میرے کیس میں بھی آپ کو آپ کا حق مل جائے گا۔" انہوں نے اس کے پراعتماد لہجے سے متاثر ہوتے ہوئے سوال کیا۔ یا شاید کسی بہانے اپنے دل کی تسلی چاہی۔ وہ ایک لمحے کے لیے ان کے سوال اور ان کی نگاہوں سے گڑبڑا گئی پھر سنبھل کر جواب دیا۔

"مجھے میرا حق ملے گا یا وہ اپنا حق استعمال کریں گے۔"

"کیسا حق؟"

"وہ حق جو والدین کا اپنی اولاد پر ہوتا ہے۔"

"آپ میرے لیے فائٹ نہیں کریں گی خولہ؟"

"مجھے نہیں لگتا ضامن مصطفیٰ کہ مجھے فائٹ کرنا پڑے گی۔ اگر ایسا ہوا تو میں سرینڈر کردوں گی۔ جس جنگ میں ایک محبت کھو کر دوسری حاصل کرنی پڑے، وہ جیت ہی کیا؟"

ہر چند کہ اس نے کوئی خوش آئند جواب نہیں دیا تھا پھر بھی دو لفظ ضامن مصطفیٰ کو خوشی دینے کے لیے کافی تھے۔

"چلیں اس بہانے آپ نے یہ اقرار تو کیا کہ میرا آپ کے دل میں کچھ خاص مقام ہے۔ چاہے یہ محبت دوسرے نمبر پہ ٹھہری۔"

خولہ کے چہرے پہ سرخیاں دوڑ گئیں۔

"خولہ! آپ بھی میرے لیے وہی محسوس کرتی ہیں ناں جو جذبات و احساسات میں آپ کے لیے رکھتا ہوں۔" ضامن عین اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ اس کے لیے نگاہیں اٹھانا مشکل ہو گیا۔ وہ ٹین ایجر نہ تھی پھر بھی عمر کا یہ دور اسے بے باک نہ بنا سکا۔

"میں سننا چاہتا ہوں خولہ۔"

"کیا مجھے کچھ کہنے کی ضرورت ہے؟" وہ بمشکل بول پائی۔

ضامن کچھ دیر اس کی طرف سرشاری سے دیکھتے رہے پھر انہوں نے آسمان کی طرف اپنا چہرہ کر لیا۔

"میرے رب! میں نہیں جانتا کہ اس جہاں کے باسیوں کا اس جہاں کے بندوں کے ساتھ کس حد تک رابطہ رہتا ہے۔ لیکن اگر میری ماں میرے غم، میری تنہائی، میری خوشی کو محسوس کر پاتی ہے تو میں چاہتا ہوں کہ وہ جان جائیں۔ اے حی القیوم وہ جان جائیں کہ ان کا بیٹا آج کتنا خوش ہے۔ ان کے جانے کے بعد آج پہلی بار وہ کتنا خوش ہے۔"

خولہ بنت زید کے لبوں کی مسکراہٹ اور رخساروں کی سرخی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اس پل ہر خدشہ، ہر ڈر، ہر واہمہ ان دونوں سے کوسوں دور تھا۔

قبرستان میں کھڑے گورکن نے دو حسین گلاب کھلتے دیکھے اور پھر سے قبر کھودنے لگا۔

☆☆☆

پروفیسر زید ابصار کے اس چھوٹے سے بنگلے کے باہر چھوٹا سا لان تھا جہاں صبح صبح ملازم ایک میز اور چار کرسیاں لا کر رکھ دیتا۔ ان کی شاموں اور سردیوں میں چھٹی کے دن کا بیشتر وقت یہیں گزرتا۔ اخبار بینی، کتب بینی، شاگردوں، دوستوں اور پڑوسیوں کے ساتھ گپ شپ، اور احباب سے ملاقات یہیں ہوتی۔

آج وہ صبح کی سیر سے واپس آ کر اندر جانے کے بجائے وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور ملازم سے اخبار منگوا لیا۔ نگاہیں ان کی اخبار کی شہ سرخیوں پہ تھیں مگر سوچ کہیں اور تھی۔ ضامن مصطفیٰ کی گاڑی سامنے آ کر رکی تو وہ اخبار سے نظر ہٹا کر انہیں دیکھنے لگے۔ خولہ نے انہیں وہاں بیٹھے دیکھ کر ایک نظر ضامن کی طرف دیکھا۔ وہ جو اسے گھر چھوڑ کر وہیں سے

چلے جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اب گاڑی سے ان کے ساتھ ہی اتر آئے اور ان کی طرف بڑھے۔ پروفیسر صاحب اخبار میز پر رکھ کر کھڑے ہو چکے تھے۔ ان کی نظریں اپنی بیٹی سے ہوتی ہوئی ضامن پر آ کر ٹھہری گئیں جنہوں نے قریب آ کر انہیں سلام کرتے ہوئے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔

"وعلیکم السلام۔ کیسے ہیں ضامن مصطفیٰ آپ؟" پروفیسر صاحب نے مضبوطی کے ساتھ ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"الحمدللہ۔ بالکل ٹھیک۔" وہ ان کے سامنے تھوڑے کنفیوژ ڈ تھے۔

"خولہ! اپنی ماما سے کہو کہ ضامن مصطفیٰ آج ناشتا ہمارے ساتھ کریں گے۔"

"جی!" وہ پہلے حیران ہوئی پھر مسکراتی ہوئی اندر چلی گئی۔

ان کا انداز اتنا قطعی تھا کہ ضامن رسمی سا انکار بھی نہ کر پائے۔ ان کا ہاتھ ابھی تک پروفیسر زید البصار کے دائیں ہاتھ میں تھا۔ خولہ کے چلے جانے کے بعد ان کی نظریں پھر سے ضامن کے چہرے پہ آ ٹھہریں۔

پروفیسر زید البصار کے ہلکی ہلکی سفید داڑھی سے سجے چہرے پہ جتنی ملاحت تھی اس سے کہیں بڑھ کر رعب بھی تھا۔ ضامن کو اس وقت اندازہ ہوا کہ جس لڑکی سے آپ شادی کرنا چاہتے ہوں۔ اس کے باپ کے سامنے کھڑے ہونا اور پروفیسر زید البصار جیسے باپ کے سامنے کھڑے ہونا کیسا مشکل کام ہے۔

"ضامن مصطفیٰ! میری بیٹی نے کہا تھا کہ ہر حقیقت ہر واہمے کو بھول کر صرف اور صرف تمہیں دیکھوں۔ ہر سچائی ہر خدشے کو جھٹلا کر صرف تمہاری ذات کو پرکھوں۔ میں نے ایسا ہی کیا ضامن مصطفیٰ۔ بہت سوچا بہت سوچا، صرف تمہارے بارے میں سوچا۔" انہوں نے چند لمحوں کا توقف جو کیا تو ضامن کو لگا اب ان کے منہ سے جو الفاظ ادا ہوں گے وہ نوید حیات ہوں گے یا پیام موت۔

ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ پروفیسر زید البصار جلدی سے اگلا جملہ ادا کریں یا پھر زبان ان کے تالو سے چپک جائے اور وہ تا عمر بول نہ پائیں۔

"مجھے لگتا ہے کہ تم میری بیٹی کے لیے بہت اچھے ہم سفر ثابت ہو گے۔ ابھی میں نے تمہیں اس کے ساتھ آتے دیکھا۔ تم واقعی میری بیٹی کے ساتھ بہت اچھے لگتے ہو۔" آخری جملہ کہتے ہوئے ان کے چہرے پہ بہت پیاری سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

خدشوں اور ہزار ہا واہموں میں گھرے ضامن مصطفیٰ حقیقت میں اس خوشی کے یوں اچانک ملنے کی امید نہ رکھتے تھے۔ وہ تو یقین اور بے یقینی کے بیچ کی کیفیت میں گھرے نوید حیات پا کر بھی کھل کر مسکرا نہ پائے۔

"ضامن مصطفیٰ! میں امید رکھتا ہوں کہ تم میری بیٹی کے اعتبار کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچاؤ گے۔"

"ان شاء اللہ۔ آپ اسے ہمیشہ میرے ساتھ خوش دیکھیں گے۔" ان کا لہجہ بے حد مضبوط تھا۔ اپنی بخت آوری پہ یقین کرنے میں دیر نہیں لگی تھی۔

پروفیسر زید البصار نے ان کے دائیں کندھے پہ دو دفعہ تھپکی دی اور اپنے ہاتھ میں موجود ان کے ہاتھ کو گرمجوشی سے دبایا۔

☆☆☆

"تم نے قتل کیوں کیا؟"

"اور کیا کرتا مولوی۔ سگریٹ کا ڈبہ ہی تو لیا تھا ایک۔ (دو گالیاں دینے کے بعد) پیسے مانگنے لگا۔ مجھ سے۔ واحد سے۔" اپنے سینے پہ ہاتھ رکھا۔ "نکالی پستول اور کر دیا کام تمام۔"

"ناحق جان لینا بڑا گناہ ہے عبدالواحد۔"

"میرا نام واحد ہے مولوی۔" اس کو باقی جملے سے کوئی سروکار نہ تھا۔

"واحد صرف اللہ کی ذات ہے۔"

"باتیں بڑی اچھی کرتا ہے مولوی تو۔ اور کام۔ میرا مطلب۔ کچھ کیا ہے تو بیٹھا ہے ناں یہاں واحد کے پہلو میں۔" وہ ہنسا۔

مولوی عبدالرحیم کے چہرے کی سنجیدگی میں

اضافہ ہوا۔ یہ وہ تکلیف دہ موضوع تھا جس پہ وہ بات نہیں کرتے تھے۔

"اور اپنے اس لاڈلے سے تو نہیں پوچھا تو نے۔ اس نے قتل کیوں کیا؟" اس نے عبدالہادی کی طرف اشارہ کیا۔

"اس نے قتل نہیں کیا۔" مولوی صاحب کے جملے نے جہاں واحد کو چونکایا وہیں عبدالہادی نے بھی بے اختیار نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"مان گئے مولوی تیرے کو۔ مجرم تو ادھر صرف واحد بیٹھا ہے۔ ہے ناں۔" وہ پھر ہنسا۔

"اس کا چہرہ قاتل کا چہرہ نہیں۔"

"اور میرا چہرہ۔ وہ تو قاتل کا چہرہ لگتا ہے ناں۔" جانے اب کے اس کی ہنسی میں کیا بات تھی کہ مولوی صاحب کے ساتھ عبدالہادی نے بھی غور سے اسے دیکھا۔

"میں لوگوں کے بارے میں اچھا گمان رکھنے پہ یقین کرتا ہوں۔ تم نے اقرار کیا تو یقین کر لیا۔ عبدالہادی نے انکار کیا تو یقین کر لیا۔ میں کسی کو جھوٹا کہنے کا حق دار بھی نہیں۔ قاتل کیوں کہوں گا۔"

عبدالہادی کی نظریں اس بارعب شخص سے ہٹ نہ پائیں۔

واحد اپنی جگہ سے اٹھا اور سلاخوں تک آیا۔ ڈیوٹی پہ موجود اہلکار کو اشارہ کر کے اپنی طرف بلایا۔

"ابے۔ عدالت سزا دے نہ دے۔ تم لوگوں نے اچھی سزا دے ڈالی بھئی۔ اتنے نیکوں پرہیزگاروں کے بیچ چھوڑ دیا۔ ابے زہر کیوں نہیں چاٹنے دیتے واحد کو۔"

☆☆☆

من کرتا ہے
آج روپہلی چنری اوڑھوں
زرد بسنتی مالا پہنوں
شوخ چمکتا گجرا اڑاروں
تازہ تازہ گجرا پہنوں
مہندی سے ہر پور سجاؤں
جس میں اپنا آپ بساؤں
نین اٹھا کے، نین جھکا کے
دھیرے سے مسکاؤں
اپنے خواب کسی کو دے کر
چپکے سے کھو جاؤں

سارے وارڈ روب کھنگال ڈالنے کے بعد بھی وہ مطمئن نہ ہو رہی تھی۔ ایک کے بعد ایک لباس نکالتی۔

"پتا نہیں ضامن مصطفیٰ کو یہ رنگ پسند ہے کہ نہیں۔"

سوٹ پھر واپس اپنی جگہ پہ لٹک جاتا۔ آخر زرد رنگ کا شیفون کا ایک سوٹ اوکے کر ہی دیا تو اب مسئلہ میچنگ کی چوڑیوں، ائیر رنگز اور سینڈل کا تھا۔ مصیبت تو یہ تھی کہ وہ کبھی ان چکروں میں پڑی ہی نہ تھی۔ کسی شادی بیاہ کی تقریب میں جانے کے لیے بھی اس کی تیاری بڑی محدود سی ہوتی تھی مگر آج اس دل کا کیا کرتی جو ایک ساتھ ہر رنگ پہن لینے کو مچل رہا تھا، جو آج خوب سجنے سنورنے کی تمنا میں تھا، جو آج خولہ بنت زید کو بہت خوبصورت دیکھنا چاہتا تھا۔

آج وہ ضامن مصطفیٰ کے ساتھ پہلی بار اس نئے رشتے کے حوالے سے کہیں جا رہی تھی۔ انہوں نے خود بابا سے اجازت لی تھی۔ اب جو بابا نے اس رشتے کو قبول کیا تھا تو بہت کھلے دل سے کیا تھا۔

"تھینک یو بابا۔" سامنے لگی ان کی تصویر کو دیکھتے ہوئے وہ ایک بار پھر ان کی ممنون ہوئی۔ جنہوں نے اس کے مان کو کئی گنا بڑھا دیا تھا۔

ضامن مصطفیٰ اپنے دیئے ہوئے وقت پہ پہنچ چکے تھے۔ ماما روایتی ماؤں کی طرح اپنے ہونے والے داماد کی آؤ بھگت میں لگی ہوئی تھیں اور ان صاحبہ کی تیاریاں مکمل ہی نہ ہو رہی تھیں۔ آخر ماما نے ہی اسے ڈانٹ کر باہر نکالا۔ اور جب وہ اپنے کمرے سے نکلی تو پیراہن سیاہی مائل سبز رنگ کا ہو چکا تھا۔ میچنگ جو اسی کی دستیاب تھی۔

"سوری۔ سوری میں لیٹ ہو گئی۔"

ضامن مصطفیٰ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"مجھے اپنے تابناک مستقبل کی جھلک دکھائی

دے رہی ہے۔ عقلمند تھے، دو دفعہ کا تجربہ کافی تھا۔

"کیا کریں، خواتین اور مردوں کی تیاری میں بہت فرق ہوتا ہے ناں۔"

"ضرورت کیا ہے تیاری کی۔ خولہ آپ یونہی بہت اچھی لگتی ہیں۔ سمپل، گریس فل، ایڈورایبل۔"

لو جی۔ اب خولہ بنت زید کا جی چاہا کہ بھاگ کر جائے اور یہ جو نینوں میں کاجل سجا رکھا ہے، رخساروں پہ گلال لگا رکھا ہے، اس مکھ کو خوب رگڑ رگڑ کر دھو آئے۔ کانوں میں جھولتے لمبے آویزے اتار کر وہی سادہ بالیاں پہن لے۔ چوڑیوں کو اتار کر پرے کرے اور وہی سنہری ڈائل والی سادہ سی گھڑی کلائی میں پہن لے۔

وہ خود ہی سر جھٹک کر ہنس دی۔

توبہ ہے۔ یہ محبت بھی ناں۔ کیا شے ہے۔

اپنی پسند سے زیادہ کسی اور کی پسند ناپسند اہم ہو جاتی ہے۔ اپنے رنگ ڈھنگ بھول کر کسی اور کے سانچے میں ڈھلنا اچھا لگتا ہے۔

ضامن مصطفیٰ نے بہت دنوں بعد اس کی ہنسی سنی تھی، وہی ہنسی جس نے ان کے دل پہ سب سے پہلے اپنا حق جمایا تھا۔ اب یہ ساز بکھیرتی ہنسی عمر بھر کے لیے ان کے ساتھ رہنے والی تھی۔

☆☆☆

ماہ کامل سمندر کو دیوانہ سا کیے جاتا تھا۔

لہریں جو اس کے حسن اس کے جوبن پہ مرمٹی تھیں، اسے چھونے کی تمنا میں جنونی ہو رہی تھیں جبکہ پورے چاند کی محبت میں نرمی تھی سکون تھا۔ اس محبت کو وہ چاندنی کے روپ میں دامن بھر بھر سمندر پہ خاموشی سے نچھاور کر رہا تھا۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کافی دور تک نکل گئے۔ جہاں پورا چاند تھا، سمندر تھا اور وہ دونوں تھے۔

خولہ ایک بڑے سے پتھر پہ جا بیٹھی۔ ضامن مصطفیٰ اسے دیکھنے لگے۔

محبت کا ہر رنگ کتنا خوبصورت تھا۔ وہ سمندر کا جنون ہو چاہے چاند کا سکون۔ اور سب سے حسین، سب سے منفرد، سب سے کم موہنا رنگ یہ خولہ بنت زید۔

ہاں۔ سامنے بیٹھی اپنے اڑتے بالوں پہ جھنجلا کر انہیں کیچر میں قید کرتی ہوئی یہ لڑکی۔

وہ مسکراتے ہوئے اس کے پاس آ بیٹھے۔

"پتا ہے ضامن مصطفیٰ ایک دفعہ۔" اسے پتا نہیں کیا یاد آیا تھا جو اس کی آنکھوں کی چمک بڑھی تھی۔

"ضامن۔ میرے اپنے مجھے صرف ضامن کہتے ہیں۔" انہوں نے اس کی بات بیچ میں ہی کاٹ کر نرمی اور اپنائیت سے کہا۔

"ضامن۔" اس نے جھجکتے ہوئے آہستہ سے کہہ کر ان کی طرف دیکھا۔

مبہم مسکراہٹ بھرپور مسکراہٹ میں تبدیل ہوئی۔ وہ بھی اس نام کی اپنائیت محسوس کر کے مسکرا اٹھی۔ اس کے عارض گلابیاں چھلکانے لگے۔

بہت سارے پل خاموشی میں بیتے۔ بس ٹھاٹھیں مارتے سمندر کا شور تھا یا دلوں کی ہم آہنگ ہوتی دھڑکنیں، جن کی دھک دھک ہر شے سن رہی تھی۔

"آپ کچھ کہہ رہی تھیں۔" ضامن کے موبائل پر کوئی کال کر رہا تھا انہوں نے کال ریجکٹ کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ مگر وہ تو بھول چکی تھی کہ وہ کیا کہنے جا رہی تھی۔ وہ بھی سمجھ کر مسکرا دیئے۔

"اچھا۔ جب یاد آئے تو کہہ دیجیے گا۔ مگر ذرا جلدی یاد کر لیجیے گا۔ پروفیسر صاحب کی ہدایت تھی کہ ان کی بیٹی کو جلد بحفاظت واپس پہنچایا جائے۔ پہلی بار ہی حکم عدولی کر دی تو آئندہ ان کا سلوک ان کے ہونے والے داماد کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے، اس کا خوب اندازہ ہے مجھے۔" وہ شگفتہ لہجے میں کہہ رہے تھے، خولہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

ضامن مصطفیٰ نے چاندنی چاندنی ہوتی اس لڑکی کو دیکھا۔ جب یہ ہنستی تو ان کا دل چاہتا وہ پل ٹھہر جائے اور زیست اسی ایک پل میں بیت جائے۔

"تو ڈرتے ہیں آپ میرے بابا سے؟"

"ڈرتا تو ان کی ہاں سے پہلے تھا کہ کہیں ان کے وہم اور خدشات مجھ سے میری زندگی کی سب

سے بڑی خوشی نہ چھین لیں۔"

"ڈر تو ایک دفعہ میں آپ کی طرف سے بھی گئی تھی۔"

"کیسا ڈر خولہ؟"

"جب میں نے آپ سے کہا کہ بابا چاہتے ہیں کہ آپ کے والد رشتہ لے کر آئیں، آپ تو اپنے بابا سے خفا تھے۔ ان کا نام ان کا ذکر بھی آپ کو ناگوار گزرتا تھا۔ مجھے لگا آپ میرے لیے ان کے پاس نہیں جائیں گے۔" اس کی نظریں دودھیا پانیوں پہ تھیں۔

"خولہ! میری زندگی میں بہت کم لوگ ہیں جو میرے لیے اہم ہیں، خاص ہیں۔ میں ان کو کبھی بھی کسی قیمت پر بھی کھونا نہیں چاہتا۔ کسی قیمت پر بھی نہیں۔" انہوں نے اس کی سیاہی مائل سبز چوڑیوں پہ اپنی انگلیاں پھیریں۔ "اور آپ میرے لیے بہت اہم بہت خاص ہیں خولہ۔ آپ کے لیے میری انا، جنگ یا ضد کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔"

اور خولہ بنت زید کو کہاں اس پل سے پہلے تک اپنا آپ اتنا قیمتی اتنا بخت آور لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی اتر آئی۔

"اور میرے لیے جنگ نہ کرنے کا دعویٰ کرنے والے بھی (جانب داری) شو کر رہی گئے تھے، ہمیں بھی اطلاع مل گئی تھی پروفیسر صاحب سے۔"

وہ پہلے تو کبھی نہیں پھر جب اپنی اور ماما کے بیچ ہونے والی وہ گفتگو یاد آئی تو بھیگی پلکیں صاف کرتی ہوئی مسکرا دی۔

"میری ذات پہ اعتبار کرنے کا شکریہ خولہ۔ آپ کا وہ ایک جملہ جو آپ نے میرے حق میں بولا ہوگا میرے لیے بہت قیمتی ہے۔" ان کی انگلیاں اب بھی گہری سبز چوڑیوں پہ تھیں۔

"آپ جان نہیں سکتی خولہ کہ آپ۔"

"میرے اپنے مجھے "تم" کہتے ہیں۔" وہ بیچ میں بول اٹھی۔

ضامن مصطفیٰ ہولے سے ہنس دیے اور اس مہ تاباں کو مبہوت ہو کے تکنے لگے۔

"آپ کچھ کہہ رہے تھے۔" ان چمکتی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ وہ ٹھہر کر آہستہ سے بول اٹھی۔

"بھول گیا۔"

نیم ماہ بھی مسکرا اٹھا۔

ایک دفعہ پھر خاموشی ان کے بیچ آ بیٹھی۔

فقط ایک دیوانے سمندر کا شور تھا اور دو دلوں کی ہم آہنگ ہوتی دھڑکنوں کی دھک دھک۔

☆☆☆

سنہری نینوں والی اس لڑکی کے لیے زندگی بہت خوبصورت ہوا کرتی تھی۔ اس کے لیے زیست کسی کے لبوں سے پھوٹتی ہنسی، کوئی لال گلابی پھول، ہر سو پھیلی روشنی، ہر غم سے بے نیاز بچے، پہاڑوں کے دامن سے گرتے جھرنے اور حسین خواب جیسی تھی۔ اسی۔ ہاں اسی لڑکی سے محبت تھی اسے۔

اور اب۔ سنہری نینوں والی اس لڑکی کے لیے زندگی بہت بدصورت ہو گئی تھی۔ اب اس کے لیے زیست ڈراؤنا سپنا، بھیانک حقیقت، تلخ یاد اور کڑوے گھونٹ جیسی تھی۔ اسی۔ ہاں اسی لڑکی سے محبت تھی اسے۔

اس نے لان کی بتیاں روشن کیں اور مسکراتے ہوئے زینے پہ اس کے قریب آ بیٹھا۔ اور محبت کے ساتھ اس کی جھولتی لٹ کو چھوا۔ وہ یونہی چہرہ گھٹنوں پہ رکھے بیٹھی رہی۔

"فائقہ۔ کمپنی اپنے دو ایمپلائز اور ان کی فیملی کے لیے عمرہ کے ٹکٹ دے رہی ہے۔ پرسوں قرعہ اندازی ہے۔ میرا نام نکل آیا تو کتنا اچھا ہوتا۔"

"تمہارا نام نکلا تو تم امی (ساس) کو لے جانا۔" اس نے گھٹنوں سے سر اٹھائے بنا کہا۔

"کیوں تم نہیں چلو گی کیا؟" وہ حیران ہوا۔

"نہیں۔" اس کا یک لفظی جواب قطعیت بھرا تھا۔

"کیوں فائقہ۔ تمہاری تو خواہش تھی ناں عمرہ کرنے کی۔"

"خواہش تھی، اب نہیں ہے۔"

"کیوں؟"

فائقہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ مرتضیٰ نے دوبارہ پوچھا۔

"کس چہرے کے ساتھ جاؤں گی اللہ کے گھر؟"

وہ چند لمحے جواب دینے کے قابل نہ رہا۔

"گناہ گار، قاتل، لٹیرے، نجس اپنے اپنے چہروں کے ساتھ ہی جاتے ہیں وہاں۔"

"بزدل اور خائن بھی؟" اس نے چہرہ گھٹنوں سے اٹھا کر شوہر کی طرف دیکھا۔

"ہم بزدل اور خائن نہیں ہیں فائقہ۔" اس کے چہرے پہ سرخی پھیلی۔

"قرعہ تمہارے نام نکلا تو تم امی کو لے جانا۔"

وہ اٹھی دونوں زینے اتر کر لان میں چلی آئی۔ وہ ہونٹ بھینچتے ہوئے اس کے پیچھے آیا۔ اس کا بازو تھام کر رخ اپنی طرف کیا۔

"تو تم نے فیصلہ کر لیا ہے ساری عمر اس گلٹ کے ساتھ جینے کا۔"

"فیصلہ تو تم نے کیا ہے مجھے اس گلٹ کے ساتھ مارنے کا۔"

اس کی سنہری آنکھوں میں اب کوئی تارہ نہ چمکتا تھا۔ بجھی بجھی ویران آنکھیں۔ اب تو آنسو بھی نہ چمکتے تھے ان آنکھوں میں۔ خشک خشک خالی آنکھیں۔

"تمہیں مجھ سے زیادہ محبت ہے یا اپنے آپ سے فائقہ؟" اس نے وہ سوال پوچھ ڈالا تھا جو اکثر پوچھا کرتا تھا اور سنہری آنکھوں والی کی طرف سے کھلکھلاتے ہوئے فوراً جواب آیا کرتا تھا۔

"اپنے آپ سے محبت تو رہی نہیں۔" جواب اب بھی فوراً آیا تھا مگر جواب وہ نہ تھا۔

"اور مجھ سے؟"

جواب میں وہ اسے یونہی بجھی ویران خشک خالی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ اس نے آہستہ سے اس کا بازو چھوڑا اور مڑ گیا۔

"تم سے محبت نہ ہوتی تو تمہاری بات نہ مانتی۔"

پیچھے سے اس کی آواز آئی۔ وہ ٹھٹکا، ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر اندر چلا گیا۔

☆☆☆

"ایک منٹ ضامن۔ ایک منٹ۔" گاڑی کے پاس آ کر خولہ نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

"کیا ہوا؟"

"آپ کو یاد ہے کسی نے ہمیں یہاں سن اینڈ مون جیسا کپل کہا تھا اور فار ایور ہیپی رہنے کی دعا دی تھی۔"

ضامن مصطفیٰ مسکرا دیے۔

"دعا تو تم نے لے لی تھی۔ اب کیا چاہیے؟"

"بس میرا دل چاہ رہا ہے کہ وہ ایک بار پھر مجھے دعا دے۔ اس دفعہ پورے حق کے ساتھ یہ دعا وصول کروں گی۔"

"پاگل ہو تم بھی۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

وہ خولہ سرا تو نظر نہ آیا البتہ برسوں سے جس موبائل کور بجنے والے کے بھائی کی اعلیٰ تعلیم ہی مکمل نہ ہو رہی تھی، اس کی امتحانی فیس ادا کی۔ لالی وڈ ہالی وڈ کی ہیروئنز بلکہ آج تو ہیروز کا بھی صدقہ اتارا۔ پولیس والا دو دفعہ گھورتا ہوا ان کے قریب سے گزرا۔

"اچھے خاصے مہذب شہری مشکوک ٹھہر رہے ہیں۔ چلیں کیا اب؟" ضامن نے اس کی طرف دیکھا وہ مایوس سی ہو کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ضامن مصطفیٰ کی طرف سے شادی کی شاپنگ کرنے آئے تھے آج وہ دونوں۔

"کیا ہو گیا ہے خولہ! جو دعا اس سے منگوانی تھی، وہ خود مانگ لینا وہ دعا تو سو فیصد بے غرض ہو گی جو تم خود مانگو گی۔" وہ اس کی خاموشی کو محسوس کر رہے تھے۔

"یہ تو ہے۔ مگر میرا دل چاہتا ہے آج کل ہر کوئی مجھے آپ کے حوالے سے دعا دے۔"

"خولہ! تمہیں کوئی وہم تنگ کر رہا ہے کیا؟" انہوں نے ونڈ اسکرین سے نظر ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں ضامن! آپ کی طرف سے مجھے کوئی وہم تنگ نہیں کرتا۔ مکمل اعتبار ہے آپ پر۔" وہ

مسکرائی۔ ”بس میرا دل چاہتا ہے پیپرز ہو رہے ہوں تو ہر کوئی امتحان میں کامیابی کی دعا دے۔ اگر ہمیر نگ ہے تو کیس جیت لینے کی دعا ملے۔“

”چلیں جناب! یہ اطمینان تو ہوا کہ اب آپ کے طفیل ہم بھی دعاؤں میں رہیں گے، زندگی بڑی سکون میں گزرنے والی ہے۔“

وہی دھیمے سروں والی ہنسی ہر سو بکھر گئی۔

ضامن نے اس کی طرف دیکھا۔ یہ ہنسی اب ان کی تھی جو عمر بھر ان کی ساعتوں کو کیف و سرور بخشنے والی تھی۔ بھرپور مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پہ آ ٹھہری۔

”آج تو آپ نے تین سوٹ ایک ہی رنگ میں لے دیے۔ اور اتنی ڈھیروں چوڑیاں۔ کون پہنے گا یہ سب؟“

”تم۔ سبز رنگ بہت اچھا لگتا ہے تم پہ۔ اور چوڑیاں بھی۔“

توبہ ہے یہ بندہ بھی ناں۔ وقت پہ سیدھی تعریف نہیں کرتا۔ اس دن کہہ رہے تھے تم سادہ ہی اچھی لگتی ہو اور آج جب وہ صرف منہ دھو کر ان کے ساتھ چلی آئی تھی تو انہیں اس دن کی بنی ٹھنی خولہ اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے چڑ کر جتا بھی دیا۔

”ہاں! تو اس کا سادہ سا مطلب یہ ہوا ناں کہ مجھے تم ہر روپ میں اچھی لگتی ہو۔ سادگی میں بھی اور اگر میرے لیے بنو سنورو گی تو بھی۔“

خولہ بنت زید کی چڑ تو فوراً رفو چکر ہوئی۔ گاڑی سرخ اشارے پہ رک گئی تھی۔

”پھول سی جوڑی کے لیے پھول صاحب۔“ ایک نوعمر لڑکا موتیا کے گجرے کلائی پہ لٹکائے، موتیا اور گلاب کے گلدستے ہاتھوں میں لیے جھکا۔

”چلو۔ آج سن اینڈ مون جیسا کپل نہیں تو پھول سی جوڑی تو قرار پائے۔“ ضامن مصطفیٰ نے سرخ و سفید پھولوں کا گلدستہ خرید کر اس کی طرف بڑھایا۔

”آپ نے گجرا کیوں نہیں لیا میرے لیے؟“ وہ پھولوں کی مہک کو اندر اتار کر نرمی سے ان پہ انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔

”مجھے اپنے ہاتھوں سے پہنانے کی اجازت دو تو ابھی لے لیتا ہوں۔“

کتنے ہی دلکش رنگ اس کے چہرے پہ بکھر گئے۔

”اقصیٰ تو کہتی ہے آپ خاصے خشک مزاج ہیں۔ بالکل بھی رومینٹک نہیں لگتے۔“ وہ نظریں جھکائے ہولے سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”ظاہر ہے وہ ایسا ہی کہیں گی۔ کیونکہ وہ خولہ نہیں ہیں۔“ انہوں نے اس کے دھنک رنگ چہرے کو نظروں کے حصار میں لیے جواب دیا۔ ”میری ذات کا یہ رنگ تو صرف تمہارے لیے ہے خولہ۔“

خولہ بنت زید ایک بار پھر اپنے بخت آوری پہ نازاں ہونے لگی۔ مسکراہٹ روشنی بن کے لبوں سے ہی نہیں بلکہ اس کے چہرے کے ہر ہر نقش سے پھوٹ رہی تھی۔

☆☆☆

گاڑی سے باہر نکل کر اس نے سامنے نگاہ دوڑائی۔

شہر خموشیاں اوپر سے کیسا پرسکون لگتا تھا اور اندر۔ اندر تو بس راز ہی تھے، اسرار ہی تھے۔ جانے کیا گزرتی ہوگی وہاں کے مکینوں پہ۔ کوئی جان نہ پاتا تھا۔ جانے والے کے جاننے والے اس کے اعمال کو بنیاد بنا کر اندازے لگاتے تھے، اور دعا کرتے تھے۔ آگے کی اللہ ہی جانے۔ بشر تو لاعلم ہے حیران ہے۔ کبھی ایک کتے کو پانی پلانے پہ فاحشہ کے سب گناہ اس کے نامہ اعمال سے مٹ جاتے ہیں اور کبھی ایک ولی اللہ ایک مستعار لی ہوئی سوئی۔ محض ایک سوئی اس کے مالک کو واپس نہ کرنے پہ قبر میں حساب دے رہا ہوتا ہے۔ رب، رب ہے۔ بندہ بشر کی ہر سوچ، اندازے، خیال سے بہت آگے بہت اوپر۔

”السلام علیکم یا اہل القبور۔“ اس نے قبرستان میں قدم رکھتے ہوئے زیر لب کہا۔ اور ٹھٹکی۔ جب وہ مایوس ہونے کو آئی تھی تب اس نے اسے دیکھ لیا تھا

۔اس کا دل زور سے دھڑکا۔ وہ تیزی سے ساتھ اس کی طرف آئی۔

"تو آج تمہیں پکڑ ہی لیا میں نے۔"

اپنی بھری ہوئی لال آنکھوں کو آستین سے پونچھتے ہوئے وہ لڑکا چونکا اور پھر اسے سامنے دیکھ کر حیران ہوا۔

"تم جانتے ہو، تمہارے لیے میں ہر ویک اینڈ پہ قبرستان آ رہی تھی۔ مگر ہاتھ تم آج آئے ہو۔"

"آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی تھیں؟" لڑکے نے نظریں چراتے ہوئے پوچھا۔ اس کے چہرے کے جاذب نظر نقوش میں نرمی اور سنجیدگی تھی۔

"تم نے یہ نہیں پوچھا کہ میں کون ہوں؟"

"میں جانتا ہوں۔" اس نے دھیمی سی آواز میں کہا تو خولہ حیران رہ گئی۔

"تم جانتے ہو۔ کیسے؟"

"میں عبدالہادی کے کیس کو فالو کر رہا ہوں۔"

"اوہ۔" خولہ نے سر ہلاتے ہوئے بغور اس کا جائزہ لیا۔ اسے کچھ کچھ یاد آ رہا تھا کہ وہ اسے دیکھ چکی ہے۔

"اس سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟" خولہ نے چھوٹی سی قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ جو تازہ موتیا کی کلیوں سے مہک رہی تھی اور خوشبو کا پیام لانے والا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس لڑکے کے جواب سے خولہ چونکی، ٹھٹکی اور پھر بغور اس کا جائزہ لیا۔

وہ پچیس چھبیس سال کا ایک خوبرو جوان تھا۔ یقیناً خوش لباس بھی تھا مگر لباس کی شکنیں بتاتی تھیں کہ اب خود سے لاپرواہ ہو چکا اس کی آنکھوں میں لکھی تحریر اور ان آنکھوں کی نمی واضح کرتی تھی کہ اس کے منہ سے نکلے لفظ سچ ہیں۔

"کیا ہم کچھ دیر بات کر سکتے ہیں؟"

"بالکل۔"

خولہ نے اپنے لائے ہوئے موتیا کے پھول اور کلیاں بھی اس قبر پہ بکھیریں، دعا کی اور ضامن مصطفیٰ کی ماں کی قبر کے پاس چلی آئی۔ اس کو وہاں دعا مانگتا دیکھ کر لڑکے نے بھی اس کی تقلید کی۔ اس نے خولہ سے نہیں پوچھا تھا کہ یہ کس کی قبر ہے۔ بس اس قبر میں ابدی نیند سوئے وجود کے لیے صدق دل سے دعا مانگی پھر وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے قبرستان سے باہر آ گئے۔

"تو تمہارا عبدالہادی کے ساتھ رشتہ رقیب کا سا ہے؟" خولہ نے اپنی گاڑی کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے پوچھا۔

لڑکا متحمل سا مسکرایا۔ تصدیق کی نہ تردید۔

"ایک بات پوچھوں؟"

"ایک وکیل مجھ سے کچھ پوچھنے کے لیے ہی ہم کلام ہو سکتی ہے۔" لڑکا پھر سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"عبدالہادی گلٹی ہے یا انوسینٹ؟" خولہ نے بہت غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"انوسینٹ۔" لڑکے نے جواب دینے میں ایک لمحہ کی تاخیر بھی نہ کی۔

خولہ چونکی۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھی۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟"

اس کے جواب نے ایک بار پھر خولہ کو ٹھٹک جانے پہ مجبور کیا۔ اسے اپنے اندر غصے کی ایک لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔

تو کیا اتنے عرصے سے عبدالہادی اسے بیوقوف بنا رہا تھا؟

"میں سب کچھ جاننا چاہتی ہوں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

لڑکا سر ہلا کر اسے سب کچھ بتاتا گیا۔ کئی ایسی باتیں بھی جن سے وہ انجان تھی۔ وہ نفی میں سر ہلاتی گئی۔ اسے عبدالہادی پہ غصہ تھا۔ شدید غصہ۔ وہ وہاں سے سیدھی حوالات آئی تھی۔ تھانے میں ابھی ناشتے کا دور چل رہا تھا۔ ایس ایچ او غائب تھا اور باقی عملہ اسے دیکھ کر گڑبڑا کر رہ گیا۔ انڈے پراٹھے اور چائے کا مزا کرکرا کر ڈالا تھا صبح صبح ایک وکیل کی صورت نے۔

"مجھے عبدالہادی سے ملنا ہے؟"

"اس وقت۔" حوالدار نے اس کے ہاتھ دیکھے۔ خالی تھے۔ نہ کوئی فائل نہ کوئی کیک۔

"جی اسی وقت۔"

طوعاً کرہاً اس کو عبدالہادی سے ملوایا گیا۔

"میں آج کسی سے مل کر آرہی ہوں عبدالہادی۔"

وہ اس کے عین سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

عبدالہادی نے صرف نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ بولا کچھ نہیں۔ مگر جب خولہ نے اس شخص کا نام لیا جس سے وہ مل کر آرہی تھی تو وہ چونک گیا تھا۔ اس کے چہرے پہ اضطراب بھی چھایا تھا۔

"تم نے مجھ سے یہ بات چھپائی کیوں؟" خولہ نے برہم ہو کر عبدالہادی سے پوچھا۔ اور وہ خاموش تھا۔ کوئی شرمندگی اس کے چہرے پہ نہ تھی۔ خولہ کو مزید غصہ آیا۔ "تم اپنے کیس کو خود ویک کر رہے ہو عبدالہادی!"

"مجھے پرواہ نہیں۔ مگر یہ بات آپ عدالت کے سامنے نہیں لائیں گی۔"

"عبدالہادی!" خولہ نے سر اپنے ہاتھوں میں تھاما۔ کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی پھر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"حقائق چھپانا جرم ہے۔"

"ایک چارج اور سہی۔" وہ لاپرواہ تھا۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی رہتا تھا۔

"اگر ہم عدالت میں اسے پیش کریں۔ اور وہ یہ بیان دے کہ۔"

"نہیں۔" عبدالہادی نے اسے مزید بولنے سے منع کیا۔

"کیوں؟ تمہیں اپنی جان عزیز نہیں عبدالہادی؟" اسے اپنے ہی کلائنٹ سے جرح کرنی پڑی۔

"مجھے اس کی عزت عزیز ہے۔" وہ فوراً بولا۔

خولہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"یہ بات سامنے آتی ہے تو جس مقصد کے لیے اس نے جان دی، وہ پیچھے چلا جاتا ہے اور دنیا محض اسے ایک لو اسٹوری سمجھنے لگے گی۔ مرچ مسالے لگا کر ایک دوسرے کو یہ قصہ سنایا جائے گا اور اس دنیا میں تو ہر کوئی جج بنا پھرتا ہے۔ سب سنیں گے اور اپنا اپنا فیصلہ دیں گے۔ آپ کی یہ معزز عدالت۔ اس میں تو اور بھی تماشے ہوں گے۔ اس کے کردار پہ سوال اٹھیں گے، انگلیاں اٹھیں گی۔ مجھے یہ سب قبول نہیں تھا۔ اور نہ ہی اب قبول ہے۔" اس کا لہجہ بے لچک تھا۔

خولہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

کیا تھا یہ شخص۔ دیوانہ، شیدائی، مجنوں۔

اس کی برہمی زائل ہونے لگی۔

"اتنا چاہتے ہو اسے۔ وہ بھی تمہیں چاہتی تھی یا نہیں؟" خولہ نے یہ سوال پہلے بھی پوچھا تھا مگر ایک وکیل بن کر۔ آج ایک دوست بن کر پوچھا۔

عبدالہادی کے چہرے پہ جو رنگ آئے، وہی اس سوال کا جواب تھے۔

"تم نے کچھ دیر کر دی عبدالہادی۔ ورنہ شاید یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔" وہ مغموم ہونے لگی۔

"ہاں۔۔۔ میں نے بہت دیر کر دی۔" اس سے زیادہ بھلا اور کون مغموم ہوتا۔

☆☆☆

ضامن مصطفیٰ جس طرح سے اسے شاپنگ کروا رہے تھے وہ تو چکرا کر رہ گئی۔ بے شک ماما بابا نے اس کی ہر خواہش کو ہمیشہ اہمیت دی، اسے پورا کیا۔ ماما، بابا اور وہ پہننے اوڑھنے، کھانے پینے، لینے دینے میں کھلے دل کے مالک تھے۔ جب سے وہ خود کمانے لگی تھی تب سے ہاتھ اور کھل گیا تھا مگر فضول خرچی اور اسراف کا تصور نہ تھا ان کے ہاں۔

اور ضامن مصطفیٰ۔

زیورات لیتے ہوئے خولہ کی جس چیز پہ نگاہ بھی پڑی انہوں نے خرید لی۔ لاکھ وہ شور مچاتی رہی کہ اتنی جیولری وہ کبھی پہن نہیں پائے گی۔ کپڑوں کی خریداری شروع ہوئی تو اسے قیمت کے معاملہ میں ایک لفظ بھی بولنے کی اجازت نہ تھی۔ شادی کے

جوڑے پہ تو حد ہو گئی۔ سوا چار لاکھ کا لہنگا ان دونوں کو پسند آ گیا۔ مگر قیمت معلوم ہونے پہ خولہ نہیں مانی۔ دونوں کے بیچ کچھ بحث اور پھر بدمزگی ہو گئی۔ ڈیزائنر سے میٹنگ کے بعد باہر نکلتے ہی خولہ نے ان کا موڈ دیکھا۔

"ضامن! یقین کریں، اس کام، اسی فیبرک اور اسی کامبینیشن کے ساتھ میں اس سے بہت کم قیمت میں یہ ڈریس تیار کروالوں گی۔"

"بات کلرز یا کام کی نہیں خولہ! تم شادی پہ سادہ سا لال جوڑا بھی پہن لو گی تو مجھے اچھی لگو گی۔ بات یہ ہے کہ مجھے تمہارے لیے کچھ بھی اچھا لگ جائے، تو پیسہ اس کے سامنے حقیر لگتا ہے۔ بس وہ چیز میں تمہارے لیے لے لینا چاہتا ہوں۔"

اس دفعہ اتنا اہم ہونے کا خیال بھی خولہ کو خوش نہ کر پایا۔

"میرا دل نہیں مانتا ضامن! محض چند گھنٹے پہننے کے لیے اس قیمت کا لباس۔ کسی غریب لڑکی کا تو پورا جہیز بن جائے۔" وہ پروفیسر زید ابصار کی بیٹی تھی، ان پر ہی گئی تھی۔

ذیلی سڑک سے گاڑی مین روڈ پہ ڈالتے ہوئے ضامن نے اس کی طرف دیکھا۔

"تم اماں جیسی باتیں کرتی ہو۔ وہ بھی کبھی روایتی قسم کی جاگیردارنی نہ بن پائی تھیں۔" ان کے چہرے کے نقوش میں وہی ہمیشہ والی نرمی رچ بس گئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے والی بدمزگی کا شائبہ تک نہ رہا تھا۔ خولہ نے سکون کی سانس لی۔

"شکر ہے اماں میرے لیے آسانیاں پیدا کر گئیں۔ ورنہ ان کے بیٹے پہ اپنا نقطہ نظر واضح کرنا خاصا مشکل ہو جاتا میرے لیے۔"

ضامن مسکرا دیے۔

"ویسے مجھے تو بابا بھی روایتی وڈیرے نہیں لگتے۔"

ردعمل اس کی توقع کے عین مطابق تھا۔ وہ فوراً اپنے ہونٹ بھینچ گئے۔

"ایک بات کہوں ضامن؟" اس نے ڈرتے ڈرتے ان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے کہنے کی اجازت دی نہ ہی منع کیا۔ اور اس نے تو بات کرنی ہی تھی۔ کتنے دنوں سے وہ اس موضوع پہ بات کرنا چاہتی تھی۔

"ضامن! بابا چاہتے ہیں کہ ہمارا ولیمہ گاؤں میں ہو اور..."

"ہرگز نہیں۔" انہوں نے اس کی بات مکمل بھی نہ ہونے دی اور قطعیت کے ساتھ انکار کر دیا۔ "اس حویلی میں تم قدم بھی رکھو، مجھے منظور نہیں۔"

"کیوں؟"

وہ خاموش رہے۔ اس نے اپنا سوال دہرایا۔ پھر جواب میں خاموشی تھی۔ وہ چڑ گئی۔

"ضامن! میں پوچھ رہی ہوں کہ کیوں؟ مجھے وجہ بتائیں پھر تو ہو سکتا ہے کہ میں قائل ہو جاؤں۔"

"مانا کہ آپ وکیل ہیں۔ مگر میں اس وقت بحث کے موڈ میں نہیں۔" قطعی انداز میں کہتے ہوئے انہوں نے ڈیش بورڈ پہ رکھے سگریٹ کیس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ خولہ نے جلدی سے کیس ایک طرف کر دیا۔

"سگریٹ مت پیا کریں آپ۔"

"جب تم آجاؤ گی تو نہیں پیوں گا۔"

"کیوں پھر سورج کسی اور سمت سے طلوع ہو گا کیا؟"

"نہیں۔ آپ کی قربت میں کسی اور نشے کی ضرورت نہیں رہے گی۔"

وکیل صاحبہ کی بولتی بند ہو گئی۔ وہ گلابی چہرہ لیے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

ضامن مصطفیٰ پہ اگر سنجیدگی طاری ہو جاتی وہ کبھی بھی اتنی جلدی نارمل موڈ میں نہیں آتے تھے مگر خولہ بنت زید کی رفاقت میں بھی بڑا دم تھا۔

"کچھ کہہ رہی تھیں آپ؟" وہ مسکراتے ہوئے اسے تنگ کرنے کے انداز میں پوچھ رہے تھے۔

"نہیں کچھ نہیں ماما کہتی ہیں کہ عورت کی ادا اور

pklibrary.com

مرد کی زبان اس کے خاص ہتھیار ہیں زیر کرنے کے لیے۔'' اس کا چہرہ ابھی بھی کھڑکی کی طرف تھا۔

''عورت کی ادا۔ تو آج صبح سے جو آپ مجھ سے لڑ رہی ہیں۔ وہ آپ کی ادا ٹھہری کیا؟''

وہ مسکرانے پہ مجبور ہوئی۔

''اور کیا کہتی ہیں آپ کی ماما؟''

''اور کہتی ہیں۔ مرد سن بے شک سب کی لیتا ہے مگر کرتا اپنے من کی ہے۔'' اس کے لہجے میں کہیں ہلکی سی خفگی کی جھلک تھی۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئے۔

''خولہ!'' تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولے۔ ''میں گوٹھ اطلاع کروا دیتا ہوں۔ ہم ولیمہ وہاں کریں گے۔ میں تمہاری سن رہا ہوں اور مان بھی رہا ہوں۔'' وہ بالکل سنجیدہ ہو چکے تھے۔ خولہ نے چہرہ موڑ کر ان کی طرف دیکھا۔

''ضامن! آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میری یہ خواہش کب ہے کہ آپ صرف میری سنیں اور صرف میری مانیں۔ میں تو یہ چاہتی ہوں۔ آپ اپنی صحیح طرح سے سنائیں اور پھر منوائیں۔ آپ کے اپنے بابا اور بہن بھائیوں کے ساتھ اگر کچھ پرابلمز ہیں تو آپ مجھ سے بھی شیئر کریں۔ آخر میں بھی اس خاندان کا حصہ بننے جا رہی ہوں۔''

''تم بھی غلط سمجھ رہی ہو خولہ۔ میں تم سے کچھ چھپا نہیں رہا۔ میری زندگی کوئی مسٹری یا پزل نہیں کہ تم حل نہ کر پاؤ۔ شاید بہت عام سی باتیں ہیں۔ جب تم اس گھر میں آؤ گی۔ تو حقائق تم سے چھپے چھوڑی رہیں گے۔ پھر اگر میں چاہتا ہوں کہ یہ وقت صرف میرا اور تمہارا ہو، ہم صرف اپنی بات کریں۔ اپنے خواب دیکھیں تو کیا میری یہ چھوٹی سی خواہش ناجائز ہے؟''

خولہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے۔

''پھول۔'' وہ ایک دم چلائی۔

''صرف پھول یا گجرے بھی؟'' وہ شرارت سے مسکرائے۔

''صرف پھول۔'' وہ بھی کھل کر مسکرا دی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ ضامن سے اس کے بابا، فیملی اور گوٹھ کے بارے میں اس وقت تک بات نہیں کرے گی جب تک وہ خود نہ چاہیں۔

☆☆☆

جب ضامن مصطفیٰ آئے، پروفیسر زید ابصار بنیان شلوار میں ملبوس ہاتھوں میں پائپ لیے مالی کی ہفتہ وار ڈیوٹی سرانجام دے رہے تھے۔ اور وہ جو مالی تھا زید ہاشم۔ وہ مزے سے پڑھائی کے بہانے اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔

آج چھٹی کا دن تھا اور ثروت نے ضامن کو لنچ پہ انوائٹ کیا تھا۔ ضامن انہیں لان میں دیکھ کر ان کی طرف چلے آئے۔ چھوٹے سے سجے سنورے لان کو دیکھتے ہوئے ان کی نظروں میں ستائش تھی۔

''آپ کا اور میرا یہ شوق مشترک ہے۔ میں بھی اپنے پھول پودوں کی دیکھ بھال زیادہ تر خود کرتا ہوں۔ بڑے نایاب پودے ہیں میرے پاس۔ کبھی آئیں ناں گھر اور دیکھیں میرا لان۔ میں نے کیسا سنوارا ہوا ہے۔''

''ظاہر ہے بھائی۔ میرے چمن کا سب سے خوب صورت پھول چرا کر لے جا رہے ہو، بہار تو تمہارے ہاں ہی آنی ہے۔'' پروفیسر صاحب نے شگفتگی کے ساتھ جواب دیا تو ضامن ہنس دیے۔

''ضامن! ایک بات کرنی تھی بیٹا تم سے۔ مگر ثروت کو پتا نہ چلے'' پروفیسر صاحب پائپ ایک طرف رکھ کر ان کے قریب آئے اور ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر رازدارانہ انداز میں کہنے لگے۔

''جی کہیں۔'' ضامن نے مودبانہ انداز میں کہا۔

''میرے اسٹوڈنٹ کے بھائی کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ چھ ماہ سے بستر پہ پڑا ہے۔ علاج کے لیے کافی رقم درکار ہے۔ غریب ہے چھوٹے چھوٹے بچوں والا ہے۔ اس کا علاج کروا دو تو اللہ جزا دے گا۔''

''جی ضرور۔ مجھے خوشی ہوگی۔ اگر وہ صحت یاب ہو جائے تو۔''

''اللہ بھی خوش ہوگا بیٹا۔'' پروفیسر صاحب کا

روشن چہرہ اطمینان اور سکون کے احساس کے ساتھ مزید چمکنے لگا۔

''چلو اندر چلیں۔''

''میں تو ڈر ہی گیا تھا ایسی کیا بات ہے جو آنٹی سے چھپائی جارہی ہے۔''

''ارے بھئی۔ اس کو پتا چلا تو لڑنا شروع کر دے گی مجھ سے کہ ہونے والے داماد سے فلاح و بہبود کے لیے چندہ مانگنا شروع کر دیا۔'' ضامن ہلکا سا مسکراتے ہوئے سوچنے لگے کہ یہ پروفیسر زید البصار بھی کتنے سادہ انسان ہیں۔ جن کے رعب میں وہ ابھی تک رہتے ہیں۔

''تم بیٹھو۔ آج خواتین کچن میں بڑی بزی ہیں۔ ان کو اطلاع کر دوں۔ اور ذرا اپنا حلیہ بھی درست کروں۔'' وہ انہیں لاؤنج میں بٹھا کر جانے لگے اور پھر پلٹے۔

''اور ضامن! یہ خولہ کو زیور وغیرہ کم لے کر دیا کرو۔ میری بیگم نے دیکھ دیکھ کر مجھ سے حساب کتاب شروع کر دیا ہے کہ میں نے آج تک اسے کیا کیا لے کر دیا ہے۔'' بہت ہلکے پھلکے انداز میں کہہ کر وہ چل دیئے۔

ضامن انہیں دیکھ کر رہ گئے۔

کیسے لوگ تھے یہ لالچ اور حرص سے پاک۔ انہوں نے زن، زر، زمین کے پیچھے کتوں کی طرح ایک دوسرے کو بھنبھوڑتے دیکھا تھا لوگوں کو۔ اسی زمین کے چکر میں ان کے اپنے خاندان کی ایک عورت کاری کر دی گئی۔ وہ عورت جس کی شرم و حیا کی لوگ مثال دیتے تھے، اس کا نام کسی کے ساتھ جوڑ کر اس کی جان لے کر غیرت مند بھی بن بیٹھے اور اس کی زمین پہ قابض بھی ہو بیٹھے۔

جانے کیا کیا یاد آنے لگا تھا انہیں۔ خولہ کو دیکھا، اس کی ہنسی کو سنا تو بھیانک سوچوں سے دماغ کو آزاد کروا پائے۔

سفید گھیر دار شلوار کے ساتھ چھوٹی گول دامن کی رائل بلیو اور وائٹ پرنٹ کی قمیص پہنے، سفید دوپٹہ گلے میں ڈالے گھریلو سے حلیے میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ ان کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے وہ ہرا دھنیا اور ہری پیاز کاٹ رہی تھی۔ ماما اور بابا کی موجودگی میں وہ اسے کہہ نہ پائے مگر حقیقت یہ تھی کہ اسے اس روپ میں دیکھ کر بڑا اچھا لگ رہا تھا۔

''تو آپ کی ملاقات ہوگئی اس لڑکے سے؟''

خولہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے انہیں تفصیلات سے آگاہ کیا۔

''یہ تو بڑا اسٹرونگ پوائنٹ ہے۔ اس پہ عبدالہادی کی بیل ہو سکتی ہے، اس پہ لگا ہوا الزام صاف ہو سکتا ہے۔''

''ہاں۔ مگر عبدالہادی بھی ناں۔ اپنی آزادی کے لیے بھی اس لیے منہ نہ کھولے گا کہ اس سے اس کے محبوب پہ انگلیاں اٹھیں گی۔ عجیب دیوانہ ہے۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے۔ ایسے چاہنے والے بھی ہیں آج کی دنیا میں۔'' پیاز کاٹتے میں مگن وہ بول رہی تھی۔

ضامن مسکرائے۔

''ہم یہ نگاہ نہیں جاتی آپ کی۔'' انہوں نے کہنا بھی چاہا مگر کہہ کیسے دیتے۔ دائیں جانب ہونے والا سسر اور بالکل سامنے ہونے والی ساس جو بیٹھے تھے۔

☆☆☆

ضامن مصطفیٰ کی مائیں، سوتیلے، بہن بھائی، چچا اور پھوپھیاں چاہے اپنے پن میں، چاہے دنیا دکھاوے کو سہی، شادی میں شرکت کے لیے ہفتہ بھر پہلے آنے کو تیار بیٹھے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ تیاری پکڑتے، ضامن نے انہیں ولیمے کے دعوت نامے بھیج دیئے۔ اب وہ بھلا کیسے پہلے آجاتے۔ کئی نے تو احتجاجاً ولیمے پہ بھی نہ جانے کا اعلان کر دیا اور ضامن کو اس سے کچھ فرق نہ پڑتا تھا۔

خولہ کو مُرک نے فون پہ بتایا تھا۔

''مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں بھی ولیمے پر ہی پہنچوں گی۔ میں تو آخری وائیوا دیتے ہی کراچی آ

دھمکوں گی۔ بھاؤ کو اچھا لگے بھلے نہ لگے۔" مُرک نے اپنے ارادے ظاہر کیے تو وہ ہنس دی۔

دو ہفتے پہلے وہ پہنچ گئی تھی۔ شادی کے لیے اپنی تیاری اس نے خولہ کے ساتھ کی تھی۔ دو بار ضامن مصطفیٰ بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ بہت خاموش رہے۔ مُرک ہی ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی بات کرتی رہتی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو خود آگے بڑھ کر اجنبیت کی دیوار گراتے ہیں، فاصلے مٹاتے ہیں۔ جب وہ پہلی بار رشتے کے لیے اپنے والدین کے ساتھ ان کے گھر آئی تھی تو والد اور چھوٹی ماں کی موجودگی میں چپ چپ رہی مگر اب اس کی خوش مزاجی دیکھ کر اسے لگتا کہ ضامن کے قریب جانے میں بھی ساری کوشش اس کی اپنی ہو گی۔ اور یہی بات اس نے جب "چاچا جی" کی تھالی کھاتے ہوئے اس سے کہی تو وہ ہنس دی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ بھابی! بھاؤ تو شاید جانتے بھی نہ تھے کہ ان کی پانچ ماؤں کے بچوں میں سے ایک مُرک فاطمہ بھی ہے۔ بابا کی ہر بیوی نے انہیں زیادہ بیٹے دیئے۔ میری ماں کی تین بیٹیاں تھیں اس لیے وہ پس منظر میں ہی رہیں۔ بڑی دونوں بہنیں چودہ پندرہ برس کی عمر میں خاندن میں ہی بیاہی گئیں۔ اسی خاندان کی بیٹی ہونے کے باوجود میرے اندر الگ سی خواہش پیدا ہونے لگی۔ میں آگے بڑھنے کے، ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھنے لگی۔ یہ جان کر حویلی میں تو جیسے قیامت ہی آ گئی۔ ادا ملہار اور ادا مہران نے کہہ دیا کہ میں نے آئندہ ایسی کسی خواہش کا اظہار بھی کیا تو وہ میری زبان کھینچ ڈالیں گے۔ میری ٹانگیں توڑ دیں گے۔ اور اماں سے کہہ دیا کہ وہ میری شادی کی تیاری کریں۔"

"بابا تو بہت سلجھی ہوئی طبیعت اور کھلے ذہن کے مالک لگتے ہیں، انہوں نے تمہاری خواہش پوری کیوں نہیں کی؟" خولہ کو حیرت ہوئی۔

"بابا عورت ذات کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں مگر وہ عورت کے جذبات اور احساسات کو سمجھ نہیں پاتے۔ ہم بہنوں کی پیدائش پہ انہوں نے خاندان کے باقی مردوں کی طرح کبھی ہماری ماں کو بیٹیاں پیدا کرنے کا طعنہ نہیں دیا مگر وہ پیار وہ توجہ اور حقوق بھی نہیں دیئے جو ہمیں ملنے چاہیے تھے۔ ادا مہران اور ادا ملہار کے رویوں پہ وہ بالکل خاموش رہے۔ اور پھر جب چاچا نے کہہ دیا کہ اگر مُرک نے اپنی تعلیم جاری رکھی تو وہ مجھے اپنے بیٹے کے لیے نہیں لیں گے تو بابا نے اماں سے کہہ دیا کہ مُرک سے کہو کہ وہ خاموشی کے ساتھ کراچی یا حیدرآباد جا کر اپنی شادی کی تیاری کرے۔

یقین کریں بھابی، ان دنوں مجھے لگتا تھا کہ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ ہر رستہ میرے لیے بند ہو چکا ہے۔ پھر عباس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں ضامن بھاؤ سے بات کروں۔ میں نے عباس سے نمبر لے کر ان سے بات کی پھر تو جیسے کرشمہ ہی ہو گیا۔ بیس سال۔ بیس سال بعد حویلی نے ضامن بھاؤ کی آواز سنی۔ انہوں نے فون کیا تھا میرے لیے۔ اور پھر تین سال بعد انہوں نے حویلی میں قدم رکھا آپ کے لیے۔"

خولہ ذرا سا مسکرائی۔

"پھر بابا مان گئے آرام سے؟"

"ارے وہ تو رائے دیاس کی طرح اپنا سر کاٹ کر ضامن بھاؤ کے ہاتھ میں دے دیتے اس وقت۔ یہ بات کیوں نہ مانتے۔"

"اتنا پیار کرتے ہیں بابا ضامن سے۔ پھر ضامن ان سے اتنے خفا کیوں ہیں؟" کھانا پینا وہ دونوں یکسر بھولی ہوئی تھیں۔

"ہوں۔ شاید بابا کی اتنی شادیوں پہ انہیں اعتراض ہو یا پھر اپنی ماں سے بابا کے سلوک پہ ناراض ہوں۔ بابا نے ان کے ساتھ پسند کی شادی کی اور پھر طلاق دے کر گھر سے نکال دیا۔"

پہلی وجہ تو خولہ کے ذہن میں بھی آتی تھی مگر یہ سن کر اسے شدید جھٹکا لگا کہ ضامن کے بابا ان کی اماں کو طلاق دے چکے تھے۔

☆☆☆

پیلے جوڑے میں وہ نظر لگ جانے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی۔ بالوں، کانوں اور کلائیوں میں سجے موتیوں کی کلیوں سے زیادہ وہ خود مہک رہی تھی۔ سہیلیاں، کزنز اور چھوٹی مامی ڈھولک پہ ”مہندی نی مہندی“ گا رہی تھیں۔

لاؤنج میں قالین پہ انہی کے بیچ بیٹھی لبوں پہ دھیمی سی مسکان سجائے وہ انہیں سن رہی تھی۔ کبھی کبھی تالیوں میں ان کا ساتھ دے دیتی۔ اقصیٰ کی کال آئی تو وہ اٹھ کر ماما بابا کے بیڈروم میں آ گئی۔ اقصیٰ بے وفا اس سے برسوں پرانی دوستی بھلائے ضامن مصطفیٰ کی طرف سے آ رہی تھی۔ اس کے طعنے اور لعنتیں ملامتیں سننے کے بعد اس نے اطلاع دی کہ وہ لوگ اس کی طرف پہنچنے والے ہیں۔

اس نے مسکراتے ہوئے سیل فون کان سے ہٹایا ہی تھا کہ دوسری کال آ گئی۔ نمبر نیا تھا۔

”تو پیا کو پیاری ہو رہی ہیں ایڈووکیٹ خولہ بنت زید؟“ اس نے آواز پہچان کر لب بھینچ لیے۔

”شکوہ رہے گا ہمیں کہ آپ نے دعوت نہیں دی۔ ہم نے تو سنا تھا کہ خوشی غمی کے موقع پر سب دشمنیاں بھلا دی جاتی ہیں۔“

وہ اس وقت اپنا موڈ خراب کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے اپنا موبائل ہی آف کر دیا۔ وہ جانتی تھی کہ اب وہ مختلف نمبروں سے بار بار کال کرنے کی کوشش کرے گا۔

”دولہا والے آ گئے ہیں۔“ اس کی کزن وردہ نے شرارتی سے انداز میں آ کر اطلاع دی۔ اس کے لب مسکا اٹھے۔

”بہت کم لوگ آئے ہیں تمہارے سسرال کی طرف سے؟“

”ہاں۔ ضامن کی فیملی کے زیادہ تر گاؤں میں رہتے ہیں۔ ویسے پرآئیں گے سب۔“

اس نے آہستگی سے جواب دیا۔ وہ جانتی تھی کہ ایسے سوال انھیں گے۔ وردہ کے جانے کے بعد وہ بیڈ سے اٹھ کر آئینے کے سامنے آنے لگی مگر بے اختیار اس کے قدم کھڑکی کی جانب اٹھے۔

لان بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ مہندی کا چھوٹا سا فنکشن یہیں ہوتا تھا۔ ضامن مصطفیٰ بائیں رخ سے اسے نظر آ رہے تھے۔ سفید قمیص شلوار، کندھوں پہ اجرک۔ وہ آج بالکل سندھی وڈیرے لگ رہے تھے۔ اس کی نگاہ ان پر سے ہٹنی مشکل ہوئی۔ وہ ساحر ہمیشہ کی طرح منتر پڑھ کر اسے سحر زدہ سا کر گیا۔ وہ انہیں دیکھتی چلی گئی۔

وہ پیلے اور سفید پھولوں کی چھت سے ڈھکے اور سجے صوفے سے اٹھ کر کسی کی بات سننے لگے تھے۔ اب وہ بالکل سامنے تھے۔

کتنے وجیہہ کتنے پر وقار لگ رہے تھے وہ۔ جانے کس کس نے ان کے ساتھ کی خواہش کی ہو گی۔ مگر اللہ اس پہ مہربان تھا جو اس شخص کا ساتھ اس کے نصیب میں لکھا۔

وہ بڑی آسودہ سی ہو کر مسکرا دی۔ اس پل بات کرتے کرتے ضامن کی نگاہ بھی اس طرف اٹھی۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹی۔

باہر لان میں ضامن سے بات کرتا ہوا عباس حیران رہ گیا کہ اتنی سنجیدہ گفتگو کے دوران ضامن بھاؤ کے چہرے پہ ایک دم اتنی جان دار اتنی بھرپور مسکراہٹ کہاں سے آ بکھری۔ اندر وہ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ ماتھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے پھر سے بیڈ پر آ بیٹھی۔

”توبہ ہے، ضامن بھی کیا سوچتے ہوں گے۔“

”اوہو۔ اکیلے اکیلے مسکرایا جا رہا ہے۔ وجہ؟“ اقصیٰ اور مامی کمرے میں داخل ہوئیں۔ اب اقصیٰ کمر پہ ہاتھ رکھے اس سے پوچھ رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی۔

”چھوڑو بھئی۔ یہ وقت ہی ایسا ہوتا ہے۔ ان دنوں مسکرانے کے لیے کوئی وجہ نہیں چاہیے ہوتی۔“ مامی ہنستے ہوئے بولیں۔

”ہاں۔ اور بعد میں لڑنے کے لیے کوئی وجہ نہیں چاہیے ہوتی۔“ اقصیٰ نے منہ پھلا کر کہا۔ اس کی تیمور

سے تازہ تازہ جھڑپ ہوئی تھی۔

"اچھا۔ ڈراؤ مت مجھے۔" خولہ فوراً بولی تو وہ دونوں ہنس دیں۔

"اچھا نہیں ڈراتی میں تمہیں۔ خوش کرتی ہوں۔ تمہارا ہیرو تو آج اتنا زبردست اتنا حسین اتنا جمیل۔"

"بس بس نظر مت لگا دینا۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میرا تیمور کسی سے کم ہے کیا جو میں تمہارے سائیں کو نظر لگاؤں گی۔"

"جہاں ضامن مصطفیٰ ہوتا ہے وہاں کوئی اور نظر نہیں آتا۔" وہ شوخ ہوئی۔ مامی نے پیار سے اسے دیکھا۔

"لڑکی۔ کل کے بعد سے تم ہمیں پہچانو گی بھی یا نہیں۔" اقصیٰ متفکر ہوئی تو وہ ہنس دی۔

اسے ضامن مصطفیٰ کے ساتھ بٹھایا گیا تو ہر ایک کے منہ سے اس جوڑی کو دیکھ کر بے اختیار "ماشاءاللہ" نکلا۔

عباس نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف خود کروایا۔ نام سے تو وہ پہلے جانتی تھی۔ ایک دو دفعہ ضامن نے اس کے سامنے فون پہ بات کرتے ہوئے یہ نام لیا تھا پھر مُرک کی گفتگو میں تو اکثر اس کا نام آتا تھا۔ تبھی اسے پتا چلا تھا کہ وہ ان کا بھائی ہے جو این ای ڈی سے آرکیٹیکٹ بن کر نکلنے والا ہے۔ اور مزاج میں حویلی میں بسنے والے بھائیوں سے خاصا مختلف ہے۔

"بڑا ڈھیٹ قسم کا دیور ہوں میں آپ کا۔ کچھ بندے ہمارے ساتھ خاصی سرد مہری سے پیش آتے ہیں مگر ہم بھی ان کی جان چھوڑنے والے نہیں۔" اس نے کن انکھیوں سے ضامن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور آپ کے لیے وارننگ ہے۔ خوش دلی سے ہمارے رشتے کو قبول کر لیں ورنہ۔ ورنہ۔ ورنہ مجھ کو بھگتنا تو آپ نے پھر بھی ہر حال میں ہے۔"

اس کا دھمکی آمیز لہجہ سن کر وہ ہنس دی۔ اور اس کی مدھر ہنسی ضامن مصطفیٰ پہ طاری ہوتی سنجیدگی کو پرے دھکیل کر ان کے ہونٹوں پر پھر سے مسکراہٹ سجا گئی۔

"ماشاءاللہ۔ بڑی سمجھ دار ہیں آپ۔" اپنی بات کے ردعمل پر اس کی ہنسی کو عباس نے اچھے تعلقات کی بنیاد جان کر سراہا۔ "بڑے قسمت والے ہیں ہمارے بھاؤ۔ جنہیں آپ مل رہی ہیں۔"

"نہیں۔ میں خوش قسمت ہوں۔" وہ بے ساختہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"اووو۔" عباس کے ساتھ ساتھ مختلف شرارت بھری آوازیں بلند ہوئیں۔

"ٹھیک کہہ رہی ہیں اقصیٰ تم۔ کل کے بعد تو یہ لڑکی ہمیں پہچاننے والی نہیں۔" مامی بولیں۔

"اقصیٰ تو رہنے دیں بھئی۔ یہ تو ہمیں بھول گئی۔ کے بجائے بیکی کی طرف سے شرکت کرنے لڑکے والوں کے ساتھ آ رہی تھی۔" خولہ کی پھوپھی نے اقصیٰ کی کلاس لی۔

"ان کا قصور نہیں ہے۔ میں نے ہی اصرار کیا تھا کہ یہ ہمارے ساتھ چلیں۔" مُرک نے جلدی سے اس کی صفائی دی۔

"تم دولہا کی بہن ہو۔ اس لیے تمہارے سات خون بھی معاف۔" مامی نے شاہانہ انداز میں کہا تو سب ہنس دیے۔

مہندی کی رسم شروع ہوئی تو ضامن مصطفیٰ تو اس لیے بچ گئے کہ سب ان سے کچھ جھجک رہی تھیں مگر خولہ کی شامت آ گئی۔ مٹھائی کھلا کھلا کر بے حال کر دیا۔ آخر عباس نے اس کی حالت دیکھ کر اعلان کیا کہ خولہ کے "اسٹینڈ بائے" پہ اب وہ مٹھائی کھائے گا۔

وردہ کی ڈھولک، مامی اور ساحرہ کی خوبصورت آواز پہ سب ہی جھومے مگر اصل رنگ تب جما جب سب کی پرزور فرمائش پہ مُرک نے مومل کے ساتھ مل کر "مور تھوئے رانا" گانا شروع کیا

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

☆☆

www.paksociety.com

نمرہ احمد

## اٹھائیسویں قسط

"وہ جانتا ہے کہ ہلال کہاں ہے۔ اور سرکار کون ہے۔ زیاد سلطان ہماری کہانی کا وہ واحد کردار ہے جو سب جانتا ہے۔"

"وہ تمہیں کیوں بتائے گا کچھ؟"

"ہر انسان کو کچھ نہ کچھ چاہیے ہوتا ہے۔ میں اس سے ہلال کے بدلے میں کوئی ڈیل کر سکتا ہوں۔"

"ہاں۔ اس ایک کام میں تم بہت اچھے ہو۔" مالا نے گلہ آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ قلعے کی سیڑھیوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ سارا وجود اب نیم اندھیرے میں تھا۔

"وہ میرے ساتھ عرصے سے ایک ڈیل کرنا چاہتا ہے۔ اس نے مجھے اس مرڈر کیس میں اس لیے پھنسایا کیونکہ میں نے اس کی بات نہیں مانی تھی۔"

"کون سی بات؟" وہ چونکی۔

چند لمحے کے لیے سیڑھیوں کے دہانے پہ خاموشی چھا گئی۔ لکڑی کے زینوں کے دونوں کناروں پر موم بتیاں جل رہی تھیں۔ چھت سے لٹکتا فانوس بھی دمک رہا تھا۔ وہ کچھ دیر اس مدھم روشنی میں مالا کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ وہ آنکھوں کی پتلیاں سکوڑے اس کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"اس نے کہا تھا کہ میں تمہاری زندگی سے نکل جاؤں۔"

"مگر تم میری زندگی میں تھے ہی نہیں۔"

کسی کھلی کھڑکی سے ہوا کا جھونکا اندر آیا۔ بہت سی موم بتیوں کے شعلے خوف سے پھڑپھڑائے۔ اور ماہر فرید نے گہری سانس لی۔

"جانتا ہوں۔ اسی لیے میں نے اس کی بات نہیں مانی تھی۔ اب بھی وہ یہی کہے گا۔"

"اگر ہلال کے بدلے میں وہ یہ شرط رکھتا ہے تو تمہیں جلد از جلد میری زندگی سے نکل جانا چاہیے۔"

ہلکے سے شانے اچکا کے وہ زینے چڑھنے لگی۔ ماہر نے جواب نہیں دیا۔ وہ اس کے پیچھے ہو لیا۔ ہر قدم کے ساتھ زینے سے لکڑی کے چٹخنے کی آواز آتی تھی۔

"میں صرف اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں جان جاتا ہوں کہ لوگ مجھ سے کب سچ بولتے ہیں اور کب نہیں بولتے۔"

وہ اسی طرح اوپر چڑھتی رہی۔ مڑ کے نہیں دیکھا۔ کیا وہ ایسے ہی کہہ رہا تھا یا اسے کوئی شک تھا؟

"تمہیں زیاد سے ملنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ہلال کو واپس کر دے گا۔"

وہ اوپر جا چکی تھی۔ وہ چند زینے نیچے تھا۔ ریلنگ پر جما ہاتھ وہیں ٹھہر گیا۔ چونک کر اس کی پشت کو دیکھا۔

"کیا اس نے ایسا کہا ہے؟" وہ ایک دم تیزی سے لپک کے اس کے سامنے آیا۔ وہ اس سے نگاہ

ملائے بغیر ایک کمرے کے بند دروازے کی طرف جارہی تھی۔ اس کی نچلی درز سے روشنی جھانک رہی تھی۔

"وہ کردے گا۔ وہ میرے لیے یہ کردے گا۔" مالا نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔ وہ اب بھی اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔

"کیوں؟ تم تو اس سے الگ ہو رہی ہو، پھر وہ کیوں..." اور اگلے ہی لمحے کسی نے اس کے دل پہ پیر رکھ دیا۔

"تم واپس اس کے پاس چلی جاؤ گی؟" وہ بے یقین تھا۔

"یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔" اس نے دروازہ کھول دیا۔ اندر سے بہت سی روشنی باہر آئی۔

وہ ایک ہوادار اونچی کھڑکیوں والا روشن کمرہ تھا۔ ایک کونے میں قد آور آئینہ رکھا تھا جس کے سامنے سفید ریشم کے لباس والی روبی کھڑی تھی۔

وہ آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے سر پر رکھا جالی دار نقاب درست کر رہی تھی۔ آہٹ پہ پلٹی۔ انہیں دیکھ کے مسکرائی۔

"یہ ماہر ہے۔ میرا سیکنڈ فوٹوگرافر۔" وہ رسمی مسکراہٹ کے ساتھ کہتی آگے آئی۔ وہ جو بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، لب بھینچے خاموش ہو گیا۔

"تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا؟ مجھے تصویروں میں پتلا نظر آنا چاہیے۔" روبی کی آنکھوں میں بہت سے ستارے دمک رہے تھے۔ مالا مسکرائی۔ اس دفعہ اس کی مسکراہٹ خالص تھی۔

"میں پوری کوشش کروں گی۔"

"روبی۔ تم ویسے بھی خوب صورت ہو۔" وہ دیوار سے ٹیک لگائے، پیروں کی قینچی بنائے، جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا۔ ماتھے کی شکنیں گہری تھیں۔

## مکمل ناول

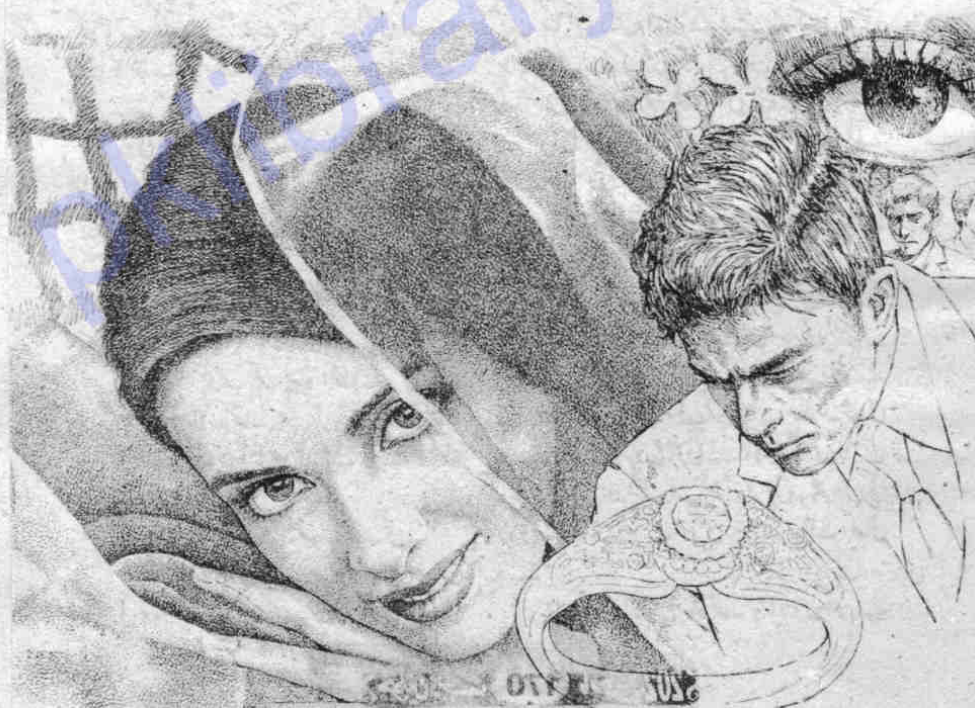

سفید لباس والی دلہن اس کی طرف گھومی۔ تیوریاں چڑھ گئیں۔

"میں ایک موٹی لڑکی ہوں۔ ایک پلس سائز لڑکی۔ اور بالکل بھی یہ مت کہنا کہ سارے جسم خوب صورت ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ وہ بات ہے جو موٹے لوگوں نے اپنے جیسے دوسرے موٹے لوگوں کا دل رکھنے کے لیے گھڑ رکھی ہے۔" اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ ورنہ کسی موٹے انسان کو اپنا جسم پسند نہیں ہوتا کیونکہ ہمارے اوپر کچھ اچھا نہیں لگتا۔ ہر تصویر کے لیے پوز کرتے وقت ہمیں خوف ہوتا ہے کہ ہمارے جسم کی چربی نظر نہ آجائے۔ مگر وہ پھر بھی نہیں چھپتی۔" پھر اس نے چہرہ مالا کی طرف موڑا۔ "لیکن مالا نے کہا ہے کہ وہ ایک الوژنسٹ ہے۔ اور وہ بنا فوٹوشاپ کے مجھے پتلا دکھا سکتی ہے۔" وہ بہت امید سے اسے دیکھ رہی تھی۔ مالا نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ماہر کی پرواہ نہ کرو۔ یہ خود بھی نہ نان خطائی کھاتا ہے نہ لسکٹ۔" بہت سکون سے کہتی اب وہ روبی کا نقاب درست کر رہی تھی۔ ماہر نے شانے اچکا دیے۔

روبی کی ماں آگئی اور وہ میک اپ آرٹسٹ کے ساتھ اس کے میک اپ کو آخری ٹچز دینے لگے تو وہ اس کے قریب آیا۔

وہ سر جھکائے، کیمرے کے بٹن دباتی ننھی اسکرین میں کچھ دیکھ رہی تھی۔ وہ کھنکھارا۔

"پلے دی مین اینڈ ناٹ دی بال۔"

"ہوں؟" چونک کر چہرہ اٹھایا۔ وہ نفی میں دائیں بائیں سر ہلا رہا تھا۔

"جب کھیلنا نہ آتا ہو تو کھیلنے والے کو کھیلنا چاہیے۔ ہے نا؟"

"مطلب؟" وہ واپس کیمرہ پہ جھک گئی۔

"وہ لڑکی اتنی موٹی نہیں ہے۔ تمہیں اس کی ان سیکیورٹی دور کرنی چاہیے تھی۔ مگر تم اس کی تصدیق کر رہی ہو۔"

"میں اس کی تھیراپسٹ ہوں، نہ اس کی ماں۔ یہ میری جاب نہیں ہے کہ میں اس کی ان سیکیورٹی دور کروں۔ ابھی دنیا میں ایسی عورت بنی نہیں ہے جو آئینے میں خود کو دیکھے اور اسے کوئی خامی نہ نظر آئے۔"

ماہر فرید نے دونوں ابرو اٹھائے۔

"تم بھی؟" اس نے استعجاب سے سبز آنکھوں والی خوب صورت لڑکی کو دیکھا، جس کے چہرے پر کوئی میک اپ نہ تھا۔ صرف شفافیت اور سادگی تھی۔

"ہاں، میں بھی۔" مالا نے کھڑکی کے شیشے کو دیکھا جس پر اس کا عکس نمایاں تھا۔ چہرے پر دانے تھے۔ آنکھوں تلے جلتے۔ خوب صورتی کی سیلف لائف بہت کم تھی۔ اس نے سر جھٹک دیا۔

"مگر..."

"کہا نا... کوئی عورت اپنے جسم سے خوش نہیں ہوتی۔ بالخصوص اگر وہ یہ سمجھتی ہو کہ وہ موٹی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کو اس کے عقیدے سے نہیں ہٹا سکتی۔ میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی سوائے اس کے کہ اس کے اہم دن پہ اس کو ویسی دکھا سکوں جیسا وہ خود کو دیکھنا چاہتی ہے۔"

وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے، دیوار سے ٹیک لگائے، خاموشی سے کھڑا اسے دیکھے گیا۔ وہ اب کیمرے پہ چہرہ جھکائے، بٹن پریس کرتی کہہ رہی تھی۔

"وہ اس وقت صرف ویڈنگ فنکشن کا سوچ رہی ہے۔ شادی کے پارے میں ساری لڑکیاں صرف فنکشن تک کا سوچتی ہیں۔ اس ایک دن کے لیے اتنا پیسہ اور توانائی صرف کرتی ہیں۔ حالانکہ شادی تو اگلے دن سے شروع ہوتی ہے۔ جب فلیش لائٹس ماند پڑتی ہیں اور میک اپ اترتے ہیں۔ پھر دن کی روشنی میں اصلی چہرے اور نقلی ہیرے صاف دکھائی دیتے ہیں۔"

اس کی آواز میں کچھ تھا۔ کچھ اداس کر دینے

والا۔

''ساری شادیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں، مالا۔''

''ہوتی ہیں۔'' ایمی نے چہرہ اٹھایا۔ اب وہاں کچھ نہ تھا۔ نہ طنز۔ نہ تلخی۔ صرف ویرانی۔ ''کیونکہ سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں، ماہر بے۔''

وہ کیمرہ لیے آگے بڑھ گئی۔ روبی اس طرف آرہی تھی۔

وہ مزید کچھ نہیں بولا۔ ان دونوں عورتوں کو سمجھانا فضول تھا۔ وہ بس خاموشی اور قدرے بے زاری سے سیڑھیوں کے دہانے پر کھڑا وہ سب دیکھتا رہا جو وہاں ہو رہا تھا۔ روبی کو اونچے زینے پر کھڑا کیے، وہ نیچے ایک سیڑھی پر بیٹھی، کیمرہ چہرے پہ لگائے، کلک کلک کر رہی تھی۔ فلیش لائٹس جل بجھ رہے تھے۔ پھر وہ روبی کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔ اب وہ اسے ننھی اسکرین پر آئے شاٹس دکھا رہی تھی۔

روشنی اور اندھیرے کا امتزاج۔ زاویوں کا کھیل۔ پوز کرنے کا ہنر۔ سب نے مل جل کے جو تصاویر تخلیق کی تھیں، ان کو دیکھ کے روبی کا چہرہ چمک اٹھا۔ حیرت۔ خوشی۔

''ابھی تھوڑی ایڈیٹنگ کے بعد یہ مزید بہتر ہو جائیں گی۔'' وہ تصویریں دکھاتے ہوئے مسکرا کے کہہ رہی تھی۔ روبی کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

''تم نے یہ کیسے کیا، مالا؟''

اس نے مسکرا کے شانے اچکا دیے۔

''کہا نا۔ میں ایک الوژنسٹ ہوں۔''

ماہر اسی طرح دیوار سے لگا کھڑا، سنجیدہ چہرے سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ذہن میں بس ایک فقرہ گردش کر رہا تھا۔

(وہ کردے گا۔ وہ میرے لیے کردے گا۔)

☆☆☆

رات وین کو در پہ سیاہ بادلوں کی چادر تانے اتری۔ جس وقت ماہر اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول رہا تھا، باہر بادل برسنا شروع ہو چکے تھے۔

وہ چابیاں ریک میں لٹکاتا، جوتے اتارنے لگا۔ پھر ننگے پیر فرش پر چلتا آگے آیا اور قدرے بے زاری سے کیمرے کا اسٹریپ گردن سے نکالا۔ بیگ پیک ایک طرف پھینکا۔ وہ نیچے جا گرا۔ ماہر نے گہری سانس لی۔ جھک کے بیگ پیک اٹھایا اور درست کر کے رکھا۔ پھر بتیاں روشن کیں۔

یہ اس کا سیاہ سفید سا اپارٹمنٹ تھا۔ اس اپارٹمنٹ سے ملتا جلتا جس میں وہ استنبول میں رہتا تھا۔ دو رنگوں کا ڈیکور۔ دنیا سے باقی سارے رنگ جیسے ختم ہو گئے تھے۔

(وہ یہ کردے گا۔ وہ میرے لیے ایسا کردے گا۔)

کھڑکیوں پر تڑاتڑ بوندیں گر رہی تھیں۔ باہر بالکونی کی ریلنگ بھی بھیگ چکی تھی۔ وہ باہر آ کھڑا ہوا اور بازو ریلنگ پر رکھ کے دور نیچے پھیلی رات دیکھنے لگا۔

(وہ کردے گا۔ وہ میرے لیے یہ کردے گا۔)

وہ الفاظ تھے یا کوئی پگھلا ہوا سیسہ۔ ماہر نے آنکھیں بند کیں۔ آسمانوں سے برستا پانی اس پر گرتا رہا۔ بال، چہرہ، ہڈی، سب بھیگتا جا رہا تھا۔ لیکن اندر لگی آگ کی صورت بجھ نہیں پا رہی تھی۔

اسے کسی سے بات کرنی تھی۔

وہ واپس اندر آیا تو گیلے پیروں کے نشان لکڑی کے فرش پر بنتے گئے۔ اس نے نم ہاتھ سے موبائل اٹھایا اور کانٹیکٹ لسٹ کھولی۔

''یاسمین؟'' فرشتے کے لفظ پہ وہ رک گیا۔ اونہوں۔ وہ یاسمین سے بات کر نہیں سکتا تھا۔ اس نے ماہر کو مالا کی زندگی میں واپس جانے اور اسے کنفیوژ کرنے سے منع کیا تھا۔ لیکن وہ کنفیوژ نہیں ہوئی تھی۔ وہ واپس اسی شخص کے پاس جا رہی تھی جس سے وہ اتنی مشکل سے پیچھا چھڑا کے نکلی تھی۔ اس وقت اس میں یاسمین کی ڈانٹ سننے کا حوصلہ نہ تھا۔

وہ کانٹیکٹ لسٹ نیچے کرتا واپس بالکونی تک آیا۔ گیلے قدموں کے نشان اس کے ساتھ باہر تک آئے۔

بیربل سے بات کرنا فضول تھا۔ وہ ان معاملات میں اچھا ہوتا تو آج سنگل نہ ہوتا۔

وہ بالکونی میں شیڈ تلے رکھی کرسی پر بیٹھا اور پیر قینچی صورت میز پر رکھ لیے۔ ٹھنڈی ہوا گیلے بالوں سے ٹکراتی رہی۔ لیکن اس وقت اسے ٹھنڈ نہیں لگ رہی تھی۔

سبرینہ؟ اونہوں۔ وہ زیاد کی سابقہ محبت تھی۔ اور وہ مالا کو ناپسند کرتی تھی بالکل ایسے جیسے مالا سبرینہ کو ناپسند کرتی تھی۔

اندھیری بالکونی میں سر جھکائے بیٹھا ماہر ایک کے بعد ایک نمبر دیکھ رہا تھا۔ موبائل کی نیلی روشنی چہرے کو چمکا رہی تھی۔

وہ کس سے بات کرے جو اس کی بات سمجھ سکے؟ اسے نہیں چاہیے تھی ہلال کے لیے اس کی قربانی۔ اسے زیاد سلطان سے ایسی کوئی ڈیل نہیں کرنی تھی۔

وہ کس سے بات کرے جو اس کو الزام نہ دے؟ بلکہ اس کو مسئلے کا حل بتائے۔ وہ جو اس کو جج نہ کرے۔ وہ جس پہ اسے یہ بھروسہ ہو کہ وہ اس کے لیے وہ کرے گا جو وہ چاہتا ہو؟

ایک نمبر پر اس کا انگوٹھا ٹھہر گیا۔

صرف ایک شخص تھا جس کے پاس وہ تب جاتا تھا جب سارے دروازے بند ہو جاتے تھے۔

اس نے کال کا بٹن دبایا۔

یہ طے تھا کہ چاہے اسے پسند ہو یا نہ ہو، لیکن ماہر فرید کو ہمیشہ اسی کے پاس واپس جانا پڑتا تھا۔

"ہیلو؟" عبدالمالک فرید کی سرد، بے تاثر سی آواز اسپیکر پہ سنائی دی۔

"مجھے تمہاری مدد چاہیے۔"

"میں سن رہا ہوں۔"

اس نے گیلے بال انگلیوں سے پیچھے کیے۔ پہلو بدلا۔ یہ ہمیشہ مشکل ہوتا تھا۔

"میں نے مالا سے کہا تھا وہ ہلال کو ڈھونڈنے میں میری مدد کرے۔"

وہ خاموشی سے سنے گئے۔

"زیاد جانتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔ مجھے لگا شاید وہ زیاد سے پوچھ سکے یا..." وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بالکونی کے سرے پر شیڈ ختم ہوتا تھا اور وہاں بارش کا پانی تڑتڑ برس رہا تھا۔ وہ پانی اور خشکی کی سرحد پہ آن رکا۔

"پھر؟"

"پھر آج اس نے کہا کہ زیاد ہلال کو واپس کر دے گا۔"

"کیوں؟"

"اس کے لیے۔ مالا کو واپس حاصل کرنے کے لیے۔" وہ ایک ہتھیلی پھیلا کے ریلنگ تک لے گیا۔ پانی کی بوچھاڑ ہتھیلی سے ٹکرائی۔ تڑتڑ۔ جیسے گولیاں سی برس رہی ہوں۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"مجھے اس کی قربانی نہیں چاہیے۔ ایک زندگی کو بچانے کے لیے دوسری برباد نہیں کرنی۔ وہ ایک حیوان ہے۔ وہ اس کے پاس واپس چلی گئی تو وہ اسے مار دے گا۔"

"یہ بات تم نے اس سے کہی؟"

"اس نے کبھی میری بات مانی ہے؟"

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"وہ ایک دفعہ پھر اپنی زندگی خراب کر لے گی۔ وہ دوبارہ اس سے پیچھا کیسے چھڑا..."

"تم کیا چاہتے ہو؟" انہوں نے تم پہ زور دیا۔

ماہر نے گہری سانس لی۔ ہتھیلی واپس کھینچ لی۔ ٹھنڈی ہوا سے گیلے بال اور لباس سوکھنے لگے تھے۔

"میں زیاد سے ملنا چاہتا ہوں۔ لیکن وہ مجھے اس سے ملنے نہیں دینا چاہتی۔"

"تمہیں اس کی اجازت چاہیے؟"

"نہیں۔ اسی لیے تمہیں کال کر رہا ہوں۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"تم مجھے زیاد سلطان کو ڈھونڈ کے دو گے۔ اس کی ماں وین کوور میں کسی ہسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ وہ اس سے ملنے آتا ہوگا۔ مجھے اس ہسپتال کا نام وغیرہ

معلوم کردو۔ آگے میں اسے ڈھونڈ لوں گا۔"

"شیور۔" بلا تامل کہہ کے مالک فرید نے کال کاٹ دی۔

ماہر نے گہری سانس لے چہرہ اٹھایا۔ ریلنگ کے پار سیاہ رات اسی طرح بھیگ رہی تھی۔ بالآخر اس کے جلتے دل پہ بوچھاڑ کرنے لگی تھی۔

☆☆☆

اس صبح مالا کی آنکھ فون کی تیز گھنٹی سے کھلی تھی۔ اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔

وہ کہاں تھی؟

پلکیں جھپکائیں۔ منظر واضح ہوا۔

وہ اپنے اسٹوڈیو اپارٹمنٹ کے کمرے میں تھی۔ کل شادی کا ایونٹ کور کرنے کے بعد تھکاوٹ ایسی ہوئی تھی کہ رات وہ گھر آ کے سوئی تو اٹھ نہ سکی۔ اسے آج اٹھنا بھی نہیں تھا۔ آج کے دن کے لیے اس نے جے پی سے ویسے بھی آف لے رکھا تھا۔

بدقت کہنیوں کے بل اٹھی اور فون دیکھا۔ کون صبح صبح کال کر رہا تھا؟

روبی۔ چار مسڈ کالز۔

اس کو اب کیا مسئلہ ہے؟ اس نے فون پرے ڈال دیا اور کروٹ بدل دی۔ آنکھیں بند کر کے پھر سے سونے کی کوشش کی۔ روبی کو یقیناً تمام تصاویر چاہیے تھیں۔ لیکن وہ پیسے لیے بنا نہیں دے سکتی تھی۔ ابھی تو ایڈیٹنگ بھی کرنی تھی۔ اف۔ لیکن وہ مطمئن تھی۔

روبی کی تصاویر بہت اچھی آئی تھیں۔ روبی اتنی خوش ہوئی تھی کہ اس نے چند تصاویر فوراً مالا سے واٹس ایپ کروالی تھیں۔ اس نے انہیں پوسٹ کرنا تھا۔ روبی کا دھیان سارا وقت تصاویر پہ لگا رہا تھا۔ خیر اسے کیا۔ لیکن ایسے جاگ جانا چاہیے۔ روبی نے ایسا ادائیگی کرنی تھی۔ اور وہ پیسے اس کے لیے بہت قیمتی تھے۔

وہ سست روی سے اٹھ بیٹھی۔ فون کھول کے سب سے پہلے زیادہ کا میسج چیک کیا۔ کوئی پیغام نہیں۔

"تم نے میری آفر کے بارے میں کیا سوچا؟" الفاظ ٹائپ کر کے بھیجے۔ پھر جمائی روکتے ہوئے روبی کو کال ملائی۔

"مالا..." اس نے پہلی گھنٹی پہ فون اٹھا لیا۔ اس کی آواز قدرے بدلی ہوئی تھی۔

"ہیلو روبی۔ میں سو رہی تھی جب..."

"تم نے میرے ساتھ کیا کیا؟"

وہ اتنی زور سے چلائی تھی کہ الفاظ اس کے منہ میں رہ گئے۔ ساری نیند آنکھوں سے بھک سے اڑ گئی۔ وہ تیزی سے اٹھ بیٹھی۔

"کیا ہوا؟"

"تم نے ساری دنیا میں میرا تماشہ بنا دیا۔" وہ چلاتے ہوئے رو رہی تھی۔

وہ جیسے بالکل گنگ رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

دماغ نے اس سب کو پروسیس کرنے کی کوشش کی۔

رات تک روبی ٹھیک تھی۔ سب اچھا ہوا تھا۔ روبی نے کئی دفعہ اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔

"تم نے مجھے ایک مذاق بنا دیا۔" روبی دھاڑیں مار کے رو رہی تھی۔ "ساری دنیا مجھ پہ ہنس رہی ہے۔"

"روبی کام ڈاؤن۔ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے۔"

"وہ دیکھو جو میں نے بھیجا ہے۔" وہ زور سے چلائی۔

مالا نے تیزی سے فون نیچے کیا۔ ان باکس کھولتے ہوئے اس کی انگلیاں کپکپا رہی تھیں۔

روبی کی واٹس ایپ چیٹ میں بہت سے پیغامات آئے رکھے تھے۔ اپر کیس لیٹرز میں لکھے پیغامات۔

مجھے کال کرو۔

ارجنٹ۔

واٹ از دس، مالا؟

نیچے چند لنکس تھے۔

اسے وہ سب دیکھنے اور سمجھنے میں چند منٹ لگے۔

گزشتہ رات روبی نے مالا کی کھینچی تصویریں جاتے کے ساتھ ہی اپنے انسٹاگرام پہ پوسٹ کردی تھیں۔اس کے دوستوں اور رشتے داروں نے تصاویر کے نیچے بہت اچھے کمنٹس دیے تھے۔البتہ فنکشن میں آئے ایک مہمان نے جس کے ٹک ٹاک اکاؤنٹ پہ چند ہزار فالوورز تھے، روبی کی چند تصاویر کھینچی تھیں۔ سامنے سے لی گئیں فون کیمرا کی تصاویر۔ان تصاویر میں روبی موٹی دکھائی دیتی تھی۔ایسے کہ اس کی ڈبل ٹھوڑی واضح تھی۔پھر اس شخص نے اپنی کھینچی تصاویر اور مالا کی پروفیشنل کیمرے سے لی گئی تصاویر (جو روبی نے پوسٹ کی تھیں) کو ساتھ ساتھ جوڑ کے ٹک ٹاک پہ ایک ویڈیو ڈالی تھی۔

اس ویڈیو پہ لکھی عبارت کچھ یوں تھی۔

فوٹو گرافرز کا کمال۔وہ کسی کو کچھ بھی دکھا سکتے ہیں۔

ایک طرف مالا کی کھینچی تصویر تھی۔روبی سفید گاؤن میں کھڑی پیچھے مڑ کے دیکھ رہی تھی۔پوزنگ کا کمال تھا اور روشنی اندھیرے کے امتزاج کا۔اس کا جسم اور چہرہ پتلا لگ رہا تھا۔

دوسری جانب سامنے سے لی گئی تصویر تھی جس میں روبی مسکرا بھی نہیں رہی تھی۔اس کا ریسٹنگ فیس قدرے جھنجھلایا ہوا لگ رہا تھا۔فربہ جسم۔ڈبل ٹھوڑی۔پھولے گال۔مگر وہی لباس اور جیولری۔

یہ ویڈیو تین گھنٹے پہلے پوسٹ ہوئی تھی۔اور اس کو اب تک...مالا نے پلکیں جھپکائیں...دو ملین لوگ دیکھ چکے تھے۔اس کا دل ڈوبنے لگا۔

اس ویڈیو کے کمنٹ سیکشن میں سب اس موٹی لڑکی کو برا بھلا کہہ رہے تھے جو اپنے جسم سے خوش نہیں تھی اور یقیناً اس نے فوٹو گرافر کو خود کو پتلا دکھانے کے لیے کہا تھا۔لوگ اس کو بیوٹی اینڈ دی بیسٹ جیسے القابات دے رہے تھے۔اور سب سے زیادہ وہ اس فوٹو گرافر کو گالیاں دے رہے تھے، جس نے کسی دلہن کی اِن سیکیورٹی کو استعمال کیا تھا۔

وہ کتنی ہی دیر وہیں بیٹھی رہی۔چہرہ زرد پڑ رہا تھا۔سوشل میڈیا کی نفرت برداشت کرنا آسان نہیں تھا۔

کل جب روبی کی تصاویر اچھی آئی تھیں، تو اس کے دل نے خواہش کی تھی کہ کیا معلوم اس کا کام روبی کے دوستوں میں سے کسی کو پسند آئے اور وہ اس کو اپنے کسی ایونٹ کے لیے ہائر کرلیں۔یوں یہ اس کی ایک سائیڈ جاب بن سکتی تھی۔اس ملک میں گزارا کرنے کے لیے اسے ایک دوسری جاب چاہیے تھی۔

لیکن یہ اتنا بھیانک نتیجہ...اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ یہ سب ہوگا۔

ایک بات طے تھی۔یہ مالا کی زندگی کا پہلا اور آخری فوٹو شوٹ تھا۔

''روبی میری بات سنو...''

اس نے کال ملائی لیکن وہ کچھ سننے پہ تیار نہیں تھی۔

''تم نے مجھے غلط گائیڈ کیا۔تم نے مجھے وہ دکھایا جو میں نہیں ہوں۔'' وہ رو رہی تھی۔

''روبی، میں نے وہی کیا جو تم نے کہا تھا۔''

''تم نے میرا تماشہ بنا دیا۔میں موٹی ہوں۔تم نے میری اِن سیکیورٹی کے ساتھ کھیلا۔دوبارہ مجھے کال مت کرنا۔''

اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔وہ کہنا چاہتی تھی کہ میرے پیسے؟ لیکن اب کوئی بھی شے روبی کو اس کی بات سننے پہ مجبور نہیں کرسکتی تھی۔

اس نے دھیرے سے فون رکھا۔

یہ زیادہ سلطان نے نہیں کیا تھا۔یہ دنیا والوں نے کیا تھا۔

اس نے کرب سے آنکھیں بند کیں۔سر میں بے انتہا درد اٹھنے لگا تھا۔

وہ کتنی دیر میٹرس پر بیٹھی رہی۔ہلی نہیں۔منہ بھی نہیں دھویا۔پردے نہیں ہٹائے۔دن کی روشنی کو اندر

نہیں داخل ہونے دیا۔اس کی روم میٹ وہاں نہیں تھی۔نہ جانے کہاں تھی۔اسے پرواہ نہیں تھی۔

وہ گم صم سی گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھی رہی۔نگاہیں دیوار پر مرکوز تھیں۔

اور تب ہی فون بجنے لگا۔وہ جانتی تھی کس کی کال ہوگی۔

''تمہاری کلائنٹ وائرل ہوگئی ہے۔تم نے دیکھا؟'' وہ محظوظ سا کہہ رہا تھا۔

''دیکھ چکی ہوں۔پھر کیا کروں؟'' اس کی آواز گیلی تھی۔بے اختیار گالوں کو چھوا۔گرم قطرے۔

''تم رو رہی ہو؟'' ماہر چونکا۔

اس نے جواب نہیں دیا۔ہاتھ کی پشت سے گال رگڑے۔

وہ بھی چند لمحے کے لیے خاموش ہوگیا۔

''اس نے مجھے کال کی۔وہ رو رہی تھی۔میں نے اس کا دن برباد کردیا۔''

''اور اس نے تمہارا۔''

''تم اندر سے خوش ہو رہے ہوگے۔تمہیں وہ سب پسند نہیں آیا تھا۔''

وہ دھیرے سے ہنس دیا۔وہ فون کان سے لگائے، اپنے سفید کچن میں کھڑا، گرائنڈر میں کافی بینز ڈال رہا تھا۔

''اگر یہ تمہارا بزنس ماڈل ہے تو مجھے اس پہ اعتراض کرنے کا حق نہیں۔وہ صرف میری رائے تھی۔''

''لیکن میں نے اس کو ایک میم بنا دیا۔'' اس نے آنکھیں بند کرکے کنپٹی مسلی۔سر درد سے پھٹ رہا تھا۔

''میری فیلڈ میں کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کانٹریکٹ کرنے کے بعد میں کلائنٹ کی ڈیمانڈ کے مطابق ڈیزائن بناتا ہوں۔'' وہ سر جھکائے کافی مشین کو دیکھ رہا تھا جس سے نکلتی بھوری دھواں دار دھار کپ میں گر رہی تھی۔

''لیکن کلائنٹ تب تک اپنا ذہن بدل چکا ہوتا ہے۔اسے وہ ڈیزائن پسند نہیں آتا۔''

''پھر تم کیا کرتے ہو؟''

''میں وہی کرتا ہوں جو مجھے میرے باپ نے سکھایا تھا۔وہ ایک چیز جو ایک اچھا بزنس مین بننے کے لیے چاہیے ہوتی ہے۔''

وہ خاموشی سے سنے گئی۔

''بے حسی اور شیم لیس نیس۔میں بے حس ہو کے بہت بے شرمی سے کلائنٹ سے اپنے پیسے مانگتا ہوں۔میرا کلائنٹ دوسروں کے سامنے شرمندہ ہو یا اپنی ترجیحات بدل لے، یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔اگر میں نے وہی کیا ہے جو اس نے مانگا تھا، تو اس کو میری رقم ادا کرنی ہے۔''

وہ کچھ نہیں بولی۔

''اگر تمہیں اس دنیا میں پیسے کمانے ہیں تو تمہیں بے حس بن کے اپنا پیسہ وصول کرنا ہے۔لحاظ اور مروت میں رہنے والوں کو ہر فیلڈ میں خسارے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔کیا تم سن رہی ہو؟'' اس نے فون کان سے ہٹایا۔کپ اٹھانے اور دودھ ڈالنے کی کھٹر پٹر میں وہ سن نہیں سکا کہ وہ کب کی کال کاٹ چکی تھی۔

☆☆☆

صبح ابھی دوپہر میں نہیں ڈھلی تھی جب روبی کے گھر کے دروازے پہ وہ آن کھڑی ہوئی تھی۔زور سے گھنٹی پر انگلی رکھی اور پھر نہیں ہٹائی۔یہاں تک کہ دروازہ کھلا اور ایک فربہ عورت دکھائی دی۔

''تم؟'' ناپسندیدگی سے اسے دیکھنے والی روبی کی ماں تھی۔

''روبی کو بلائیں۔مجھے اس سے بات کرنی ہے۔'' رک کے اضافہ کیا۔''میں جانتی ہوں وہ ہنی مون پہ دو دن بعد جا رہی ہے۔'' وہ انہیں کسی بہانے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

خاتون گھورتے ہوئے ایک طرف ہٹ گئیں۔

وہ تیز قدموں سے ان کے پیچھے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔لمبا ٹرنچ کوٹ پہنے، بال کیچر میں باندھے، کراس باڈی بیگ ایک کندھے پر لٹکائے، وہ گردن

دائیں بائیں گھما کے اسے تلاش کرنے لگی۔ اور پھر وہ اسے دکھائی دے گئی۔

اوپر ایک اجلا اجلا سفید سا لونگ روم تھا۔ بڑے صوفے پر روبی بیٹھی تھی۔ نائٹ سوٹ میں ملبوس۔ چہرہ سرخ گلابی تھا۔ گود میں آئس کریم کا بول رکھا تھا۔ میز پر بہت سے تحفے رکھے تھے۔ کچھ کھلے تھے۔ کچھ ابھی تک پیک شدہ تھے۔ روبی نے آہٹ پہ گردن موڑی۔ اسے دیکھ کے ماتھے پر بل پڑے۔ چمچہ پیالے میں پٹخ کے وہ تیزی سے کھڑی ہوئی۔

"تم!"

"مجھے اپنی پے منٹ چاہیے، روبی۔"

وہ اس کے عین سامنے آ کھڑی ہوئی اور سینے پر بازو لپیٹ لیے۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ سپاٹ۔ بے حس۔

"تم اب مجھ سے پے منٹ مانگ رہی ہو؟ اور وہ جو تم نے میرے ساتھ کیا؟"

"میری بات غور سے سنو۔ تم نے اور میں نے ایک کانٹریکٹ کیا تھا۔ تم نے مجھ سے جو ڈیمانڈ کیا تھا، وہ میں نے پورا کیا۔ تم نے کہا تھا تم موٹی ہو اور پتلی لگنا چاہتی ہو۔ کیا تم نے نہیں کہا تھا؟"

اس کی آواز پرسکون تھی۔ لیکن بلند تھی۔ روبی لب بھینچے گہرے سانس لیتی اسے گھورے گئی۔

"میرا کیمرہ ہر وقت آن تھا۔ میرے پاس تمہارے ان الفاظ کی ریکارڈنگز موجود ہیں۔ میرا سیکنڈ فوٹو گرافر گواہ ہے۔ تمہاری ماں گواہ ہے۔ اگر تم نے مجھے ادائیگی نہ کی تو میں وہی کروں گی جو مجھے کرنا چاہیے۔"

"مثلاً؟"

"میں تنگ آ گئی ہوں اس شہر کے لوگوں سے یہ سنتے سنتے کہ وہ مجھے عدالت میں لے جا سکتے ہیں۔ اس دفعہ عدالت میں جانے کی باری میری ہے۔" ایک انگلی سے سینے پر دستک دی۔

روبی کی ماں اس کے کندھے کے برابر آ کھڑی ہوئی۔ اب وہ دونوں اسے ایک ہی جیسی نظروں سے گھور رہی تھیں۔

"تمہارے ساتھ جو ہوا، وہ تمہارے اس مہمان نے کیا۔ اگر تمہیں کسی کو سو (مقدمہ) کرنا ہے تو اس کو کرو۔ میں نے وہی کیا جو تم نے کہا تھا۔" بولتے بولتے سانس پھولنے لگا۔ آنکھیں بھیگنے لگیں۔ شاید وہ ماہر فرید جیسی بے حس نہیں ہو سکتی تھی۔

(ابھی نہیں رونا، مالا۔ گھر جا کے رولیں گے۔ ابھی خود کو بے حس رکھنا ہے۔)

"مجھے میرے پیسے چاہئیں۔ میری زندگی میں پہلے ہی بہت مسائل ہیں۔ اگر تم نے مجھے میرے پیسے ادا نہ کیے تو میرے اندر ابلتا سارا لاوا تم پہ آ گرے گا، روبی۔ میں یہاں سے سیدھی اپنے وکیل کے پاس جاؤں گی۔"

(ابھی نہیں رونا، مالا۔)

پھر اس نے چہرہ اس کی ماں کی طرف موڑا۔

"میرے پاس اس شہر میں کام کرنے کا ورک پرمٹ ہے۔ اور مجھے اپنے حقوق معلوم ہیں۔ اپنی بیٹی سے کہیں میری رقم ادا کر دے۔" وہ ان کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ دل اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ وہ وکیل افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن اسے رونا نہیں تھا۔ اس کو خود کو بے حس دکھانا تھا۔ ایک اور الوژن ہی سہی۔

روبی کی ماں چپ چاپ وہاں سے چلی گئی۔ چند لمحے بعد وہ واپس آتی دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پھولا ہوا لفافہ تھا۔

بہت سے آنسو اس کے حلق میں جمع ہونے لگے۔ لیکن اسے ابھی نہیں رونا تھا۔

"تمہیں صرف اپنے پیسے چاہیے تھے۔ کتنی بے حس ہو تم۔" روبی بھیگی گلہ آمیز آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"طلاق لینے والی عورت کو بے حس بننا پڑتا ہے۔" اس نے لفافہ زور سے تھاما اور ٹھک ٹھک سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔ آنسو بالآخر آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔ لیکن اب روبی اس کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔

یہ رقم اس رقم سے کافی کم تھی جو اسے جے پی کو ادا کرنی تھی۔ لیکن کچھ نہ ہونے سے ہونا بہتر تھا۔ ابھی اس کے پاس چند دن تھے۔ وہ کوئی نہ کوئی حل نکال لے گی۔ مالا ہمیشہ راستہ ڈھونڈ لیتی تھی۔

☆☆☆

وہ سیدھی گھر نہیں گئی۔

فون رکھ کے وہ باتھ روم تک آئی۔ کافی دیر چہرے پر گیلے چھینٹے مارتی رہی۔ کچھ پانی پیروں پر بھی گر گیا۔ پھر اس نے اپنا چہرہ دیکھا۔ گلابی رویا رویا چہرہ۔ اس نے برش اٹھایا اور کھینچ کھینچ کے بالوں میں چلانے لگی۔ بہت سا غصہ اور حارحیت اندر سے نکل کے ہاتھوں میں منتقل ہوگئی تھی۔ کس کے اونچی پونی بنائی، پیر ٹاول سے چہرہ تھپتھپایا اور گیلے پیروں سے چلتی کمرے میں واپس آئی۔

اسے معلوم تھا اسے کیا کرنا ہے۔

وہ تھک گئی تھی ڈرتے ڈرتے۔ انسانوں سے۔ جنات سے۔ لوگوں کی باتوں سے۔ پیسے کے پیچھے بھاگنے سے۔ اس شہر کی عدالتوں سے۔

اس نے کھڑکی کھولی اور اس کے عین سامنے کرسی رکھ کے بیٹھ گئی۔ ایسے کہ سورج کی روشنی اس کے چہرے پہ پڑ رہی تھی۔ رینٹ والا کیمرہ واپس کردیا تھا۔ سو موبائل کیمرہ سیٹ کیا۔ بنا کوئی فلٹر لگائے، مالا نے ریکارڈنگ آن کی۔ وہ تھک چکی تھی اپنے ہر عمل پہ فلٹر لگا لگا کے۔ اب فلٹر اتارنے کا وقت تھا۔

"میرا نام کشمالہ مبین ہے۔ اور میں ایک الوژنسٹ ہوں۔"

کیمرے کی اسکرین پر اس کا چہرہ روشنی میں سنہری گلابی سیاہ دکھائی دے رہا تھا اور سبز آنکھیں کنچوں جیسی لگ رہی تھیں۔

"میں وہ فوٹو گرافر ہوں جس نے روبی کا فوٹو شوٹ کیا تھا۔ وہ فوٹو گرافر جس کو سب برا بھلا کہہ رہے ہیں، وہ میں ہوں۔"

اس کی آنکھیں خشک تھیں اور چہرہ سپاٹ۔

"میں ویڈنگ فوٹو گرافر نہیں ہوں۔ الوژن بناتی ہوں اور میری کلائنٹ نے مجھے ایک الوژن تخلیق کرنے کے لیے کہا تھا۔ وہ اپنی شادی کی تصاویر میں پتلی دکھنا چاہتی تھی۔ میں نے وہی کیا جو میک اپ آرٹسٹ اور کاسمیٹک سرجن کرتے ہیں۔ وہ عورتوں اور مردوں کی ان سیکیورٹیز کے ساتھ کھیل کے ان کو ویسا دکھا دیتے ہیں جیسا وہ دکھنا چاہتے ہیں۔"

وہ اسکرین پہ موجود اپنے عکس کو دیکھ رہی تھی۔ حلقے۔ دانے۔ زرد رنگت۔ کسی ہیرے سے خالی کان اور گردن۔

"کیا میں نے کچھ غلط کیا؟ نہیں۔ میں نے وہ کیا جو اس نے مانگا تھا۔ میں نے اس کا وہ عیب چھپایا جو اس کو عیب لگتا تھا۔ میری نظر میں تمام عورتیں خوب صورت ہیں۔ لیکن آپ کی نظر میں نہیں ہیں۔ آپ لوگ..." اس نے انگلی سے اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ "آپ لوگ ہیں جنہوں نے خوب صورتی کے معیار کا تعین کیا ہے۔ آپ کو میرے جیسے ایکنی سے بھرے چہرے خوب صورت نہیں لگتے۔ آپ کو پھنکی ناک، چھوٹے قد، سیاہ رنگت، موٹے جسم اور چھوٹی آنکھیں خوب صورت نہیں لگتیں۔"

اس نے سوچا تھا وہ نہیں روئے گی۔ لیکن آنکھیں پھر سے بھیگنے لگیں۔

"آپ کی نظروں میں خوب صورت لگنے کے لیے عورتیں کاسمیٹک سرجنز کے پاس جاتی ہیں اور جو نہیں جاسکتیں، وہ میرے جیسے لوگوں کے پاس آکے عارضی حل تلاش کرتی ہیں۔ آپ ہیں وہ کلپرٹ جو کی بورڈ کے پیچھے چھپ کے انسانوں کے چہروں کا مذاق اڑاتے ہیں۔" آواز رندھ گئی۔ ایک آنسو ٹپ سے گرا اور گال پر لڑھک گیا۔

"میرے اوپر الزام ڈالنے سے پہلے اپنے اندر جھانکیں۔ آپ لوگ دوسری عورتوں کو ان سیکیورٹیز کرتے ہیں۔ روبی کے جسم کا مذاق میں نے نہیں، آپ نے بنایا تھا۔ میں نے اس کو خوب صورت دکھایا تھا۔ آپ نے اس کے نام رکھے۔ آپ نے اس کو ہرٹ

کیا۔ اگر کوئی اس سب کا ذمہ دار ہے تو وہ آپ لوگ ہیں۔"

اس کے گال تمتما رہے تھے اور آنسوؤں میں غصہ گھل گیا تھا۔

"مجھے اپنے کیے پہ کوئی شرمندگی نہیں ہے۔ میرے اوپر کوئی ڈیبٹ شروع کرنے سے پہلے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھیں۔ روبی نے یہ سب آپ کے کمنٹس سے بچنے کے لیے کیا تھا۔ تاکہ کوئی اسے یہ نہ کہہ سکے کہ وہ شادی سے پہلے وزن کیوں نہیں کم کر سکی۔ رہی میں..." اس نے ہتھیلی کی پشت سے گال رگڑا۔

"میں ایک آرٹسٹ ہوں۔ میں وہی الوژن تخلیق کروں گی جو میرا کلائنٹ مجھ سے ڈیمانڈ کرے گا۔ روبی جیسی دس لڑکیاں مجھے کہیں کہ وہ کچھ اور دکھنا چاہتی ہیں، تو میں ان کی بات مانوں گی۔ یہ ان کی چوائس ہے۔ سو اگر آپ نے کسی کا مذاق اڑانا ہے تو آپ لوگ خود اپنا مذاق اڑائیں۔ آپ لوگ جو خود اپنی تصویریں فلٹر لگائے بنا پوسٹ نہیں کرتے۔ میرے لیے تمام انسان خوب صورت ہیں۔ سوائے آپ لوگوں کے جو دوسروں کے جسم کے عیوب تلاش کرتے ہیں۔"

اس نے بازو لمبا کیا۔ بٹن دبایا۔ ویڈیو بند ہوگئی۔

وہ موبائل ہاتھ میں لیے چند بٹن دباتی گئی۔ آنسو ٹپ ٹپ اسکرین پر گرتے گئے۔ اس نے اپنے اکاؤنٹ سے اس ویڈیو کو روبی کی وائرل ویڈیو سے جوڑا اور پوسٹ کر دیا۔ اب اس وائرل ویڈیو کو دیکھنے والے اس کی ویڈیو بھی دیکھ سکیں گے۔

پھر اس نے آنکھیں بند کیں۔ تین گہرے سانس لیے۔

میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ مالا کو اب کسی فلٹر کی ضرورت نہیں ہے۔

موبائل کی ٹون پہ وہ چونکی۔ اسکرین روشن کی۔ زیاد سلطان کا میسج موصول ہوا تھا۔

"میں تمہاری آفر قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

دل نے بے اختیار ایک دھڑکن مس کی۔

☆☆☆

بیسمنٹ ہمیشہ کی طرح نیم تاریک تھی۔ لکڑی کا فرش۔ کھلا کمرہ۔ جتنا گھر اوپر تھا اتنا ہی نیچے تھا بس دیواریں اور دروازے نہ تھے۔ جیسے ایک طویل ہال ہو۔ ایک کونے میں ٹوائلٹ تھا۔ اور دوسرے میں کچن جو کاٹھ کباڑ سے بھرا تھا۔

ایک لکڑی کے ستون کے ساتھ وہ بیٹھی تھی۔ سر جھکائے، کاپی گھٹنوں پر رکھے وہ کاغذ پر رنگ بھر رہی تھی۔ گھنگریالے بال اس خاکے کو چھو رہے تھے جو کاغذ پہ بنا دکھائی دیتا تھا۔

ہلال کے اوپر چھت پہ کوئی چل رہا تھا۔ ہر قدم کے ساتھ نیچے دھمک سنائی دیتی۔ ایسی اونچی دھمک کہ لگتا چھت ابھی گرنے کو ہے۔ قدموں کی آواز بیسمنٹ کی سیڑھیوں کے دہانے تک آ رکی۔ پھر چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھلا۔

سیڑھیوں کے اوپر سے روشنی دکھائی دی۔ لمحے بھر کو بیسمنٹ روشن ہوگئی۔

وہ اندر داخل ہوا۔ اور دروازہ بند کر دیا۔ روشنی کا راستہ رک گیا۔ اب بیسمنٹ میں صرف اس ایک بلب کی روشنی تھی۔

پھر قدم نیچے اترنے لگے۔ دھپ۔ دھپ۔ دھپ۔ ہر قدم کے ساتھ لکڑی چیخنے کی آواز آئی۔

ہلال نے سر نہیں اٹھایا۔ اسی سکون سے صفحے پر پنسل رگڑتی گئی۔

"جانتی ہو، میں نے ہمیشہ تمہیں کیا سمجھا تھا؟"

وہ قدم قدم چلتا اس کے قریب آیا۔ سیاہ پینٹ شرٹ پہنے، وہ الجھے الجھے بال لیے کھڑا تھا۔

ہلال گردن ترچھی کیے، آنکھیں اس کاغذ پہ جمائے ہوئے تھی۔

"ایک لائبیلٹی"۔ زیاد اسی ستون کے دوسری طرف اکڑوں بیٹھ گیا اور ستون سے ٹیک لگا لی۔ اب

اس کی ہلال کی طرف پشت تھی۔

"تم میرے لیے ہمیشہ سے ایک بوجھ تھیں۔" زیاد نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دوا کی ننھی ڈبیا نکالی۔

"ایک ایسا بوجھ جس کو میری ماں ساتھ لیے پھرتی تھی۔"

اس نے پیلی ڈبیا کو اونچا اٹھا کے دیکھا۔ شفاف پلاسٹک کے پار سفید گولیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

"اس بوجھ کے لیے مجھے ہمیشہ راستے کلیئر کرنے پڑتے تھے۔ پاسپورٹس، ویزے، امیگریشن۔ کیسے کیسے ہم تمہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے تھے۔ اف۔"

اس نے ڈبیا کو اوپر نیچے ہلایا۔ گولیوں سے چھن چھن کی آواز آئی۔

"میں سوچتا تھا کہ تمہیں اس روز مر جانا چاہیے تھا۔ جب میں نے تمہیں چھت سے نیچے پھینکا تھا۔"

ہلال نے جواب نہیں دیا۔ وہ گردن ترچھی کیے، ہنوز کاغذ میں رنگ بھر رہی تھی۔

"لیکن تم بچ گئیں۔ تم بہت ڈھیٹ تھیں۔"

اس نے "ٹک" کی آواز کے ساتھ ڈھکن کھولا۔

"میں نے کئی موقعوں پہ تمہیں مارنے کا سوچا۔ تم میری ماں کا جنون تھیں۔ مگر میں جانتا تھا کہ جو وہ تم سے چاہتی ہیں، وہ کبھی نہیں ہو سکے گا۔"

اس نے ڈبی ہتھیلی پر انڈیلی۔ بہت سی گولیاں باہر آ گئیں۔ اس نے انگوٹھے سے تین گولیاں دبائیں، اور باقی واپس ڈبی میں گرا دیں۔

"لیکن آج پہلی دفعہ مجھے تمہارا کوئی استعمال دکھائی دیا ہے۔"

زیاد نے بنا پانی کے گولیوں کو منہ میں رکھا، پھر آنکھیں بند کر کے ان کو نگل گیا۔ پھر ہلکا سا مسکرا کے گردن موڑی۔ وہ اسی طرح رنگ بھر رہی تھی۔

"ہم اس راستے کے اختتام پہ آن پہنچے ہیں، ہلال۔ تمہاری قید ختم ہونے والی ہے۔"

وہ مسکرا رہا تھا۔

"آئی نو" اس کی آواز سرگوشی کی مانند تھی۔

"میں تمہیں مالا کے بدلے تمہارے بھائی کے حوالے کر رہا ہوں۔" وہ غور سے اس کا جھکا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

ہلال کا قلم رکا۔ لیکن چہرہ نہیں اٹھایا۔

"آئی نو" وہ دوبارہ قلم چلانے لگی۔

وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ ایک سرد سی لہر ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ کچھ تھا اس لڑکی میں جو خوف زدہ کرتا تھا۔ اس نے اس کی ایک کلائی کو دیکھا جس میں ہتھکڑی بندھی تھی۔ پھر نگاہ اس کی کاپی تک گئی۔ زیاد نے چہرہ آگے کر کے کاغذ پہ جھانکا۔

وہ ایک لکڑی کا کمرہ بنا رہی تھی۔ ایک کونے میں ایک گھنگریالے بالوں والی ننھی لڑکی بیٹھی تھی جس کا چہرہ جھکا تھا۔ اور اس کے ساتھ ایک آدمی بیٹھا تھا۔ اس سے رخ موڑے۔ ستون کے دوسری طرف۔ آدمی کا لباس سیاہ تھا اور... اس کا چہرہ بھیڑیے کے جیسا تھا۔

زیاد نے ایک دم کاپی اس کے ہاتھ سے جھپٹی۔ ہلال کو جھٹکا لگا۔ ہاتھ ہوا میں اٹھا دیے۔ پنسل کی نوک اس کی انگلی پر لگ گئی۔ لیکن زیاد سلطان نے نہیں دیکھا۔ اس نے کاپی کا صفحہ پھاڑا اور اس کے دو، پھر چار، پھر آٹھ ٹکڑے کر کے انہیں فضا میں اچھال دیا۔

"میری اسکیچ بک واپس کرو۔" وہ اس کی جانب آنکھیں اٹھا کے غرائی۔ مٹھیاں بھنچ لیں۔ چہرہ سرخ ہوا۔

زیاد سلطان اٹھا، اور اسکیچ بک دور اچھال دی۔ وہ ہال کے دوسرے کنارے پر جا گری۔

"جاؤ۔ اٹھا لو۔" اس نے طنز سے ایک نظر ہلال کی ہتھکڑی پہ ڈالی اور اس سے بندھی زنجیر پہ۔ وہ تین میٹر لمبی تھی۔ کیونکہ ٹوائلٹ دو میٹر دور تھا۔ اس سے آگے تک وہ نہیں جا سکتی تھی۔

وہ دھپ دھپ اوپر چڑھتا گیا اور وہ مٹھیاں بھنچے وہیں بیٹھی رہ گئی۔ گرم گرم آنسو گالوں پر لڑھکنے لگے۔

"ماہر بھائی۔" اس کے لبوں سے بے بس سی کراہ نکلی تھی۔

☆☆☆

چند میل دور مالا کی کافی شاپ میں کونے والی کرسی میز پر بیٹھے ماہر فرید کے سینے میں درد کی ہوک اٹھی تھی۔

وہ لیپ ٹاپ سامنے رکھے، ائیر پوڈز کانوں میں گھسائے، ہاتھ ہلاتے ہوئے اسکرین پہ نظر آتے اشخاص کو کچھ سمجھا رہا تھا۔ چند کاغذ اور گرافٹ ٹیب سامنے رکھا تھا۔ ماتھے پر بل تھے۔ چہرے پہ جھنجھلاہٹ تھی۔ سیاہ ہڈی پہنے، جس کی ٹوپی پیچھے کو گری تھی، بکھرے بالوں اور بڑھی شیو کے ساتھ، وہ قدرے الجھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

اور اسی وقت... وہ سینے کا درد۔ اس نے بے اختیار ہاتھ دل کے مقام پر رکھا۔ عجیب سا درد تھا۔ جس نے ایک لمحے کے لیے سب کچھ روک دیا ہو۔

"میں کچھ دیر بعد آتا ہوں۔" عجلت میں کہہ کے اس نے اسکرین فولڈ کردی۔ ضبط سے لب بھینچے، سینے کو مسلتے دائیں بائیں دیکھا۔

اس صبح کافی شاپ ویران پڑی تھی۔ گو کہ چند ایک گاہک آجا رہے تھے۔ اور کاؤنٹر پر باریستا بھی موجود تھی لیکن جب ٹیک وہ نہیں آئی تھی، ماہر کے لیے وہ جگہ ویران ہی رہتی تھی۔

وہ کرسی دھکیل کے اٹھا اور آگے بڑھ گیا۔ مال کی راہداری عبور کر کے باتھ روم تک آیا۔ وہاں قطار میں چار پانچ سنک لگے تھے جن کے پیچھے آئینے کی دیوار تھی۔ تازہ پھولوں کی مہک۔ زرد روشنیاں۔ اس نے جھک کے چہرے پر پانی ڈالا۔ پھر سر اٹھا کے اپنا عکس دیکھا۔ وہ ٹھیک تھا۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ لیکن وہ درد۔ وہ ہنوز موجود تھا۔

جیسے... جیسے ہلال کو کہیں درد ہوا ہو۔ جیسے وہ اسے بلا رہی ہو۔

اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے ماہر فرید نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ کنپٹی کی رگ واضح ہونے لگی۔ وہ یہیں کہیں تھی۔ اس کے آس پاس۔ شاید اسی ملک میں۔ شاید کسی دوسرے ملک میں۔ اور اپنی تمام تر دولت اور اختیارات کے باوجود وہ ایک جادوگر کو تلاش نہیں کر سکا تھا۔

وہ واپس کافی شاپ تک آیا تو چہرے کے تاثرات مختلف تھے۔ لیپ ٹاپ کھولا اور کام کی تمام ونڈوز بند کیں۔ یہ کام... جس کی وجہ سے وہ بار بار پاکستان نہیں جا سکتا تھا۔ یہ کام جس میں وہ بار بار الجھ جاتا تھا۔ اسے اس کام سے بریک چاہیے تھا۔

کانوں میں ائرپوڈز واپس گھسائے اور ایک کال ملائی۔

ماتھے پر بل لیے، لب بھینچے، وہ اسکرین پہ جاتی گھنٹی دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ کال اٹھالی گئی اور ایک چہرہ دکھائی دیا۔

بوائے کٹ بالوں، اور کانوں میں سانپ والے ڈائمنڈ ائیر رنگز پہنے، گہری لپ اسٹک اور سیاہ آئی شیڈو والی مسکراتی آنکھیں لیے کبیرہ سادان اس کے سامنے تھیں۔

"کیوں میرا وقت ضائع کر رہے ہو، ماہر فرید؟ میرے پاس تمہیں بتانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔"

وہ ڈریسر مرر کے سامنے فون کھڑا کیے، اس سے بات کرتے ہوئے ساتھ ساتھ جیولری اتار رہی تھیں۔ ان کے ہاں رات تھی۔ وہ غالباً ابھی کسی پارٹی سے لوٹی تھیں۔

"مجھے عالیان کو ڈھونڈنا ہے۔" وہ آگے کو جھکا۔

"جس کو میں اتنے برس سے نہیں ڈھونڈ سکی، اسے تم کیسے ڈھونڈ لوگے؟" مسکراتے ہوئے وہ بریسلیٹ کھول رہی تھیں۔ آواز میں سب کچھ تھا۔ طنز۔ ملال۔ ہوک۔

"میری طرف دیکھیے، مسز کبیرہ سادان۔"

ائیر رنگز کانوں سے نکالتے ہوئے انہوں نے

اسکرین کو دیکھا۔ وہ ہڈی کی ٹوپی پیچھے گرائے، بڑھی شیو اور ماتھے پر بکھرے بالوں والا نوجوان سنجیدہ تھا۔

"میری بہن یہیں کہیں ہے۔ میرے قریب۔ میں اسی درد سے گزر رہا ہوں جس سے آپ اتنے برس گزری ہیں۔ مجھے اس کو ڈھونڈنا ہے۔ اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے۔"

اس کی آنکھوں میں گلابی سی نمی اتر آئی تھی۔ کبیرہ نے دوسرا ائیر رنگ اتارتے ہوئے چچ کی آواز نکالی۔

"تمہاری بہن اب تک مر چکی ہوگی۔"

"عالیان زندہ ہے تو وہ کیوں مر چکی ہوگی؟"

وہ خاموش ہو گئیں۔ پھر مرسلر واٹر کے واٹس کا پیکٹ کھولا اور ایک وائپ نکالا۔

"میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟" آنکھیں بند کر کے وائپ ایک آنکھ پر رکھ دیا۔ وہ مسکارے کو گھولنے لگا۔

"آپ نے کہا تھا کہ عالیان آپ کو کسی کی دعا سے ملا تھا۔ میں اس شخص کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"میں نہیں بتا سکتی۔ کچھ باتیں راز ہی رہنی چاہئیں۔" وہ بند آنکھ پر وائپ رکھے رکھے بولیں۔ ماہر نے بہت ضبط سے پہلو بدلا۔ اس کی کہانی کے تمام کردار اس سے بہت فاصلے پر تھے۔ وہ ان کے پاس جا کے، ان کی کنپٹی پر پستول رکھ کے ان سے اپنی مرضی کا جواب نہیں اگلوا سکتا تھا۔

"پلیز۔ مسز کبیرہ۔" اس نے آواز کو بدقت نرم رکھا۔ "زندگی میں کبھی آپ کو بھی مجھ سے کام پڑ سکتا ہے۔ میں ماہر فرید ہوں۔ میں احسان کرنے والوں کو بھولا نہیں کرتا۔"

انہوں نے دھیرے سے وائپ ہٹایا۔ آنکھ مسکارے اور آئی شیڈو سے صاف تھی اور وائپ سیاہ پڑ چکا تھا۔ دوسری آنکھ ویسی ہی تھی۔ وہ مختلف آنکھیں ایک ساتھ عجیب سی لگ رہی تھیں۔

"ہماری ایک رشتے دار تھی۔ ایک غریب رشتے دار۔ وہ ایک زمانے میں کسی کی نوکرانی ہوا کرتی تھی۔" اب وہ دوسری آنکھ پر نیا وائپ رکھ کے دبائے ہوئے تھیں۔

"وہ ایک پیر صاحب کی مریدن تھی۔ میں نے ان پیر صاحب کے پاس جا کے دعا کروائی تھی کہ میری شادی سادان سے ہو جائے۔ لیکن وہ جادوگر نہ تھا۔ نیک آدمی تھا۔"

"وہ کون تھا؟ کہاں رہتا تھا؟ نام کیا تھا اس کا؟" وہ بنا سانس لیے پوچھتا گیا۔

ان کی دونوں آنکھیں صاف ہو چکی تھیں اور اب وہ مرسلر واٹر چہرے پر تھپکاتے ہوئے باقی سنگھار کو اتار رہی تھیں۔

"لوگ اس کو سرکار کہتے تھے۔"

وہ جہاں تھا سناٹے میں رہ گیا۔ ایک لمحے کے لیے ساری شاپ، سارا مال خاموش ہو گیا۔

"سرکار..." وہ بڑبڑایا۔ سینے میں اٹکی سانس بحال ہوئی۔

"وہ اس وقت کہاں ہوگا؟"

"وہ مر چکا ہے۔ کئی برس پہلے۔ عالیان کے پیدا ہونے سے بھی پہلے۔"

"مر چکا ہے؟" اس کے کندھے ڈھیلے پڑ گئے۔ آنکھوں میں بے یقینی اتری۔

"اوہ ماہر فرید..." کبیرہ بیگم ترس سے اسے دیکھتے ہوئے مسکرائیں۔ اب ان کا چہرہ میک اپ سے عاری تھا۔ "میں نے بہت لوگوں پہ جادو کروائے ہیں۔ اور مجھے اس پہ کوئی شرمندگی نہیں۔ میں نے طلاقیں بھی کروائی ہیں اور رشتے بھی۔ لیکن وہ آدمی اللہ کا نیک بزرگ تھا۔ اس نے عمل یا جادو نہیں کیا تھا۔ اس نے میرے لیے دعا کی تھی۔"

"دعا کے پیسے دیے تھے آپ نے؟"

کبیرہ بیگم کی مسکراہٹ سمٹی۔ "ہاں۔ وہ تو ہدیہ ہوتا ہے۔ دینا ہی ہوتا ہے۔ لیکن انہوں نے مانگا نہیں تھا۔"

"پھر آپ کو کیسے معلوم کہ اس نے دعا ہی کی تھی

یا کچھ اور؟"

"وہ... وہ نیک بزرگ تھے اور..."

"کسی کا دل اندر سے چیر کے دیکھا ہے آپ نے کبیرہ بیگم؟"

وہ ایک لمحے کے لیے کچھ بول نہ سکیں۔

"وہ کہاں رہتا تھا؟ اس کے آستانے پر اب کوئی تو ہوگا۔ اس کی گدی کسی نے سنبھالی ہوگی۔ یکوئی شاگرد۔ کوئی مرید۔ جس نے اس کا نام اپنا لیا ہوگا۔"

"میں نہیں جانتی۔ میں کبھی دوبارہ وہاں نہیں گئی۔" انہوں نے شانے اچکا دیے۔ اب وہ انگوٹھیاں ایک ایک کر کے اتار رہی تھیں۔

"وہ رشتے دار جس کے ذریعے آپ اس تک گئی تھیں... وہ کون تھی؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتی۔ نہ بتاؤں گی۔ وہ نیک لوگ ہیں۔ اور مجھے نیک لوگوں سے ڈر لگتا ہے۔" پھر مسکرا کے چار انگلیاں ہلا دیں۔ "بائے بائے۔" اور اسکرین سیاہ ہوگئی۔

اس نے اف کہہ کے مٹھی بھینچ لی۔ سینے کا درد اب عنقا ہو چکا تھا۔ لیکن بے بسی بڑھ گئی تھی۔

لیپ ٹاپ کی اسکرین فولڈ کی تو سامنے دیوار پر لگے شیلف میں موجود شیلڈز دکھائی دیا۔ سفید گملے کے نیچے سے کچھ جھانک رہا تھا۔ وہ چونکا۔ پھر تیزی سے اٹھ کے اس طرف آیا۔ دو انگلیوں سے گملے کے نیچے رکھا نوٹ نکالا۔

مالا کی لکھائی میں تحریر تھا۔

"کیا سارے شہر کی کافی شاپس ختم ہوگئی ہیں جو تم روز یہاں چلے آتے ہو؟"

وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ جیب سے قلم نکال کے اس کاغذ کی پشت پر کچھ لکھا اور اسے گملے تلے رکھ دیا۔

چند منٹ گزرے تھے کہ مخصوص قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ اس کے آنے سے پہلے باخبر ہو جایا کرتا تھا کہ وہ آرہی ہے۔ وہ سر جھکائے واپس کام کرتا رہا۔ یہاں تک کہ چاپ قریب آگئی۔ ساتھ ہی اس کا گڈ مارننگ سنائی دیا۔ وہ اس سے نہیں کہہ رہی تھی۔ وہ اندر آتے ساتھ ہی سب کو گڈ مارننگ کہا کرتی تھی۔ ماہر نے نگاہ اٹھا کے دیکھا۔ ایپرن ایک بازو پر دوہرا کر کے ڈالے، وہ مسکرا کے سب کا حال احوال پوچھتی کاؤنٹر تک آرہی تھی۔ بالوں کو فرنچ چوٹی میں باندھے، وہ تازہ دم لگ رہی تھی۔ اس کی میز کے قریب لمحے بھر کو رکی۔ آنکھیں چھوٹی کر کے اسے دیکھا۔ سوالیہ ابرو اٹھایا جیسے وہی پوچھ رہی ہو جو نوٹ پر تحریر تھا۔

ماہر فرید نے بیٹھے بیٹھے شانے اچکا دیے اور ابرو سے اپنے کافی کے خالی کپ کی طرف اشارہ کیا۔ مالا نے افسوس سے سر دائیں بائیں ہلایا اور کاؤنٹر کی طرف چلی گئی۔

وہ اپنی چیزیں رکھ چکی اور ایپرن اور کیپ پہن چکی تو وہ اٹھ کے کاؤنٹر تک آیا۔ دونوں کہنیاں سیاہ ماربل ٹاپ پر رکھے، آگے کو جھکے، سادگی سے اپنا آرڈر دہرایا۔

"ایک ڈارک روسٹ۔ میڈیم۔ ون ملک۔ نو شوگر۔"

سر جھکائے، دراز میں کچھ سیٹ کرتی مالا نے آنکھیں اٹھا کے اسے گھورا۔ پھر سر جھٹک کے کی بورڈ پر انگلیاں چلانے لگی۔

"میں نے تمہاری ویڈیو دیکھی۔ اچھی تھی۔"

سر جھکائے اس نے مسکراہٹ ضبط کی۔

"ویڈیو کے نیچے کمنٹس نہیں دیکھے؟ وہ اچھے نہیں تھے۔"

وہ سارا راستہ ان کو پڑھتی آئی تھی۔ گالیاں۔ بددعائیں۔ صلواتیں۔ لوگوں نے اسے بری طرح سے رگڑ دیا تھا جیسے۔ وہ اس فوٹو گرافر کو جو عورتوں کی ذہنی صحت کے ساتھ کھیل رہی تھی، ہر بری بات کہہ چکے تھے جو ڈسکشن میں موجود تھی۔

"کمنٹس سے کیا ہوتا ہے؟ کمنٹ کرنے والے فارغ لوگ ہوتے ہیں جن میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ سامنے آ کے یہی بات کہہ سکیں۔"

www.pklibrary.com

"کارڈ یا کیش؟" اس نے نگاہ اٹھا کے پوچھا۔ وہ سنجیدہ لگ رہی تھی۔

"کارڈ۔ اور وہ جھوٹ بول رہا ہے۔" والٹ سے کارڈ نکال کے سامنے کیا۔ "وہ ہلال کو کبھی نہیں چھوڑے گا۔ تمہارے لیے بھی نہیں۔"

مالا نے خاموشی سے کارڈ مشین اس کے سامنے کردی۔ ماہر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کارڈ اس پر رکھا۔ ٹوں کی آواز آئی۔

"پلیز مالا۔ اس پر بھروسہ کر کے اس سے کوئی ڈیل مت کرنا۔ اغوا کیے بچے کو کوئی نہیں چھوڑتا۔"

"تمہیں رسید چاہیے؟" بے تاثر آنکھوں کے ساتھ پوچھا۔ ماہر فرید کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"نہیں۔ مجھے انوائرمنٹ کا بہت احساس ہے۔" اسے غصہ آرہا تھا۔

مالا نے شانے اچکا دیے۔ اور رسید پرنٹ کیے بنا کاؤنٹر پر آگے کی طرف چلتی گئی جہاں کافی بنانے کی مشینیں، بلینڈرز اور جگ وغیرہ پڑے تھے۔ دوسری باریستا پیچھے شیلف میں رکھی چیزیں درست کر رہی تھی۔ ماہر کی کافی اسے ہی بنانی تھی۔

"تم ہلال کے لیے اپنی زندگی کا سودا نہیں کرسکتیں۔" وہ بھی کاؤنٹر پر اسی طرف چلتا آیا جہاں وہ کھڑی تھی۔ ان کے درمیان اب بھی مشینوں، اور سیرپ کی بوتلوں کی باڑ تھی۔

"تم پھر مجھے بتا رہے ہو کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔" مالا نے پلاسٹک کپ ایک مشین کے نیچے کیا اور بٹن دبایا۔ گرم بھوری دھار اندر گرنے لگی۔

"کیونکہ وہ تمہیں مار دے گا۔"

ساری دنیا ایک لمحے کے لیے جیسے ساکن ہوگئی۔ وہ ماہر کی طرف پشت کر کے کھڑی مشین سے کافی نکال رہی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ دیکھ سکتا تھا۔ وہ کپکپائے تھے۔

"وہ مجھے کبھی نہیں مارے گا۔" اگلے ہی لمحے وہ اسی سکون سے مڑی اور چہرہ جھکائے اس کا کپ اپنے سامنے رکھا۔

"وہ آدمی ایک ذہنی مریض ہے، مالا! جس دن اسے موقع ملا، وہ تمہیں مار دے گا۔" اس کے لہجے میں اب فکرمندی تھی۔

کریم ڈالتے اس کے ہاتھ پھر سے لرزے۔ لیکن اس نے ٹھک سے ڈھکن بند کیا، اور آواز کے ساتھ کپ اس کے سامنے رکھا۔

"ون ڈارک روسٹ۔ ون کریم۔ نو شوگر۔" وہ اب اسے دبے دبے غصے سے دیکھ رہی تھی۔ چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا، ایک جا رہا تھا۔

"وہ... تمہیں... مار دے گا۔" کپ اٹھاتے ہوئے ماہر نے اس کی آنکھوں میں جھانک کے کہا تھا۔

وہ پلٹ گئی۔ اور کوئی ایسا کام کرنے لگی جو اس وقت ضروری نہیں تھا۔

وہ واپس اپنی میز پہ آن بیٹھا اور لیپ ٹاپ کھول دیا۔ ذہن البتہ وہیں الجھا تھا۔

وہ کن اکھیوں سے دیکھ سکتا تھا کہ وہ اپنی جگہ پر آ کے کھڑی ہوئی تھی۔ پھر کچھ سوچ کے فون نکال کے کسی کو کال ملانے لگی۔ پھر جھنجھلا کے فون کان سے ہٹایا اور دائیں بائیں دیکھا۔ چند لمحے تذبذب سے کھڑی رہی۔ پھر کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کے اس کی طرف آئی۔

"اپنا فون دو۔" رکھائی سے کہتے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔

ماہر فرید نے بہت حیرت سے چہرہ اٹھایا۔

"کشمالہ مبین کو میری مدد کی ضرورت ہے؟"

"پیکج ختم ہوگیا ہے میرا۔ ماہی کو کال کرنی ہے۔ ضروری ہے۔"

اس نے مسکرا کے موبائل اَن لاک کیا اور اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ اسے انہی نظروں سے گھورتی ہوئی فون لیے کاؤنٹر کی طرف چلی گئی۔ وہ اسکرین کی طرف متوجہ ہوگیا لیکن وہ دیکھ سکتا تھا کہ وہ بار بار ایک نمبر ملا رہی ہے۔ لیکن شاید رابطہ نہیں ہوسکا۔ چند لمحے بعد اس نے فون واپس اس کی میز پر رکھا۔

pklibrary.com

''ہمیشہ کی طرح ماہر فرید کے ہونے کا مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔'' اسی لہجے میں کہہ کے وہ مڑنے لگی تھی جب وہ بول اٹھا۔

''وہ ہلال کو کبھی زندہ واپس نہیں کرے گا۔''

وہ ٹھہر کے اسے دیکھنے لگی۔

وہ کرسی دھکیل کے اٹھ رہا تھا۔

''کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جس لمحے ہلال مجھے ملی...'' سر جھکائے ساتھ ساتھ اپنی چیزیں سمیٹنے لگا۔ ''میں پولیس کے پاس جاؤں گا۔ میں ہلال سے ہر اس شخص کی شناخت کرواؤں گا جو اس جرم میں ملوث تھا۔ اور میں ہر اس شخص کو جیل میں بھیجوں گا، مالا۔'' اس نے تمام چیزیں بیگ پیک میں رکھیں۔ اسے کندھوں پر پہنا۔ اور کافی کا گرم کپ ہاتھ میں اٹھایا۔ پھر اس کو دیکھا جو سانس روکے اسے دیکھ رہی تھی۔

''وہ ابھی تک اپنے جرائم کا کوئی نشان چھوڑے بغیر زندگی گزارتا آرہا ہے۔ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرے گا جس کی سزا اسے جیل کی صورت میں ملے۔ وہ اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے گا۔ تمہیں دوبارہ حاصل کرنے کے لیے بھی نہیں۔'' سنجیدگی سے کہہ کے، کافی کپ لیے وہ آگے بڑھ گیا۔

وہ واپس کاؤنٹر کی طرف بڑھی، لیکن ٹھہر گئی۔ کچھ سوچ کے شیلف میں رکھے شیلڈن تک آئی۔ گملے کے نیچے سے نوٹ نکالا۔

ایک طرف اس کا اپنا پیغام تحریر تھا۔

''کیا سارے شہر کی کافی شاپس ختم ہوگئی ہیں جو تم روز یہاں چلے آتے ہو؟''

مالا نے نوٹ پلٹایا۔ پشت پر لکھا تھا۔

''حالانکہ تم ہمیشہ میری ڈارک روسٹ میں دو شوگر ایکسٹرا ڈالتی ہو۔''

وہ مسکرادی۔ اور کندھے اچکا کے نوٹ مروڑ کے ایپرن کی جیب میں ڈال دیا۔

مال کی راہداری میں آگے بڑھتے ماہر فرید نے کافی کپ سے گھونٹ بھرا۔ اف۔ وہ میٹھی تھی۔ ہمیشہ کی طرح۔ افسوس سے سر جھٹک کے کپ کو قریب رکھے ٹریش کین میں اچھالا اور ابھی آگے بڑھا ہی تھا کہ موبائل بجنے لگا۔

شاید ماہی کر رہی تھی۔ اس نے مسڈ کال اب دیکھی ہوگی۔ لیکن موبائل نکالا تو مالک کا نام جگمگا رہا تھا۔

''کچھ معلوم ہوا؟'' اس نے تیزی سے موبائل کان سے لگایا۔

''ہاں۔ زیاد کی ماں کس ہسپتال میں ہے، یہ معلوم ہوگیا ہے۔''

بالآخر اس کے لبوں پر گہری مسکراہٹ اتر آئی۔ اسے معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

☆☆☆

زیاد کی ماں کے ہسپتال جانے سے قبل وہ اپارٹمنٹ واپس آیا تھا۔ لباس تبدیل کیا۔ سیاہ پینٹ کے ساتھ ہم رنگ ڈریس شرٹ پہنی۔ اوپر سیاہ کوٹ۔ بال جیل لگا کے سمیٹے۔ اب وہ اس انٹرپریٹر کی بجائے جو کافی شاپ سے کام کرتا تھا، ایک ایسا شخص لگ رہا تھا جو ہسپتال کسی مریض کی عیادت کے لیے جا رہا تھا۔ پھول اس نے راستے سے لے لیے تھے۔ اور نگینہ سلطان کا روم نمبر اس کو ریسپشن سے باآسانی معلوم ہوگیا تھا۔

وہ ایک سفید اور روشن کاریڈور تھا۔ وہاں پرائیوٹ رومز تھے۔ اس نے استعجاب سے دائیں بائیں دیکھا۔ یہ کافی مہنگا ہسپتال تھا۔ زیاد کے پاس اتنا پیسہ تھا کیا؟ انٹرسٹنگ۔

ایک کمرے کے سامنے رک کے اس نے دستک دی۔

''یس؟'' نسوانی آواز سنائی دی۔

اس نے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔ وہ عام دھاتی ہینڈلز کی نسبت گرم تھا۔ یا شاید اسے محسوس ہوا تھا۔

ہینڈل گھمایا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔

بستر پر ایک نالیوں میں جکڑی بوڑھی عورت آنکھیں موندے سو رہی تھی۔ آکسیجن ماسک۔

نالیاں۔ مشینوں کی اپ ہپ۔ سامنے کاؤچ پر ایک دوسری عورت بیٹھی تھی۔ موٹی چوٹی۔ سادہ شلوار قمیص۔ بھرے بھرے جسم والی۔ سانولی رنگت۔ کالی آنکھیں۔ گھنے ابرو۔ اس نے عام سے انداز میں نگاہ اٹھا کے چوکھٹ میں کھڑے ماہر فرید کو دیکھا۔

اور اگلے ہی لمحے وہ کرنٹ کھا کے اٹھی۔

"جج... جی؟" اس کی رنگت اتنی تیزی سے بدلی جتنی تیزی سے برف باری بھی سبزہ زار کو سفید نہیں کرتی۔ ہونٹ کھل گئے۔ پلکیں جھپکنا بھوک گئیں۔

چوکھٹ میں کھڑے ماہر فرید کے چہرے پر ایک معذرت خواہانہ سا تاثر ابھرا۔

"آپ نگینہ سلطان کی کیئر ٹیکر ہیں غالباً؟" وہ اردو میں پوچھ رہا تھا۔ مہذب۔ شائستہ۔

اندرانی نے بنا پلکیں جھپکائے اثبات میں سر ہلایا۔

"کیسی ہیں مسز سلطان؟" ماہر نے ایک افسوس بھری نگاہ ان پر ڈالی۔ اندرانی نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا۔ وہ سیدھی لیٹی تھیں۔ آنکھیں بند تھیں۔ دونوں بازو گاؤن سے باہر تھے۔ جو رخ ماہر کی طرف تھا، وہ بازو صاف تھا۔ قابیل کا نشان دوسری طرف تھا۔ اندرانی بوجھل قدموں سے چلتی تیزی سے دوسری طرف آن ٹھہری۔

"ٹھیک ہیں۔" لحاف ٹھیک کرتے ہوئے جھکی اور ان کے بازو کو ڈھانک دیا۔ نشان چھپ گیا۔

"سوری میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔ مجھے..." وہ کھنکھارا۔ "زیاد سے ملنا ہے۔" وہ اس نشان کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ اندرانی کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا جو وہ جھکائے ہوئے تھی۔ جیسے اس سے نگاہیں چرا رہی ہو۔

"وہ... یہاں نہیں ہے۔"

"کب آئے گا؟"

"پپ... پتا نہیں۔" اندرانی کو ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔ لحاف درست کر کے وہ ایک کونے میں جا کھڑی ہوئی۔ ڈرتے ڈرتے ماہر کی طرف نگاہ اٹھائی۔ وہ پتلیاں سکوڑے غور سے اس کو دیکھ رہا تھا۔

"زیاد کو کال کرو۔ اسے کہو کوئی اس سے ملنا چاہتا ہے۔" اس کے لہجے میں تحکم در آیا۔

"او کے۔ او کے۔" اس نے تیزی سے سر ہلایا۔ پھر موبائل نکالا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ کچھ تھا اس کے انداز میں جو وہ کھٹکا۔ وہ اتنی پریشان کیوں تھی؟ اور شاید خوف زدہ بھی۔

موبائل کان سے لگاتے ہوئے وہ انہی ہراساں نظروں سے ماہر کو دیکھے گئی۔ اسپیکر آن تھا۔ دوسری طرف واٹس میل کا میسج سنائی دینے لگا۔ جیسے ہی ٹون بجی۔ وہ میسج ریکارڈ کرنے لگی۔

"زیاد... زیاد صاحب... ہسپتال آجائیں۔" تھوک نگلا۔ "ماہر فرید آپ سے ملنے آیا ہے۔"

ماہر نے تعجب سے ابرو اٹھایا۔ وہ اس کا نام جانتی تھی۔ وہ اس کو جانتی تھی۔

"میں نے پیغام ریکارڈ کروا دیا ہے۔ اب آپ جائیں۔ پلیز۔" وہ اسی گھبراہٹ سے کہہ رہی تھی۔ "مریض ڈسٹرب ہو رہی ہیں۔"

"میں کہیں نہیں جا رہا، بی بی۔ میں باہر بیٹھا ہوں۔ زیاد کو ہر چند منٹ بعد کال کروا دو اسے بتاؤ کہ میں اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ بلکہ..." موبائل نکال کے اسکرین روشن کی۔ "مجھے اس کا نمبر لکھواؤ۔"

وہ اٹک اٹک کے نمبر بتانے لگی۔ نمبر محفوظ کر کے اس نے کال کا بٹن دبایا۔ وہی واٹس میل۔

باہر نکلنے سے پہلے ماہر نے ایک گہری نگاہ اس پر ڈالی اور پھر اس کمرے کو گردن گھما کے دیکھا۔

دائیں بائیں۔ اوپر نیچے۔ کچھ تھا اس کمرے کی فضا میں۔ کچھ تھا جو... اس نے سر جھٹکا۔ زیاد سلطان جادو میں ملوث تھا۔ اس کے اثرات یقیناً اس کے گھر والوں تک آئے ہوں گے۔

وہ باہر نکل گیا۔ اندرانی خوف سے اسے جاتے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

وہ آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔
کمرے میں مدھم روشنی تھی۔ اس کا چہرہ نیم تاریک سا دکھائی دے رہا تھا۔ باہر اس سے زیادہ تاریکی تھی۔ ایک خاموش پراسراریت۔
مالا نے ایک نظر اپنے لباس کو دیکھا۔ نیلا اور سبز ٹائی اینڈ ڈائی لمبا فراک نما میکسی۔ کلائی سے آستین تنگ تھے اور ان پر گول گول بٹن لگے تھے۔ گردن میں فاختہ والا نیکلس تھا۔ بال اونچی پونی میں باندھے تھے۔ کانوں میں ٹاپس پہنے۔ ہلکا میک اپ کیے۔ وہ اب ہونٹوں پر لپ اسٹک لگا رہی تھی۔ پھر پونی کو ہاتھ میں پکڑ کے ہاتھ نیچے تک لائی۔ اسے چھوڑ دیا۔ وہ دائیں بائیں جھول کے ساکت ہوگئی۔
مالا نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔
کیا وہ درست کرنے جا رہی تھی؟
کیا اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ تھا؟
اپنا عکس دیکھتے ہوئے اس نے تھوک نگلا۔ پھر پرس کا اسٹریپ کندھے پر پہنا۔ ہاتھوں میں لرزش تھی۔
پھر وہ اپنے بیڈ تک آئی۔ تمام چیزوں کی ترتیب جوڑی۔ موبائل پرس میں رکھا۔ ایک کیبن سائز ٹرالی بیگ کا ہینڈل پکڑا اور اسے اپنے ساتھ چلاتے ہوئے باہر نکلی۔
باہر ٹھنڈی ہوا تھی۔ اس کے بال پیچھے کو اڑنے لگے۔ دور پارکنگ ایریا میں وہ ایک سیاہ کار دیکھ سکتی تھی۔ وہ اس سے ٹیک لگائے زیاد سلطان کو بھی دیکھ سکتی تھی۔ اس نے سوچا تھا اب اسے اس شخص سے ڈر نہیں لگتا۔ لیکن وہ غلط تھی۔ اسے ڈر لگتا تھا۔ اسے ڈر لگ رہا تھا۔
وہ جو کلائی پر بندھی گھڑی دیکھ رہا تھا، اسے دیکھ کے سیدھا ہوا۔ وہ قدم قدم چلتی اس کے سامنے آ رکی۔ بیگ کے ٹائرز کی زمین پر رگڑنے کی آواز بھی رک گئی۔
تاریک رات میں وہ دونوں چند لمحے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔
"تم واقعی آ گئیں۔" وہ جیسے بے یقین تھا۔
"میں نے اپنے حصے کا وعدہ پورا کیا ہے، زیاد۔ اب تم اپنے حصے کا کرو۔" وہ سنجیدہ تھی۔ پونی دائیں بائیں جھول رہی تھی اور آنکھیں بے تاثر تھیں۔
زیاد نے اثبات میں سر ہلایا۔
"میں تمہیں ہلال کے پاس لے جانے کے لیے تیار ہوں۔ کیا تم میرے اوپر بھروسہ کر کے میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو؟"
اس نے سر کو ہاں میں جنبش دی۔ بہت سا تھوک نگلا۔
"اور اس کے بعد، کشمالہ؟" وہ امید اور خوف کے درمیان اسے دیکھ رہا تھا۔
"وہی جو میں نے کہا تھا۔ تم ہلال کو ماہر کے اپارٹمنٹ کے باہر چھوڑ آؤ گے۔ میں پاسپورٹ ساتھ لائی ہوں۔ ہم دونوں اگلی فلائٹ سے یہاں سے پاکستان چلے جائیں گے۔ اور..." تھوک نگلا۔ "میں خلع کا کیس واپس لے لوں گی۔"
وہ چند لمحے آنکھوں کی پتلیاں سکوڑے اسے دیکھتا رہا۔ پھر بازو بڑھایا۔
"تمہارا فون۔"
مالا کے ابرو اکٹھے ہوئے۔
"میرا فون کیوں؟" دل بری طرح دھڑکا۔
"تمہارا فون ہمارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ کہا نا، تمہیں مجھ پر بھروسہ کرنا ہوگا۔" وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔ البتہ اس کی آنکھیں اس کی آنکھوں سے ہٹ نہیں رہی تھیں۔
ایک سنسنی خیز لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ لیکن اس نے پرس سے فون نکالا اور زیاد کی طرف بڑھایا۔ زیاد نے فون پاور آف کیا اور اگلے ہی لمحے اسے قریب رکھے ٹریش کین میں اچھال دیا۔ اس کا منہ کھل گیا۔
"زیاد... یہ میرا فون تھا۔"
"میں تمہیں نیا لے دوں گا۔ تمہارا ڈیٹا ہمیشہ

کلاؤڈ سے بیک اپ ہوتا ہے۔" پھر اس نے غور سے مالا کو دیکھا۔ "اگر تمہیں میرے اوپر بھروسہ نہیں ہے تو ہمیں ڈیل کرنے کی ضرورت..."

"ٹھیک ہے۔ چلو۔" وہ کار کے دروازے کی طرف بڑھی۔ ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو وہ کپکپا رہا تھا۔

"تم خوف زدہ ہو، مجھ سے؟ اس آدمی سے جو تم سے محبت کرتا ہے؟" وہ دھیرے سے بولا۔ اس کی آواز زخمی تھی۔ "لیکن تم ماہر کے لیے اتنا بڑا خطرہ مول لینے کو تیار ہو۔"

مالا نے گہری سانس لی اور پلٹ کے اسے دیکھا۔

"میں اس کو اتنا ہی ناپسند کرتی ہوں جتنا تمہیں۔ تم دونوں دھوکے باز ہو۔ میں یہ صرف ہلال کے لیے کر رہی ہوں۔"

زیاد کو شاید ان الفاظ کی توقع نہ تھی۔ اس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔

"میں تمہارے ساتھ واپس جا رہی ہوں۔ اس لیے نہیں کہ میں تم سے محبت کروں گی، زیاد۔ بلکہ جیسے تمہاری ماں نے تمہارے باپ کو اپنے ساتھ باندھ کے رکھا ہے، ویسے ہی میں بھی تمہارے ساتھ رہوں گی۔ اور تمہارے باپ کی طرح میرے دل میں بھی تمہاری نفرت بڑھتی جائے گی، زیاد۔ کوئی بھی چیز اس نفرت کو کم نہیں کر سکے گی۔ تم تیار ہو اس کے لیے؟"

زیاد نے ایک اچٹتی نظر اس پر ڈالی اور ڈرائیونگ ڈور کی طرف بڑھ گیا۔

کار میں بیٹھنے سے پہلے کشمالہ مبین پلٹی اور اپنے پیچھے دیکھا۔ اپارٹمنٹ بلڈنگ سامنے کھڑی تھی۔ وہ ابھی بھی بھاگ کے اندر جا سکتی تھی۔ وہ پولیس کو بلا سکتی تھی۔ لیکن نہیں۔ ہلال کو اس آدمی کی قید سے نکالنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔

وہ کار میں بیٹھی اور دروازہ بند کر دیا۔

ایسے لگا جیسے زندگی کا ایک در بند ہو گیا ہو۔

اس نے سیٹ بیلٹ پہنی۔ عجیب گھٹن سی محسوس ہوئی۔

سامنے سڑک تاریک تھی۔

ساری دنیا سو رہی تھی۔

زیاد نے کار کی ہیڈ لائٹس روشن کیں۔ اور اسے سڑک پر ڈال دیا۔

مالا نے دونوں ہاتھ باہم پھنسائے گود میں رکھ لیے۔ وہ ابھی تک کپکپا رہے تھے۔

☆☆☆

ہسپتال کے کاریڈور میں بنا دروازہ کھلا اور اندرانی نگینہ بیگم کے کمرے سے باہر آتی دکھائی دی۔ اگلے ہی لمحے وہ دھک سے رہ گئی۔

ماہر فرید سامنے بیٹھا تھا۔ خالی کرسیوں کے عین درمیان میں۔ ٹانگ پر ٹانگ جمائے، وہ بہت فرصت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ میں ایک چھوٹی سی نیلے دانوں والی تسبیح تھی۔ اسے دیکھتے ہی اس نے وہ جیب میں ڈال دی۔

"آپ... ابھی یہیں ہیں؟" اندرانی کا چہرہ سفید پڑا۔

"زیاد کب آ رہا ہے؟" وہ غور سے اس کو دیکھ رہا تھا۔

دور کہیں... جیسے کسی کنویں سے... وہ سرگوشیاں اٹھتی سنائی دینے لگیں۔ وہ اس کے آس پاس تھے۔ وہ بھنبھنا رہے تھے۔ وہ اس بھنبھناہٹ کو پہچانتا تھا۔ ہلکا سا سر جھٹکا۔ اسے ان کو نظر انداز کرنا تھا۔

"وہ نہیں آئیں گے۔ ان کا نمبر آف جا رہا ہے۔"

وہ دروازے پہ کھڑی تھی۔ سفید قمیض اور چوڑی دار پاجامہ۔ سیاہ سفید سیاہ بالوں کی چوٹی۔ انگلیاں مروڑتی۔ کالی بڑی بڑی آنکھیں جن میں عجیب سا ہراس تھا۔

"تم میرا نام کیسے جانتی ہو؟" وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور قدم قدم چلتا اس کے قریب آیا۔

"میں... وہ... سنا تھا کہیں۔" اندرانی پلک نہیں جھپک پا رہی تھی۔ وہ قریب آیا تو وہ دو قدم پیچھے ہٹی

گئی۔ نگاہیں ماہر فرید کے چہرے پہ جمی تھیں۔
"کیا نام ہے تمہارا؟"
"اندرانی۔" اس نے نامحسوس انداز میں بائیں کہنی سے اوپر دایاں ہاتھ رکھ لیا۔
"کب سے ہو زیاد کی ماں کے ساتھ؟" وہ اس کے عین سر پہ پہنچ چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتی اندرانی کا اگلا سانس دوبھر ہو گیا۔
"بہت .... بہت برس ہو گئے۔ مجھے جانا ہے جی۔" وہ دھیرے دھیرے بازو مسل رہی تھی۔ اسے درد ہو رہا تھا۔ جیسے اس کی روح حلق میں اٹکی تھی۔
"زیاد سے کہو، مجھ سے بات کرے۔ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔" ابرو اٹھا کے تنبیہ کی۔ اندرانی نے جلدی سے سر اثبات میں ہلایا۔ اب وہ زور سے بازو مسل رہی تھی۔ وہ پیچھے ہٹ گیا۔ دو قدم۔ تین قدم۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جیسے جیسے پیچھے جا رہا تھا، اندرانی کا بازو سہلاتا ہاتھ ڈھیلا پڑ رہا تھا۔ شاید اس کا درد کم ہو رہا تھا۔ پھر اس کا جیسے سانس بحال ہونے لگا۔ وہ تیزی سے واپس اندر غائب ہو گئی۔
"مالک.... مجھے ایک معلومات چاہیے۔" وہ موبائل کان سے لگائے پارکنگ لاٹ کی طرف جا رہا تھا۔
"تمہیں اندازہ ہے اس وقت یہاں کیا بجا ہے؟" مالک فرید کی غراتی آواز سنائی دی۔
"اندرانی... نگینہ سلطان کی ملازمہ۔" اس کی غراہٹ نظر انداز کر کے وہ کہہ رہا تھا۔ "یہ کون ہے؟ تم مجھے معلوم کر کے دو کہ نگینہ سلطان کے ساتھ کس نے لاہور سے وین کوور کا سفر کیا ہے۔ اس کا پاسپورٹ چاہیے مجھے۔ تاکہ ہم اس کے بارے میں مزید جان سکیں۔" کار میں بیٹھتے ہوئے اس نے کال کاٹ دی۔ پھر سیٹ بیلٹ پہنی اور چند لمحے وہیں بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔
مالا۔ اسے مالا سے پوچھنا چاہیے تھا۔ وہ اس گھر کی بہو رہی تھی۔ وہ جانتی ہوگی کہ یہ بنگالی عورت کون تھی۔ کہیں وہ کسی جادو وغیرہ کے معاملات میں ملوث تو نہیں؟ زیاد کی ماں ایک بیمار اور بے ضرر عورت تھی لیکن یہ اندرانی.... کچھ تھا اس کے بارے میں۔ کچھ غلط تھا۔
مالا کا نمبر بند جا رہا تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ اس وقت مال بند نہیں ہوا ہوگا۔ وہ شاپ پہ ہو گی۔
کافی شاپ میں داخل ہوتے ہی اس کی آنکھیں اس شناسا چہرے کی تلاش میں کاؤنٹر تک دوڑیں۔ دائیں بائیں۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ کان میں بالی پہنے فربہ سا باریستا وہیں کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کے شناسائی سے مسکرایا تک نہیں۔ وہ تیزی سے کاؤنٹر تک آیا۔
"مالا کہاں ہے؟"
"وہ تو دوپہر میں چلی گئی تھی۔ ایک دم سے کام چھوڑ کے۔ ابھی اس کی جگہ میں شفٹ کر رہا ہوں۔ کیونکہ مادام کا فون آف ہے۔" اس کا موڈ خراب تھا۔ غصے سے بتایا اور زور سے بلینڈر کا بٹن دبا دیا۔ زوں زوں اتنی اونچی ہوئی کہ وہ اگلا سوال نہیں پوچھ سکا۔
مالا کا نمبر ملاتے ہوئے وہ اپنی مخصوص کرسی تک آیا۔ چہرے پر الجھن تھی۔ مالا کا نمبر مسلسل آف جا رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں رہتی تھی۔ بلڈنگ معلوم تھی۔ اپارٹمنٹ نمبر نہیں۔ لیکن ایک شخص کو معلوم ہوگا۔
"ماہر بے... لانگ ٹائم۔" ماہی کی کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ کچھ کہنے لگا لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔
"میں تم سے کیچ اپ بعد میں کروں گا۔ مالا کہاں ہے؟"
"مال میں ہو گی۔" ماہی کے پیچھے بچے کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ مصروف لگ رہی تھی۔ اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔ وہ ٹھیک ہو گی۔ وہ یقیناً ٹھیک ہو گی۔ وہ ایسے ہی پریشان ہو رہا تھا۔
"کبھی آپ ہمارے پاس چلی ویک آئیں

نا۔" وہ اسے اپنے گھر مدعو کر رہی تھی۔ وہ کچھ اور بھی کہہ رہی تھی، بچے کے رونے کی آواز کے باعث وہ سن نہیں پا رہا تھا۔ اور تب ہی کچھ تھا جو اس کی آنکھ میں کھٹکا۔

شیلڈن کے سفید گملے تلے رکھا ایک نوٹ کا کنارہ۔

"ماہی... میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔"

وہ فون نیچے کرتے ہوئے تیزی سے اس طرف آیا۔

ایک سرخ بتی جلنے بجھنے لگی تھی۔

اس نے گملا ہٹایا۔

ایک نیا نکور نوٹ اس کے نیچے چھپا تھا۔

ماہر نے نوٹ نکال کے روشنی کی طرف اٹھایا۔

وہاں دو الفاظ تحریر تھے۔

**Find me**

ساری دنیا ایک دم ساکت ہو گئی۔

☆☆☆

اس اونچے پردوں والے لونگ روم میں صبح کی روشنی ابھی ٹھیک سے داخل نہیں ہوئی تھی۔ مالک فرید اپنے کمرے سے نکلے تو ٹریک سوٹ میں ملبوس تھے۔ یہ ان کی واک کا وقت تھا۔ لیکن دروازے کی طرف جانے کی بجائے وہ لونگ روم کی ایک ونگ چیئر پر آن بیٹھے۔ بے چینی سے گھڑی دیکھی۔ اسی پل دروازہ کھلا اور ایک نوجوان نے اندر جھانکا۔

"میں آجاؤں؟"

وہ ٹیب اٹھائے، رف سے ٹی شرٹ اور ٹراؤزرز میں ملبوس ان کا سیکرٹری تھا۔ مالک فرید نے ناپسندیدگی سے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔ وہ قدرے شرمندہ ہو گیا۔

"سوری سر۔ ابھی آفس جانے میں وقت تھا تو میں تیار نہیں ہو سکا..."

وہ نادم سا سامنے آیا۔ پھر ٹیب کی اسکرین ان کے سامنے کی۔

"نگینہ سلطان نے میڈیکل ویزے پہ دو لوگوں کے ساتھ ٹریول کیا ہے۔"

اس نے رک کے وقفہ دیا۔ آنکھیں چمک رہی تھیں۔ جیسے وہ کچھ ایسا جانتا تھا جس سے مالک فرید لاعلم تھے

"دو لوگ؟" مالک فرید نے انگلیوں پر گنا۔ "زیاد اور کبیر ٹیکر اندرانی؟"

"نہیں۔ زیاد سلطان کینیڈا میں نہیں ہے۔" پھر جلدی سے وضاحت کی۔ "یعنی اپنے پاسپورٹ کے مطابق وہ سعودی عرب سے پاکستان چلا گیا تھا اور وہیں ہے۔"

"مطلب اس نے کسی جعلی پاسپورٹ پہ سفر کیا ہے۔ ویری گڈ۔ اس کے اوپر کیس بن سکتا ہے۔" پھر وہ چونکے۔

"اگر تیسرا فرد زیاد نہیں ہے تو کون ہے؟"

سیکرٹری نے ٹیب کی اسکرین ان کے سامنے کی۔

"ایک گیارہ سال کی بچی۔ ہلال سلطان۔"

عبدالمالک فرید نے کرنٹ کھا کے ٹیب تھاما۔

سامنے ایک پاسپورٹ پکچر کھلی تھی۔ ان کی نگاہیں پلک جھپکنا بھول گئیں۔

وہ تصویر تازہ تھی۔ وہ بڑی لگ رہی تھی۔ وہ اس لڑکی سے بڑی لگ رہی تھی جسے انہوں نے آخری دفعہ دیکھا تھا۔

اور وہ مسکرا رہی تھی۔

"وہ زندہ ہے۔" ان کا سانس دھیرے سے بحال ہوا۔

"وہ درست کہتا تھا۔" ایک آہ سی بھری۔

"اتنے برس سے ماہر فرید درست کہہ رہا تھا۔ وہ واقعی زندہ تھی۔"

ان کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ ابھری۔ پھر چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا۔

"گڈ جاب۔"

شاید اس لڑکے کے کیریئر کے دوران وہ پہلا موقع تھا جب مالک فرید نے مسکرا کے اسے یہ دو الفاظ کہے تھے۔ لیکن وہ نہیں مسکرا سکا۔ اسے ابھی انہیں کچھ اور بھی بتانا تھا۔

اس نے تھوک نگلا۔

"سر..." بہت ہمت سے الفاظ مجتمع کیے۔

"یہ گورنمنٹ ایشوڈ پاسپورٹ ہے۔" وہ غور سے زوم کر کے ہلال کا پاسپورٹ دیکھ رہے تھے۔ "یعنی زیاد سلطان نے کسی سرکاری اہلکار کے ساتھ مل کے ہلال کا پاسپورٹ جال ہی میں بنوایا ہے۔"

"سر...؟"

"اس نے اپنی ماں کا میڈیکل ویزا ایشو کروایا ہوگا۔ اسی لیے ہلال کو اپنی بہن ظاہر کیا ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے علاج کے لیے اس کی کیئر ٹیکر اور بیٹی کو ویزا مل جانا آسان تھا۔ ویری انٹرسٹنگ۔"

"سر..." اس کی آواز بلند ہوئی۔ انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کچھ ہے جو آپ کو جاننا چاہیے۔"

اگلے الفاظ کہنا اس کے لیے بہت دشوار تھا۔

مالک فرید نے ٹیپ ایک طرف رکھ دیا۔ پھر گردن اٹھا کے اسے دیکھے گئے۔ وہ بولتا گیا اور وہ اس نوجوان کے ہلتے ہونٹ دیکھتے گئے۔

مالک فرید اس روز صبح کی واک پہ نہیں گئے۔ وہ آفس جانے کے لیے تیار بھی نہیں ہوئے۔ وہ کافی دیر اسی صوفے پر بیٹھے رہے۔ مٹھی ہونٹوں پر جمائے وہ چپ چاپ کھڑکی سے طلوع ہوتے سورج کو دیکھے گئے۔

سیکرٹری بھی دم سادھے سامنے بیٹھا رہا۔ جیسے سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ کیا کرے۔

پھر وہ کھنکھارے۔ وہ چونک کر سیدھا ہوا۔ مالک فرید فون نکال کے کال ملا رہے تھے۔

"تم درست کہہ رہے تھے، ماہر۔" وہ بولے تو ان کی آواز شکستہ تھی۔ "اندرانی کی تلاش میں ہمیں کچھ اور مل گیا ہے۔ مگینہ اور اندرانی کے ساتھ ہلال نے بھی سفر کیا ہے۔ اس کا پاسپورٹ ریکارڈ پہ ہے۔ اس کی تصویر تازہ ہے۔ وہ زندہ ہے، ماہر۔ اور وہ کینیڈا میں ہے۔"

دوسری طرف سے کچھ سن کے انہوں نے سر نفی میں ہلایا۔

"نہیں۔ زیاد ساتھ نہیں تھا۔ وہ کسی دوسرے پاسپورٹ پر کینیڈا آیا ہے۔ ہاں، بالکل۔" سر اوپر نیچے ہلایا۔ "اس کو identity theft میں پکڑنا مشکل نہیں ہوگا۔ ہاں تم پولیس کو اطلاع کردو۔" انہوں نے فون رکھ دیا۔ سیکرٹری منتظر نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"آپ نے اسے نہیں بتایا؟" اسے تعجب ہوا۔

مالک فرید نے تھکی ہوئی آنکھیں اٹھا کے اسے دیکھا۔

"کیا مرنے والے کو وقت سے پہلے موت دینا ضروری ہے؟"

پھر وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کے اٹھ گئے۔

انہیں آفس پہنچنا تھا۔

☆☆☆

کار طویل سڑک پر دوڑتی جارہی تھی۔ وہ کھڑکی سے باہر بھاگتے درختوں کو دیکھ رہی تھی۔ اب قدرے پہاڑی علاقہ شروع ہو رہا تھا۔ ایک طرف سمندر۔ دوسری طرف پہاڑ۔

درمیان میں ایک جگہ زیاد نے کار روکی۔ سڑک کنارے ایک نیلی ایس یو وی رکی کھڑی تھی۔

"ہم باہر کیوں نکل رہے ہیں؟" وہ باہر نکلا اور اسے بھی پیروی کا کہا تو وہ چونک گئی۔

"کیا تمہیں مجھ پہ بھروسہ نہیں ہے؟" وہ اس کی طرف کا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ اس نے لب بھینچ لیے اور باہر نکلی۔

"لیکن میرا سامان اس کار میں ہے۔"

"وہ آجائے گا۔" اس نے ہاتھ سے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ مالا چپ چاپ آگے بڑھ گئی۔

اس نیلی ایس یو وی میں جب وہ دونوں بیٹھ گئے تو زیاد نے اسے سڑک پر ڈال دیا۔ مسافت ایک دفعہ پھر شروع ہوگئی۔

"ہم کہاں جارہے ہیں؟" قدرے توقف سے اس نے گردن زیاد کی طرف موڑی۔ وہ بالکل خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔

"میں اپنا وعدہ پورا کرنے جارہا ہوں۔" اس نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ جمائے ایک نظر اسے دیکھا۔ اس کی نظروں میں کچھ عجیب سا تھا۔

"تم جانتی ہو کہ میں ایک قاتل ہوں۔" وہ طنز

کرر ہا تھا۔ وہ اسے دیکھے گئی۔ ''پھر بھی تم ماہر کے لیے اپنی زندگی کا سودا کرنے کو تیار ہو گئیں۔''

''میں یہ ماہر کے لیے نہیں کر رہی۔''

''تم ماہر کے لیے مجھ سے طلاق لے رہی تھیں۔''

''میں تم سے تمہاری وجہ سے طلاق لے رہی تھی۔'' اس کی آواز بلند ہوئی۔

''دوسری شادی پہلی جیسی نہیں ہوتی، مالا۔ پہلی شادی جیسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔''

''پھر بحث کیوں کر رہے ہو؟ میں یہاں ہوں۔ تمہارے ساتھ۔ نہیں لے رہی میں طلاق۔'' وہ تنگی سے کہہ کے باہر دیکھنے لگی۔ دل ابھی تک زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

چند لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ وہ صرف اپنے دل کی دھڑکن سن سکتی تھی۔ یا اس کے سانس لینے کی آواز۔

''تم نے کبھی مجھ سے محبت نہیں کی۔'' وہ بولا تو آواز میں تکلیف تھی۔ شکوہ تھا۔

''تم نے بھی نہیں کی۔ صرف میرے اندر سبرینہ کو تلاش کیا۔'' وہ باہر دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے۔

''وہ اس قابل تھی کہ اس کو میں دنیا کی ہر عورت میں تلاش کرتا۔''

''وہ صرف تمہارا تصور تھی، زیاد۔ تم صرف اس کو بیٹھ کے دیکھتے تھے۔ وہ تم سے نفرت کرتی ہے۔'' رک کے تصحیح کی۔ ''کرتی ہوگی۔ یعنی جب وہ زندہ ہوگی تب۔''

زیاد نے ایک نظر اسے دیکھا۔ کچھ تھا جو اسے غیر آرام دہ کر گیا تھا۔

''تم سبرینہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔''

''کم از کم وہ تمہاری منگیتر نہیں تھی۔'' وہ جتا کے بولی۔

''تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔'' وہ ایک دم غرایا۔ اس کا دل بری طرح دھڑکا۔ وہ بالکل ساکن ہو گئی۔ پھر زیاد نے سر جھٹکا۔ اور سڑک کی طرف توجہ مرکوز کر دی۔ دھیرے دھیرے مالا کا سانس واپس آنے لگا۔

کار خاموشی سے سڑک پر دوڑتی رہی۔ وہ سڑک کنارے لگے بورڈ پڑھ سکتی تھی۔ وہ ہیریسن ویلج میں داخل ہو رہے تھے۔ اندھیرے میں بس وہ اتنا دیکھ سکتی تھی کہ وہاں درخت تھے۔ پہاڑ تھے۔ دور نیچے بہتا سمندر تھا۔ کنارے پر بنے لکڑی کے مخروطی گھر تھے۔ رات تاریک تھی اور اس ملک میں سورج ڈوبنے کے بعد بتیاں جلانے کا رواج کم کم تھا۔ یہ گاؤں ایسا اندھیر تھا جیسے کسی سیاہ پرندے نے اسے اپنے پروں تلے ڈھانک لیا ہو۔

قریباً آدھ گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد زیاد نے کار ایک مخروطی گھر کے سامنے روکی۔ سڑک کے کنارے اونچائی پہ بنا گھر جس کی بالکونی سمندر کی طرف کھلتی تھی۔ وہ ایسے دہانے پر بنا تھا کہ جیسے ابھی ذرا سا لڑھکا تو نیچے سمندر میں جا گرے گا۔

''تمہارے بعد۔'' زیاد نے لکڑی کا چھوٹا سا دروازہ کھولا اور اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ گھر بالکل اندھیرا تھا۔ ایک بتی بھی نہیں۔ دل بری طرح دھڑکا لیکن بظاہر گردن اکڑا کے وہ آگے بڑھ گئی۔

گھر کے اندر جاتا دروازہ بھی لکڑی کا تھا اور غیر مقفل تھا۔ مالا نے ہینڈل موڑا تو دروازہ چرچراہٹ کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ بتی خود بخود جل اٹھی۔

اندر ایک سادگی سے سجایا گیا لونگ روم تھا۔ ساتھ لکڑی کا زینہ جو اوپر جاتا تھا۔ یہ گویا ایک چھوٹا سا ویکیشن ہاؤس تھا۔ کیا یہ زیاد کی ملکیت تھا؟ یا اس نے کسی دوسرے کے گھر پہ چند دن کے لیے قبضہ جمایا تھا؟

وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھانے لگی۔ ہر قدم کے ساتھ لکڑی کے چٹخنے کی آواز آتی۔ پھر کمرے کے وسط میں پہنچ کے وہ ٹھہر گئی۔ سر اٹھا کے دیکھا۔ اوپر نازک سا فانوس جھول رہا تھا۔ کھڑکیوں کے ساتھ جالے لگے تھے۔

چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ بند ہوا تو وہ اس طرف گھومی۔ زیاد بند دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔

مالا نے تھوک نگلا۔ پہلو میں گرے ہاتھ

کپکپائے۔ لیکن اسے ہمت کرنی تھی۔ جب فیصلہ کرلیا تو کرلیا۔

''ہلال کہاں ہے؟''

''یہاں نہیں ہے۔'' وہ سینے پر بازو لپیٹے، قدم قدم چلتا اس کے سامنے آرکا۔ اس کا دل بری طرح دھڑکا۔

''تم نے کہا تھا تم مجھے اس کے پاس لے کر آؤ گے۔''

''اور تم نے یقین کرلیا؟'' وہ زخمی سا مسکرایا۔ اس کے چہرے پر تکلیف تھی۔

وہ پلک تک نہیں جھپک پا رہی تھی۔

''تم نے میری آفر قبول...''

''تمہیں واقعی لگا تھا کہ میں اسے زندہ رہا کردوں گا؟'' وہ جیسے تعجب کا شکار تھا۔

اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ بازو سینے پر لپیٹ لیے گویا خود کو تھام لیا ہو۔

''زیاد...'' اس کی آواز کپکپائی۔ بھیگی آنکھیں اس پہ جمی تھیں۔ ''تم نے وعدہ کیا تھا۔''

''تم نے بھی وعدہ کیا تھا۔ میرے ساتھ ساری زندگی رہنے کا۔ پھر کیا ہوا اس وعدے کا؟''

وہ اب ایک صوفے پر جا بیٹھا اور ٹانگ پر ٹانگ جمالی۔

''تم ابھی تک میرے کام کرنے کے طریقے سے واقف ہی نہیں ہو، کشمالہ۔'' اس نے افسوس سے سچ کیا۔

''اگر تمہیں ہلال کو نہیں چھوڑنا تھا تو مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟'' وہ فانوس تلے وسط کمرے میں کھڑی تھی۔ کسی مجسمے کی طرح۔ آنکھیں بس اس پہ ٹکی تھیں۔

''تم نے میرے اوپر بک شیلف گرایا تھا۔ تم مجھے مردہ سمجھ کے چھوڑ آئی تھیں۔ کیا تمہیں یاد ہے؟'' روشنی کی ایک جھری کھڑکی سے آتی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ باہر کوئی بتی جلی ہوئی تھی۔

''پلیز... ہلال کو جانے دو۔'' آنسو آنکھوں سے ٹوٹ ٹوٹ کے گرنے لگے۔

''تمہارا جو بھی مسئلہ ہے، میرے ساتھ ہے۔''

''میں اتنا بے وقوف ہوں جو اس کو جانے دوں تاکہ وہ پولیس کے پاس چلی جائے؟'' وہ حیران تھا جیسے۔

''تمہیں واقعی لگا تھا کہ تم آؤ گی اور میں اسے چھوڑ دوں گا؟''

''میں آگئی ہوں۔ اور تمہیں کیا چاہیے؟''

''تم مجھے بے وقوف بنانے آئی ہو۔ میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہی تھیں۔ تم ہلال کو آزاد کروالوگی۔ لیکن میرے ساتھ نہیں جاؤ گی۔ تم پولیس بلالوگی۔ پناہ لے لوگی۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور مجھے اس ملک سے بھاگنا پڑے گا۔ میں تمہارا پلان سمجھتا ہوں۔ اور پھر کیا ہوگا؟'' اس نے بہت تکلیف سے کشمالہ کو دیکھا۔

''پھر تم اس شخص کے پاس چلی جاؤ گی۔ تم دونوں ہنسی خوشی زندگی گزارو گے۔ تم زیاد سلطان سے آزاد ہو جاؤ گی؟'' زیاد کی آنکھیں گلابی پڑنے لگیں۔

''تم کچھ نہیں جانتے، زیاد۔''

''تم کچھ نہیں جانتیں، کشمالہ۔ لیکن اب تم جان جاؤ گی۔'' وہ آگے بڑھا۔ اس کی مٹھی بند تھی۔ وہ دیکھ سکتی تھی کہ اس کی مٹھی میں کچھ تھا۔

''تم یہ جان جاؤ گی کہ تم ساری عمر زیاد سلطان سے پیچھا نہیں چھڑا سکتیں۔''

وہ آگے بڑھتا گیا اور وہ قدم قدم پیچھے ہٹتی گئی۔ یہاں تک کہ کمر کے پیچھے لکڑی کی دیوار آگئی۔ پھر اس نے آنکھیں بند کردیں۔ اب ہر طرف اندھیرا تھا۔ وہ اس کی آواز سن سکتی تھی۔

''تمہیں تمہارا happily ever after کبھی نہیں ملے گا۔ کیونکہ میں آج تمہاری زندگی ختم کرنے جا رہا ہوں۔''

اس نے آنکھیں بند رکھیں۔ وہاں کوئی بک شیلف نہیں تھا جو وہ اس کو دے مارتی۔ وہاں کوئی نہیں تھا کیونکہ کوئی کسی کو بچانے نہیں آیا کرتا۔ اسے ماں کا چہرہ یاد آیا۔ اور وہ مری ہوئی فاختہ جو اس نے کچن گارڈن میں دبائی تھی۔ اور وہ بلی کا بچہ جو ماموں کے گھر کی منڈیر پر چڑھ کے روز بیٹھ جاتا تھا۔ اور وہ گلابی ہیئر بینڈ جو اسے ابو نے بچپن میں کسی سالگرہ پہ دیا تھا۔

زیاد نے کوئی شے زور سے اس کے بازو پر دے ماری تھی۔ سوئی کی نوک کی چبھن۔ اور پھر ساری دنیا اندھیر ہونے لگی۔ بلی کا بچہ مر گیا۔ اور فاختہ مٹی تلے چلی گئی۔ ہیئر بینڈ کا رنگ خاکی ہو گیا۔ اور ماں کی آنکھیں بجھ گئیں۔

وہ دیوار کے ساتھ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

لیکن ساری دنیا مکمل طور پہ تاریک نہیں ہوئی تھی۔

وہ کچھ کہہ رہا تھا اور وہ سننے کی کوشش کر رہی تھی۔

☆☆☆

"تمہیں تمہارا happily ever after! کبھی نہیں ملے گا۔ کیونکہ آج میں تمہاری زندگی ختم کرنے جا رہا ہوں۔"

(وہ سرخ اینٹوں سے بنی اونچی عمارت تھی۔ اس کے اندر وسیع ہالز تھے۔ ایسے ہی ایک شیشے کی دیواروں سے بنے ہال میں ماہر فرید کھڑا تھا۔ اس کے سامنے میز کے پیچھے ایک پولیس آفیسر بیٹھا بغور اسے سن رہا تھا۔ وہ دائیں بائیں ٹہلتا، بار بار ایک ہی بات دہرا رہا تھا۔

آفیسر کے سامنے رکھی کرسی پر ماہی بیٹھی، ٹھوڑی ہاتھوں پر جمائے، بے آواز رو رہی تھی۔ فائنڈ می والا نوٹ ان کے درمیان میز پر رکھا تھا۔

"ہو سکتا ہے وہ اپنی مرضی سے کہیں گئی ہو۔"

"وہ مرضی سے نہیں گئی۔ یہ زیاد نے کیا ہے۔"

وہ میز پر ایک ہاتھ رکھ کے جھکا اور ایک ایک حرف پہ زور دے کر کہنے لگا۔)

"تم میری زندگی میں آنے والی واحد عورت تھیں جو میری محرومیاں ختم کر سکتی تھی۔"

(اب وہ ایک بڑے کانفرنس روم کی طرح کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ ماہی چھوٹے بالوں میں ہیئر بینڈ لگائے، مسلسل آنکھیں ٹشو سے صاف کر رہی تھی۔ اس کے کالر کے کنارے پر پاؤڈر بلیک لگا تھا۔ ساتھ ہی حورعین اپنے اسٹرالر میں موجود تھی اور کافی چڑچڑی لگ رہی تھی۔ اب وہاں تین آفیسرز بیٹھے تھے۔ ایک سارجنٹ میجر، ایک انسپکٹر اور ایک سپرنٹنڈنٹ۔ سارجنٹ میجر ماہی سے سوال کر رہا تھا اور وہ نفی میں سر ہلاتی جواب دے رہی تھی۔ ماہر اس کے ساتھ خاموش بیٹھا تھا۔ ایک ہی سوال کی تکرار پہ اس نے سر دائیں بائیں جھٹکا اور بنا آواز کے ہونٹ ہلائے۔ "اف یہ Mounties")

"تم عورت ہو۔ اچھی عورت مسیحا ہوتی ہے۔ ساتھ نبھانے والی ہوتی ہے۔"

(مالک فرید اپنے آفس میں بیٹھے تھے۔ بتیاں گل تھیں اور وہ مزید میٹنگز اٹینڈ نہیں کر سکے تھے۔ وہ بس بے چینی سے بار بار گھڑی دیکھتے۔ دیوار پر لگی بڑی سی گھڑی جو ہر اس شہر کا وقت بتا رہی تھی جہاں فرید ہولڈنگ آپریٹ کرتی تھی۔ وین کوور کو انہوں نے اس میں حال ہی میں شامل کیا تھا اور اسی کے وقت پہ ان کی نگاہیں جمی تھیں۔

کشمالہ بیبین کو کھوئے آٹھ گھنٹے سے زیادہ بیت چکے تھے۔)

"اچھی عورت مرد کی اصلاح کرتی ہے۔ وہ اس کو نرمی سے درست راستے پر لاتی ہے۔"

(دو پولیس آفیسرز ہسپتال کے کاریڈور میں کھڑے تھے۔ ایک ٹیبلیٹ پر پین سے کچھ لکھ رہا تھا۔ دوسرا سامنے کھڑی اندرانی سے ہندی میں سوالات کر رہا تھا۔ وہ مسلسل شانے اچکا رہی تھی۔ اس کا چہرہ بے تاثر سا تھا جیسے اسے کوئی خوف نہ ہو۔

"زیاد یہاں نہیں ہے۔ میں نہیں جانتی وہ کہاں ہے۔"

"اچھی عورت سے شادی کا کیا فائدہ کشمالہ، اگر اپنے شوہر کو بدل نہ سکے؟"

(وہ ایک سی سی ٹی وی کیمروں سے سجا کمرہ تھا۔ وہ ماہی کے ساتھ وہاں کھڑا تھا۔ آپریٹر کے کندھے پر جھکے، وہ اسکرین دیکھ رہا تھا۔ ساتھ کھڑا پولیس آفیسر اسکرین کے ساتھ ساتھ ان دونوں کے چہرے بھی دیکھ رہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

pklibrary.com

## اُداس کیوں ہو؟

ہمیں زمانے نے سُکھ کے بدلے میں دُکھ دیا ہے، اُداس کیوں ہو
یہ مسئلہ تو بہت سے لوگوں کا مسئلہ ہے، اُداس کیوں ہو

تمہیں بھی کانٹوں سے پیار کرنا نہ راس آیا تو کیا بنے گا
یہ راستہ تو گلاب لوگوں کا راستہ ہے، اُداس کیوں ہو

یہ کیا کہ ہر شام ریل گاڑی کو دیکھ کر سوگوار ہونا
وہی ہے منزل، بچھڑنے والا جدھر گیا ہے، اُداس کیوں ہو

یہ میرؔ، غالبؔ، فرازؔ، محسنؔ، منیرؔ، مضطرؔ، فریدؔ، وارثؔ
ادب فروشوں نے ان نگینوں کو دُکھ دیا ہے، اُداس کیوں ہو

تم اپنے دل کے لہو سے روشن محبتوں کے چراغ رکھنا
فصیلِ شب سے اُٹھیں گے سورج، یہ طے شدہ ہے، اُداس کیوں ہو

وہ جس نے دل کے ہزار ٹکڑے کیے رقیبوں سے بات کر کے
بڑی محبت سے آ کے مجھ سے وہ پوچھتا ہے، اُداس کیوں ہو

وکیل ان کے، گواہ ان کے، یہ شہر ان کا، سپاہ ان کی
مگر مبارکؔ! یقین رکھنا، ابھی خدا ہے، اُداس کیوں ہو

مبارک صدیقی

اپنی طلب کا نام ڈبونے کیوں جائیں مے خانے تک
تشنہ لبی کا اک دریا ہے شیشے سے پیمانے تک

حسن و عشق کا سوزِ تعلق سمتوں کا پابند نہیں
اکثر تو خود شمع کا شعلہ بڑھ کے گیا پروانے تک

ساقی کو یہ خوش فہمی تھی، ہم تک موج نہ آئے گی
پیاس کا جب پیمانہ چھلکا ڈوب گئے مے خانے تک

مٹی سے جب پھول کھلائے کارِ جنوں کی محنت نے
شہر کچھ اس انداز میں پھیلے جا پہنچے ویرانے تک

زخمِ ہنر کا رنگ سلامت، سب کو خبر ہو جائے گی
کتنے چہرے ہم نے تراشے ہاتھ قلم ہو جانے تک

اس غربت کی دھوپ میں شاعرؔ اپنوں کا سایہ بھی نہ تھا
جس غربت کی دھوپ میں ہم کو یاد آئے بیگانے تک

شاعرؔ لکھنوی

www.paksociety.com

شگفتہ جاہ

## رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"پیر اور جمعرات کے روز جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔ چنانچہ ہر اس بندے کے گناہ معاف کردیے جاتے ہیں جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہو، سوائے اس آدمی کے کہ اس کے اور اس کے (کسی مسلمان) بھائی کے درمیان دشمنی ہو۔

کہا جاتا ہے: ان دونوں کو مہلت دی جائے یہاں تک کہ یہ صلح کرلیں، ان دونوں کو صلح کرنے تک مہلت دی جائے۔" (مسلم)

اور مسلم کی ایک اور روایت میں ہے: "ہر جمعرات اور سوموار کو اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔"

فائدہ: اس میں بھی باہم دشمنی اور بغض وعناد کو جنت سے محرومی کا سبب بتلایا گیا ہے۔

## جنات غیب دان نہیں ہوتے

حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے جنوں کی ایک بہت بڑی جماعت عظیم الشان عمارات بنانے میں مصروف تھی کہ سلیمان السلام کو پیغام اجل آپہنچا۔ مگر جنوں کو اس کی خبر نہ ہوئی۔ وہ اپنے ذمہ خدمات میں مصروف رہے اور عرصہ بعد جب دیمک نے ان کی لاٹھی کو چاٹ کر اس توازن کو خراب کردیا جس کی وجہ سے حضرت سلیمان لاٹھی سے ٹیک لگائے کھڑے نظر آتے تھے اور وہ گر گئے تب جنوں کو علم ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا عرصہ ہوا انتقال ہوگیا تھا انہیں افسوس ہوا کہ ہم نہ معلوم کر سکے کاش کہ ہم علم غیب رکھتے تو عرصہ تک اس مشقت ومحنت میں نہ پڑے رہتے جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے خوف سے مبتلا رہے۔

جنوں پر یہ راز کھلا تو تعمیر مکمل ہوچکی تھی۔ اس لیے جنوں کو افسوس رہا۔ اس سے اللہ کو یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ جن غیب دان نہیں ہوتے۔

## اظہار محبت

مغربی ممالک میں اظہار محبت یوں بھی ہوتا ہے۔

تم کن جھنجھٹوں میں پھنسی ہوئی ہو، میرا دل چاہتا ہے کہ تمہیں یہاں سے کہیں دور، بہت دور لے جاؤں، ہمارا ایک چھوٹا سا گھر ہو جس کے آنگن میں خوشیوں کے پھول کھلیں۔ ننھے منے معصوم بچوں کی ہنسی کی چہکار سے در و دیوار جھوم اٹھیں اور .....اور .....

"کہو نا، خاموش کیوں ہوگئے ہو؟" دوسری طرف سے فوراً پوچھا جاتا ہے۔

"اور اگر حالات اجازت دیں تو پھر شادی بھی کرلیں۔" بہت محبت سے جواب دیا جاتا ہے۔

## سیکورٹی

صحافیوں کی ایک ٹیم جیل کا دورہ کررہی تھی۔ ایک کوٹھڑی میں ایک مسکین شریف سے آدمی کو دیکھ کر ایک صحافی نے جیلر سے پوچھا۔

"ان صاحب نے کیا جرم کیا ہے؟"

"ارے جناب، ان صاحب نے کوئی جرم نہیں کیا لیکن انہوں نے ایک مشہور ڈاکو کو قتل کرتے دیکھ لیا۔ یہ اس قتل کے چشم دید گواہ ہیں۔ انہیں سیکورٹی کی وجہ سے جیل میں رکھا گیا ہے۔"

"اور وہ ڈاکو..... وہ کہاں ہے؟" صحافی نے پوچھا۔

"ابھی دو دن پہلے ہی وہ ضمانت پر رہا ہو چکا ہے۔"
جیلر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

## کہاوت کہانی

دعوت شیراز کا مطلب ہے نہایت بے تکلفی کی دعوت جس سے میزبان کو تکلیف نہ ہو اور نہ زیادہ بار خاطر ہو۔ سادہ اور معمولی غذا جو موقع پر حاضر اور موجود ہو، کھلا دینے کی ضیافت، اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب شیخ سعدی شیرازی سے متعلق ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے جو اس طرح ہے:

واقعہ:
شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی رحمتہ اللہ علیہ ایک مرتبہ اپنے کسی دوست کے یہاں مہمان ہوئے۔ اس نے ان کے کھانے میں نہایت اہتمام و تکلف کیا۔
شیخ سعدی جب کھانے سے فارغ ہوئے تو انہوں نے کہا: "آہ! دعوت شیراز"
دوسرے وقت میزبان نے اس سے بھی بہتر اور پرتکلف کھانا یہ سوچ کر تیار کرایا کہ شاید کھانے میں کچھ کمی رہ گئی ہے۔ شیراز کی دعوت اس سے بہتر ہوتی ہوگی۔ اسی لیے انہوں نے دعوت شیراز کو یاد کر کے "آہ دعوت شیراز" کہا۔ شیخ سعدی نے پھر دعوت
تیسرے وقت میزبان نے اور بھی بہتر اور پرتکلف کھانے کا اہتمام کیا مگر تیسرے وقت بھی کھانا کھانے کے بعد شیخ سعدیؒ نے وہی فقرہ کہا یعنی۔ "آہ! دعوت شیراز۔"
شیخ اپنے دوست کے یہاں کئی روز مہمان رہے اور رفتہ رفتہ تکلفات کم ہوتے گئے۔ میزبان نے اپنے دل میں سوچا کہ کسی دن چل کر شیخ سعدی شیرازیؒ کے یہاں دعوت کھا کر دیکھا جائے کہ کیا خاص بات ہے جو ان کو یہاں کا کھانا پسند نہ آیا اور دعوت شیراز کو برابر یاد کرتے رہے۔
شیخ سعدیؒ کے دوست ایک روز شیراز پہنچ گئے اور شیخ کے مہمان ہوئے۔ شیخ سعدی نے مہمان کے ہاتھ دھلا کر جو معمولی کھانا گھر میں پکا تھا، سامنے لا کر رکھ دیا۔
مہمان نے کھانا کھایا اور دل میں خیال کیا کہ اس وقت موقع نہ تھا، اسی لیے جو سادہ معمولی کھانا گھر میں موجود تھا وہی لا کر سامنے رکھ دیا۔ اب دوسرے وقت وہ بہترین اور پرتکلف کھانا کھلائیں گے جس کو میرے یہاں برابر آہ بھر کر یاد کر رہے تھے۔ مگر دوسرے وقت بھی ویسا ہی معمولی اور سادہ کھانا اس کے سامنے آیا۔ وہ شخص جب تک شیخ کا مہمان رہا ویسا ہی سادہ، بے تکلف اور معمولی کھانا اس کو کھانے کو ملتا رہا۔ آخر کار جب ایک دن مہمان رخصت ہونے لگا تو اس نے شیخ سعدی سے پوچھا:
"یار! تم جب میرے یہاں مہمان تھے تو آہ بھر کر دعوت شیراز کو یاد کرتے تھے اور اچھے سے اچھے، بہترین اور پرتکلف کھانے کو بھی ناپسند کیا کرتے تھے۔ آخر بات کیا ہے؟"
شیخ سعدی نے جواب دیا:
"پرتکلف کی مہمان داری دو تین وقت نبھ سکتی ہے زیادہ دن نہیں۔ اس لیے مشہور ہے کہ ایک دن کا مہمان دو دن کا مہمان، تیسرے دن بلائے جان۔ میں اسی لیے آہ بھر کر "دعوت شیراز" کو یاد کیا کرتا تھا کہ بے تکلف، سادہ اور معمولی کھانا کھلانے میں مہمان کتنے ہی دن رہے۔ میزبان کی طبیعت پر بار نہیں گزرتا۔ اسی کا نام دعوت شیراز ہے۔"

## فیس بک

ایک بچہ بڑی معصومیت سے اپنا موبائل دیکھتے ہوئے اپنے ماموں سے مخاطب ہوا۔
"ماموں جان! کیا آپ جانتے ہیں کہ میں لوگوں میں کس قدر مقبول اور پسند کیا جاتا ہوں۔"
ماموں چڑ کر اپنا موبائل دیکھتے ہوئے۔
"ہاں تو میں کیا کروں مجھے کیوں بتا رہے ہو۔" بچہ پھر مخاطب ہوا۔
"میرے فیس بک پر پورے دس اکاؤنٹ ہیں اور سب ہی مجھ سے دوستی کرنا چاہتے ہیں۔"
ماموں چڑ کر بولا۔
"ابے تو میں کیا کروں۔"
بچہ: "جس میری کو آپ پچھلے دو ہفتوں سے چائے پر بلا رہے ہیں، وہ میں ہی تو ہوں۔"

# میری بیاض سے

صبا ____ لاہور

کتاب آرزو کے گم شدہ کچھ باب رکھے ہیں
ترے تکیے کے نیچے بھی ہمارے خواب رکھے ہیں
ترے آنے سے پہلے جن کو مرجھانے کی جلدی تھی
وہی پتے ہوائے ہجر نے شاداب رکھے ہیں

فائکہ سہیل ____ کراچی

ہم نے دیکھا تھا فقط شوق نظر کی خاطر
یہ نہ سوچا تھا کہ تم دل میں اتر جاؤ گے

نادیہ یاسر ____ گوجر خان

کہاں کی دوستی اور کیسے ناتے
یہ قصے اب پرانے ہو گئے ہیں
خیالوں میں بھی تو آتا نہیں ہے
تجھے دیکھے زمانے ہو گئے ہیں

عزہ عاقب ____ گرین ٹی

میں خوب واقف ہوں اس کی فطرت سے فراز
درد دے گا تو اتنا کہ بس رلا ہی دے گا

سعدیہ ____ حیدرآباد

کچھ نہ کچھ سچائی ہوتی ہے نہاں ہر بات میں
کہنے والے ٹھیک کہتے ہیں سبھی اپنی جگہ
صرف اس کے ہونٹ کاغذ پر بنا دیتا ہوں
خود بنا لیتی ہے ہونٹوں پر ہنسی اپنی جگہ

سحر احمد ____ کراچی

راز کہہ دیتے ہیں نازک سے اشارے اکثر
کتنی خاموش محبت کی زبان ہوتی ہے

اقرا ابوبکر ____ گوجرہ

رات گہری ہے ڈر بھی سکتے تھے
ہم جو کہتے تھے کر بھی سکتے تھے
تم جو بچھڑے تو یہ بھی نہ سوچا
کہ ہم تو پاگل تھے مر بھی سکتے تھے

اریبہ، منیبہ شمشاد ____ آزاد کشمیر

نارسائی سے دم رکے تو رکے
میں کسی سے خفا نہیں ہوتا
چارہ دل سوائے صبر نہیں
سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

فضہ بلال ____ لاہور

قصہ غم حیات نہ پوچھو ہم سے محسن
بس جی رہے ہیں تو سمجھو کمال کر رہے ہیں

مدیحہ ____ کراچی

اس نے مانگا بھی اگر کچھ تو جدائی مانگی
اور ہم تھے ہمیں انکار نہ کرنا آیا

طوبیٰ اظہر ____ خانیوال

کیوں نہ ہم اس کو آئینہ ہو کر ملیں
بے وفا ہے وہ تو اس کو بے وفا ہو کر ملیں

عائشہ ____ محراب پور

عشق نے ہجر کا آزار تو دے رکھا ہے
اس سے بڑھ کر تو رعایت نہیں دی جا سکتی

حبیبہ خان ____ کراچی

تیری خاطر عمر بھر کا رت جگا ہم کو قبول
چاہتوں میں ایک شب کا جاگنا کچھ بھی نہیں

ثوبیہ ____ کراچی

ابھی تک پاؤں سے چمٹی ہیں زنجیریں غلامی کی
دن آ جاتا ہے آزادی کا، آزادی نہیں آتی

حمدہ خان ____ کراچی

رہے گی یاد ہمیں اس کی خوش مزاجی بھی
ملا جب بھی وہ خوش فہمیوں میں ڈال گیا

***

امت الصبور

# خواتین کی ڈائری

## عینا ثمر خان — کی ڈائری سے

پروین شاکر کی موت کو تین دہائیاں گزر چکی ہیں مگر وہ آج بھی اپنی خوشبو کی وجہ سے، ہمارے دلوں میں مہک رہی ہیں۔ ان کی یہ نظم جو مجھے بہت پسند ہے، آپ سب بہنوں کی نذر۔

### صرف ایک لڑکی

اپنے بند کمرے میں
میں اُداس بیٹھی ہوں
سرد ہوائیں آتی ہیں
مجھ کو چھو کر جاتی ہیں
تیرا نام لے کر مجھ کو گدگداتی ہیں
کاش میں ہوا ہوتی
تجھ کو چھو کر لوٹ آتی
کاش میرے پر ہوتے
تیرے پاس اُڑ آتی
میں نہیں مگر کچھ بھی
سنگدل رواجوں کے
آہنی حصاروں میں
عمر قید کی ملزم
صرف ایک لڑکی ہوں

## روبینہ — کی ڈائری سے

کلیم عاجز کی شاعری میں روایتی غزل کا عکس نظر آتا ہے اور جدت کے رنگ بھی۔ یہ چیز ان کی شاعری کو موجودہ دور کے شاعروں سے علیحدہ مقام دیتی ہے۔ ان کی یہ غزل آپ سب کی نذر۔

یہ ہنسی خوشی کا موسم، یہ بہار کا زمانہ
تیرے واسطے حقیقت، میرے واسطے فسانہ

تیری بات سب نے مانی، تیرا حال سب نے جانا
میرے دل کی دھڑکنوں سے رہا بے خبر زمانہ

نہ سنبھل سکی تجھ سے تیری زلف تا بہ شانہ
میں ابھی سے دیکھتا ہوں جو دکھائے گا زمانہ

میری خانہ خرابی کا جہاں میں ہے نشانہ
یہ وہ حادثہ تھا جس کو نہ بھلا سکا زمانہ

تجھے اے غم محبت، ادھر آ گلے لگا لوں
نہ تیرا کہیں گزر ہے نہ مرا کہیں ٹھکانہ

میں ہوں وہ غریب عاجز کہ گلوں کی انجمن میں
میرے پیراہن کے ٹکڑوں کا بنا ہے آشیانہ

## فاکہہ سہیل — کی ڈائری سے

ہماری معاشرتی اقدار جس تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے اس تبدیلی کو قبول کرنا آسان نہیں۔ اسی لیے بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں۔ اظہر عنایتی کی یہ غزل ان ہی جذبوں کی عکاس ہے۔

جب تک سفید آندھی کے جھونکے چلے نہ تھے
اتنے ہمارے پیڑوں کے پتے گرے نہ تھے

ان کے بھی اپنے خواب تھے، اپنی ضرورتیں
ہمسائے کا مگر وہ گلا کاٹتے نہ تھے

پہلے بھی داستانوں کے ماحول میں مگر
کیا لوگ تھے کہ جھوٹ کبھی بولتے نہ تھے

اظہر میرے بزرگ اُٹھاتے تھے جب ہاتھ
اپنے لیے ہی صرف دعا مانگتے نہ تھے

pklibrary.com

# وہ آئینہ صفت لوگ کہاں سے لائیں

امینۃ الصبور

یکم فروری کی رات کھانے اور دیگر کاموں سے فارغ ہو کر فون اٹھایا تو غزالہ نگار اور کزنی کا میسج تھا۔ جلدی سے کھولا، لکھا تھا۔
"پیاری احسن! ایک بہت دل شکن اطلاع دے رہی ہوں۔ ہماری پیاری دوست ساجدہ حبیب کل شام راولپنڈی میں وفات پا گئی ہیں۔
"اناللہ وانا الیہ راجعون"
دل پر جیسے قیامت سی گزر گئی۔ آنے والوں کو ایک دن جانا ہی ہوتا ہے۔ یہ کائنات تخلیق کرنے والے کا اٹل ضابطہ ہے۔ زندگی کے موج میلے میں الجھ کر ہم یہ حقیقت فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ لیکن ہمارا کوئی دوست، کوئی عزیز دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو یہ سفاک حقیقت بڑی شدت سے حملہ آور ہوتی ہے۔
ساجدہ حبیب کا گلنار چہرہ نظروں کے سامنے ہے۔ کتنی یادیں ہیں جو دل پر دستک دے رہی ہیں۔ ان کی کھنکتی آواز، محبت بھرا پرجوش لہجہ کیسی پیاری شخصیت کی مالک تھیں۔ بے ریا، سادہ، حسد اور جلن سے کوسوں دور، دوستوں سے محبت کرنے والی۔ ان کی خوشی میں خوش ہونے والی۔
اقبال بانو سے وہاڑی میں مل کر آئیں تو مجھے فون کیا۔ خوشی ان کے لہجے سے چھلک رہی تھی۔
"احسن! بانو تو ملکانی بن گئی ہے۔ اتنی بڑی حویلی میں رہتی ہے۔ فش فارم ہے۔ آموں کے باغات ہیں۔"
پھر وہ بہت دیر تک اقبال بانو کی باتیں کرتی رہیں۔ کس طرح اس نے ان کی خاطر تواضع کی کتنی محبت سے ملی۔ میں مسکراتی رہی۔ مجھے اقبال بانو کی مہمان داری اور محبت دونوں کا اندازہ تھا کیونکہ اقبال بانو سے پرانی دوستی ہے۔ جب وہ کراچی میں تھی تو ہفتہ میں چار دن ہمارے آفس میں ہوتی تھی۔ شادی کے بعد وہاڑی چلی گئی۔ جب میں ملتان گئی تو اپنے شوہر کے ساتھ خاص طور پر مجھ سے ملنے کے لیے ملتان آئی۔
ساجدہ سے پہلی ملاقات مجھے آج بھی یاد ہے۔ میں نے خواتین کا آفس نیا نیا جوائن کیا تھا۔ ان کے شوہر بریگیڈیر حبیب صاحب کی ان دنوں کراچی میں پوسٹنگ تھی۔ ساجدہ حبیب خالدہ اسد کے ہمراہ ریاض صاحب سے ملنے آئی تھیں۔
اس زمانے میں کرن میں ناظمہ طالب اور سلمٰی ناز ہوتی تھیں۔ مہناز فاطمہ میرے ساتھ کام کرتی تھیں۔ ریاض صاحب نے ہم سب کو بلا کر ساجدہ حبیب اور خالدہ اسد سے تعارف کرایا۔ اس وقت تک ساجدہ کی کوئی تحریر ہمارے ہاں شائع نہیں ہوئی تھی۔ خالدہ اسد کے افسانے البتہ شائع ہوئے تھے۔
خالدہ اسد اور ساجدہ حبیب دونوں ہی بے حد حسین تھیں۔ خاص طور پر ان کی گلابی رنگت اور تیکھے نقوش بے حد جاذب نظر تھے۔ خالدہ قدرے سنجیدہ اور کم گو تھیں لیکن ساجدہ خوب چہک رہی تھیں۔ دونوں بہت محبت سے ملیں۔ بابر صاحب بھی موجود تھے۔ ریاض صاحب اور بابر صاحب دونوں ہی بہت خوش کلام تھے۔ ان کی موجودگی میں ہم لوگ خاموش ہی بیٹھے رہے۔ یوں بھی چونکہ نیا نیا آفس جوائن کیا تھا۔ مزاجوں سے واقفیت نہ تھی۔ جب وہ رخصت ہونے لگیں تو خاص طور پر ہمارے کمرے میں آئیں۔ مجھے گلے لگا کر بڑی محبت سے کہا۔
"خالدہ احسن کی جلد کتنی تابناک ہے نا؟"
خالدہ مسکرا دیں۔ ساجدہ کے لہجے میں اتنا خلوص اور اپنائیت تھی، جیسے ہماری برسوں کی دوستی ہو، ان کا وہ محبت بھرا پرخلوص لہجہ آج بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔
بابر صاحب نے وہیں بیٹھے بیٹھے ان کے ساتھ کرن شام منانے کا پروگرام بنا لیا۔ ان کے کام ایسے ہی ہوتے تھے۔ دوپہر میں پروگرام بنا، مہمانوں کی لسٹ بنائی گئی اور شام کو ہم سب ووڈ اینڈ کیو میں

ساجدہ کے ساتھ شام منا رہے تھے۔

کراچی میں ساجدہ کا قیام زیادہ عرصہ نہیں رہا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے کراچی کے قیام کے دوران جتنا لکھا اور جتنا اچھا لکھا، یہاں سے جانے کے بعد نہیں لکھا۔ میں جب فون کر کے ان سے اصرار کرتی تو بہت جوش خروش سے وعدہ کرتیں۔ لیکن لکھ نہیں پاتی تھیں۔ البتہ ان کی کھنکتی آواز اور پر جوش محبت بھرا لہجہ برقرار تھا۔ محبت تو ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ جس میں وطن کی محبت پہلے نمبر پر تھی۔ پاکستانی فوج اور پاکستان سے محبت ساجدہ کی تحریروں کا بنیادی موضوع تھا۔ ساجدہ کی تحریر میں بلا کی کاٹ تھی۔ ان کے جملے مختصر مگر پر اثر ہوتے تھے۔ ان کو دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ اس معصوم سے چہرے اور بچوں کی سی کھلکھلاتی ہنسی کے پیچھے زندگی کا گہرا مشاہدہ چھپا ہوا ہے۔

ساجدہ سے کافی عرصہ سے رابطہ نہیں تھا۔ صحت کے حوالے سے میں خود کئی مسائل کا شکار رہی۔ اس لیے کم ہی فون کر پاتی تھی لیکن خواتین اور شعاع کے خاص نمبروں کے موقع پر ضرور یاد کرتی تھی۔ شعاع کے سالگرہ نمبر کے لیے ان کو فون کیا تھا۔ میں ان کا انٹرویو کرنا چاہتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ بات کرتے ہوئے ساجدہ کی سانس پھول رہی تھی۔ وہ بڑی دقت سے بات کر رہی تھیں۔ میں نے مختصر سی بات کر کے فون بند کر دیا۔ کیا پتا تھا کہ آخری بار ان کی آواز سن رہی ہوں۔

اب وہ آئینہ صفت لوگ کہاں سے لائیں۔

## کچھ یادیں..... باتیں

غزالہ نگار اور کزنی

ساجدہ کے بارے میں کیا لکھوں، کیا نہ لکھوں؟ تیس پینتیس سال پر محیط یادیں اور باتیں ہیں۔ ساتھ ساتھ گھومتے، پنڈی اور پشاور کے سہانے زمانے، بہت قصے ہیں۔ کچھ یاد ہیں، زیادہ تر بھول گئے۔ کچھ بتانے کے ہیں، کچھ نہیں۔ لیکن ساجدہ کا ذکر اس کی سریلی کھلکھلاتی ہنسی، اس کی چمکتی آنکھوں اور اس کے مخصوص تکیہ کلام "خانوں" اور "میری پیاری راج دلاری" کے بغیر کیسے مکمل ہو سکتا ہے۔

اس کی یہ محبت صرف زبانی کلامی نہیں تھی۔ جس سے محبت ہو جاتی تھی۔ اس سے دل کھول کے محبت کرتی تھی اور کچھ بھی کرنے کو تیار رہتی تھی۔ دوست دنیا سے چلے جاتے تو ان کی فیملیز سے رابطہ برقرار رکھتی۔ ہر ممکن دل جوئی کرتی۔ خالدہ اسد اس کی محبوب دوستوں میں سے تھیں۔ جن کا میرے پنڈی منتقل ہونے سے پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ ساجدہ اور حبیب لالہ، مجھے کل (شوکت رانا الطاف) سے ملوانے بطور خاص وہاں لے کر گئے تو ساجدہ مجھے خالدہ اسد مرحومہ کے بھائی کے ہاں بھی لے گئی۔ ان کی بھابھی اور بہن سے تعارف کروایا۔ اور ہم کافی دیر بیٹھے خالدہ کی یادگار کہانیوں کی باتیں کرتے رہے۔

ساجدہ سے غائبانہ تعارف "خواتین ڈائجسٹ" کی بدولت ہوا جہاں ساجدہ حبیب نے مجھ سے کافی پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ پھر خط و کتابت، جو ہماری جوانیوں میں واحد سوشل میڈیا تھا۔ ہم دوستوں کے حلقے میں جس کو کسی رائٹر کا اتا پتا مل جاتا۔ وہ دوسروں سے ضرور شیئر کرتیں اور پھر ہمارا سوشل سرکل بڑھتا گیا۔

جب میں بسلسلہ ملازمت راولپنڈی منتقل ہوئی تو میری سابقہ اسٹوڈنٹ، عالیہ شہریار نے مجھے بتایا کہ ساجدہ حبیب یہاں میرے ہمسائے میں ہی رہتی ہیں۔ اور وہی مجھے لے کر ساجدہ کے گھر جا دھمکیں۔ ساجدہ نے خوشی سے بے حال ہو کر استقبال کیا۔ اس کو اس "سرپرائز" کی توقع نہیں تھی۔ پھر ہماری دوستی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ جس کا ایک ایک دن یادگار۔

ایک دن باتوں باتوں میں تذکرہ ہوا، ہماری ایک رشتے کی پھوپھی، میرپور کے مشہور سیاسی اور مذہبی خاندان میں بیاہی گئی تھیں۔ لیکن ان کے بچوں سے رابطہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ یونہی گپ شپ میں ساجدہ سے ذکر کیا۔ تو اس نے نہ صرف فوراً پہچان

لیا۔ بلکہ اگلی مرتبہ میر پور گئی اور پھوپھی کی بڑی صاحب زادی سے ملاقات ہوئی تو ان کو میرا حوالہ دیا۔

سعیدہ دوستوں کی دوست اور عزیزوں کو بہت عزیز ہیں۔ انہوں نے بے حد محبت سے رابطہ کیا۔ اور اللہ کی شان، ساجدہ کی بیماری کی خبر مجھے اس کی وفات سے صرف دو دن قبل سعیدہ ہی سے ملی۔ اور اس سے پہلے کہ میں رابطے کا کوئی سلسلہ ڈھونڈ پاتی، کیونکہ وہ اسپتال میں تھی اور حبیب لالہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ سعیدہ کا فون آیا کہ ہماری پیاری دوست اللہ کو پیاری ہو گئی۔

اناللہ وانا الیہ راجعون۔

میں نے ہی یہ اطلاع اعتل کو انجم انصار اور نزہت اصغر کو اور دیگر دوستوں کو دی۔ کیونکہ جہاں تک میں جانتی ہوں۔ اس کی اپنی فیملی میں کوئی ایسا نہیں ہے۔ جو یہ خبر اس کے پڑھنے والوں تک پہنچاتا۔ اس کے زندگی بھر کے ساتھی، حبیب بھائی اس کی طویل بیماری کے، بلکہ غالباً اس کے کوما میں جانے سے مہینہ بھر پہلے اپنے رب کی طرف لوٹ چکے تھے۔ ایک بھائی ملک سے باہر دوسرے اپنی بیماری سے نبرد آزما اور سب سے چھوٹا اور لاڈلا بھائی، جس پہ ساجدہ کو بہت ناز تھا۔ چند سال پہلے ہی عین جوانی میں داغ مفارقت دے گیا تھا۔ ساجدہ پہ جو گزری۔ وہی جانتی ہوگی۔ مجھے صرف اندازہ ہے۔ اس پہ کیا قیامت بیتی ہوگی۔

پاکستان سے نکلنے کے بعد کچھ عرصہ ہم خط وکتابت کی طرف لوٹ گئے تھے۔ پھر میری بے انتہا مصروفیت میں، اس میں بھی طویل وقفے آتے گئے۔ ساجدہ میری منت سماجت کے باوجود سوشل میڈیا کی طرف نہیں آئی۔ جس پہ رابطے رکھنے بہت آسان ہیں۔ پرانے رشتے دوبارہ استوار ہوئے ہیں۔ سالہا سال کے گمشدہ دوست اور ساتھی ملے ہیں۔

ویسے باقاعدگی سے بات ہوتی یا نہیں۔ میں اس کی سالگرہ پہ اکتوبر میں اس کو فون ضرور کرتی، اور ہم بھی لپ سٹک لگاتے۔ نئے دلہوں کی طرح سجتے، چٹکلے، گل کو، انجم کو، مرحومہ بشریٰ رحمان کو اور آرمی کے ان دوستوں کو یاد کرتے، جن سے ہم دونوں کا مشترکہ تعلق رہا تھا۔

ساجدہ نے جو بھی کتاب چھپوائی۔ اپنی "پیاری، راج دلاری" غزالہ کو بھجوائی۔ میر پور سے اس کی ایک کزن امریکہ آتیں تو ساجدہ کی طرف سے قلمی سوغات ضرور آتی۔ میں اس کو فون کرتی، چکلالہ اسکیم تھری کی یادیں تازہ ہو جاتیں۔ جب ساجدہ کی اور میری رہائش گاہ کے درمیان طویل چہل قدمیاں ہوا کرتی تھیں۔

مجھے گل سے اور کئی اچھے دوستوں سے ملوانے والی ساجدہ خاموشی اور بے نیازی سے دنیا سے رخصت ہو گئی۔ یقین نہ بھی آئے تو کرنا ہی پڑتا ہے۔

ہماری آخری ملاقات پشاور میں ہوئی تھی۔ جب میں بدیس روانہ ہونے کو تھی۔ ساجدہ اور حبیب بھائی، انجم انصار اور عظمیٰ آفاق کو ملوانے پشاور لے کر آئے ہم نے بہت یادگار دن ساتھ گزرا۔ یہ جانے بغیر کہ یہ آخری بالمشافہ ملاقات ہے۔ بلاشبہ بے خبری ہزار نعمت بھی ہو سکتی ہے۔

ساجدہ اور حبیب لالہ نے اولاد کے نہ ہونے کے باوجود بہت اچھی اور بھرپور زندگی گزاری۔ اب تو صرف دعا ہے کہ رب پاک دونوں کی مغفرت فرمائے۔ اور ان کو اگلے جہاں میں بھی اکٹھا رکھیں۔ جیسا کہ رب کا وعدہ ہے۔ آمین ثم آمین۔

## حب الوطنی کی علامت

عزہ نایاب

میری پیدائش سے بھی بیس برس پیشتر 1971 میں لکھنے کا آغاز کرنے والی ساجدہ حبیب، جن کی ایک خوب صورت سائیڈ پوز والی تصویر بہت بار خواتین ڈائجسٹ پر لگی دیکھی تو بے اختیار ان کی گہری آنکھوں میں عجیب سی چمک کا واہمہ ہوا۔ شاید یہ وطن سے محبت کی وہ چمک تھی جو ان کی تحریروں میں

اسی طرح بنتی تھی کہ پڑھنے والی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ وطن کو دولخت ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا تب ہی ساجدہ صاحبہ نے لکھنا شروع کیا تو ان کے قلم سے سقوط ڈھاکہ میں محب وطنوں کے دلوں پر لگے زخموں کا خون، سیاہ الفاظ بن کر ایسے اترتا تھا کہ ان کی ہر تحریر باکمال لازوال ٹھہرتی تھی۔ 1980 کی دہائی میں کشمیر کی جدوجہد کے بانی لیڈر مقبول بٹ کو جب بھارت نے شہید کیا گیا تو ساجدہ صاحبہ نے ''تپش'' نامی تحریر لکھ کر مقبول بٹ زندہ و جاوداں کر دیا۔

ساجدہ حبیب کو اللہ نے اس اعزاز سے نوازا کہ وطن سے محبت بالخصوص کشمیر اور بنگلہ دیش کا موضوع ان کی شناخت بنا۔

''وردی'' کا لفظ جس پر آج کل کھلے عام باتیں ہوتی ہیں۔ مگر ساجدہ حبیب نے سالوں پہلے جب ''وردی، وعدہ اور وفائیں'' عجیب اتفاق ہے کہ دو دن بعد کشمیر سے یک جہتی کا دن منایا جائے گا۔ 2019 میں جب کشمیر کو بھارت نے اپنا حصہ قرار دے دیا تو ساجدہ حبیب جیسے مصنفین کی کمی شدت سے محسوس ہوتی تھی، مگر مزید کے بجائے سب کی پیاری ساجدہ بھی آج چل بسیں۔ دل بے حد بوجھل ہے۔

## خوب صورت کہانیوں کی خالق

عنیزہ سید

آج صبح غزالہ نگار کی پوسٹ سے معروف مصنفہ ساجدہ حبیب کی رحلت کی خبر ملی۔ ڈائجسٹ کے قارئین کے لیے ساجدہ حبیب کا نام ہرگز نیا نہیں۔ ایک وقت تھا جب ساجدہ حبیب ڈائجسٹ کے لیے لکھنے والی مقبول ترین مصنفاؤں میں شمار ہوتی تھیں۔ وہ اپنے بعد آنے والی کئی مصنفین بشمول خود میرے لیے انسپائریشن کا ماخذ تھیں۔ میں کئی بار یہ اعتراف کر چکی ہوں کہ میرے اندر لکھنے کی تحریک ساجدہ حبیب کی ایک کہانی جس کا آغاز اس جملے سے ہوا۔

''اس روز رنگ محل میں دو بارائیں ایک ساتھ اتری تھیں۔'' سے پیدا ہوئی۔

ساجدہ حبیب کو جب یہ بات پتا چلی تو بہت محبت سے میرا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ''مجھے خوشی ہے کہ میری کسی کہانی نے تم جیسی مصنفہ ادارے کو عطا کر دی۔'' یہ ان کا بڑا پن تھا۔

ساجدہ حبیب نے اپنی کہانیوں میں قارئین کو فوج سے متعارف کروایا، فوجی وردی اور فوجی بوٹوں والے ان کے ہیرو ایک زمانے میں ہم سب کے ہیرو تھے۔ فوجی کی شہادت کیا ہوتی ہے، اس کا وطن کے لیے جذبہ کیا ہوتا ہے۔ اس کی شہادت کے اثرات اس کے چاہنے والوں پر کیا ہوتے ہیں۔ ''وردی، وعدہ اور وفائیں، حکایت غم جاں، پناہ گزین، کانچ کا شہر کس کس کہانی کو یاد کروں، ایک سے بڑھ کر ایک نگینہ کہانیاں، روح کو گرما دینے والی خوب صورت کہانیاں جو گرما کی شاموں میں، سرما کی راتوں میں، بہار کی خوشبو کے سنگ، برسات کی رم جھم اور خزاں کی پت جھڑ کے دوران ہم نے پڑھیں اور بار بار پڑھیں۔

ساجدہ حبیب اور ان ہم عصر مصنفین جن میں ان کے ساتھ بشریٰ رحمن، خالدہ اسد، نسیم سحر، غزالہ نگار اور کزئی جیسی لکھاری شامل تھیں صرف نام نہیں اپنے ناموں کے اندر ایک عہد تھیں۔ جنہوں نے ڈائجسٹ میں حقائق پر مبنی کہانیاں متعارف کروائیں اور حقائق پر مبنی لائٹ رومینٹک کہانیاں لکھنے والی مصنفین کا ہراول دستہ بن گئیں۔ اپنے بعد آنے والی مصنفین کے راستے انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے صاف کیے۔ ان میں سے ہر نام ایک عدد سیلوٹ کا مستحق ہے کیونکہ ادبی حلقوں میں ڈائجسٹ کی لکھاریوں کے متعلق پائے جانے والی حقارت آمیز متھ کو انہوں نے ہی توڑا۔

ہم سب ساجدہ حبیب کے مقروض ہیں جنہوں نے آنے والے دور کی مصنفین کو راہ دی کہ آؤ دنیا کے تلخ اور شیریں، تاریک اور روشن مناظر، کردار اور ان

pklibrary.com

کی کہانیاں لکھنے کا آغاز ہم نے کر دیا ہے اب تم لوگ آگے بڑھو اور اسی طرز کی تحریریں تخلیق کرتی چلی جاؤ۔

خوب صورت کہانیاں لکھنے والی ساجدہ حبیب اب ہم میں نہیں رہیں۔ اپنے شوہر سے ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ ان کے انتقال کے صرف ایک ماہ بعد ان سے جا ملیں۔ ساجدہ حبیب نہیں رہیں لیکن ان کی کہانیاں ان کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے ہمارے پاس موجود ہیں۔ اللہ پاک ساجدہ حبیب اور کرنل حبیب کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے...... جانے والی روحوں کے لیے بہت دعائیں۔

## ایک اور ستارہ ڈوب گیا

عارفہ فضل شاہ

حب الوطنی کا استعارہ ڈوب گیا۔

آہ ساجدہ حبیب دل درد سے بوجھل ہے۔ خبر پڑھ کر دھچکا لگا۔ وطن کی مٹی کی محبت سے گندھی شہزادی مٹی میں دفن ہوگئی۔

سقوط ڈھاکہ اور کشمیر کا غم محسوس کرتے والا دل دھڑکنا چھوڑ گیا۔

ساجدہ وہ ہیرا جن کے قلم کا محور وطن تھا۔ جن کی زندگی میں تابانی وردی کے دم سے تھی۔ جن کا دل وفا کا چھلکتا ہوا پیمانہ تھا۔ قومی یکجہتی سالمیت پہ لکھنے والے ہاتھ ہم نے کھو دیے۔

ابھی ابھی 1997 کے شمارہ میں ان کے جوابات پڑھے۔ جب انہوں نے یہ جوابات لکھے تب میری عمر سال ڈیڑھ سال تھی۔ پیاری ساجدہ کے گمان میں بھی نہیں ہوگا، میلوں دور پاؤں پاؤں چلنے والی بچی جب جوان ہوکر یہ پڑھے گی تو لکھنے والی محبت کی پری خالق حقیقی سے مل چکی ہوگی۔

میں جب لکھتی ہوں تو تواتر اور تسلسل سے لکھتی ہوں۔ ناول ہو یا افسانہ ایک نشست میں مکمل ہو جاتا ہے، الفاظ کرنوں کی طرح اترتے ہیں اور شعاعوں کی طرح پھیلتے ہیں آج...... قلم رک رہا ہے۔

دھند آنکھوں میں اور کپکپاہٹ ہاتھوں میں اتر

کی ہے۔ کیونکہ پیاری ساجدہ کی ہیں اجڑ چکی ہیں۔

ساجدہ حبیب سے رشتہ ایک قاری اور رائٹر کا تھا۔ محبت عقیدت اور خلوص کا تھا۔

پیاری ساجدہ موتیوں جیسے الفاظ پرو کر گئی ہیں جو تادیر ذہن و دل میں محفوظ رہیں گے۔

تم تو چلی گئیں ساجدہ میں سوچتی ہوں۔ "اب وردی، وعدہ اور وفا میں" جیسی تحریر کون لکھے گا؟

شاہ مدن کی زیارت کی سیر ہم کیسے کریں گے؟ "شہر شکست آرزو" دل پہ نقش ہے لیکن لکھنے والی کیوں اوجھل ہوگئی؟

تیرا شہر رنگ اجڑ گیا کا میجر منصور نہیں جانتا کہ شہر کا رنگ تو اب اجڑا ہے جب تم شہر خموشاں کی باسی ہوئی ہو۔

دار پہ دل، تیرگی شب، تپش، جرم شناسائی، جزیرہ وفا...... میری پیدائش سے پہلے کی تحریریں ہیں لیکن ایسی کردار سازی کی گویا آپ نے میرے لیے ہی لکھی ہوں۔

کیا کیا یاد کروں ساجدہ

مدتوں بعد بھی امید نہیں کہ کوئی آپ جیسا لکھ سکے گا۔

کیونکہ ایسے دل انمول ہیں جیسا دل آپ کے سینے میں دھڑکتا تھا۔

دل سے دعائیں ساجدہ کو اور سب جانے والوں کو...... تاکہ ہمارے جانے پہ بھی ہاتھ اٹھائے جائیں۔ ہم زندہ رہ جانے والوں کو دکھ بڑا اسی اصل امتحان جانے والے کا شروع ہوتا ہے۔

ساجدہ نے ہمیں بہترین تحریریں دی ہیں، ہمارا فرض ہے کہ ہم یہ قرض دعا کی صورت میں اتاریں۔

میری دعا ہے کہ اللہ کریم ساجدہ سمیت تمام مسلمانوں کی اگلی منزلیں آسان کرے اور ان کی قبروں کو جنت کا باغ بنا دے۔ آمین ثم آمین۔

☆☆

# موسم کے پکوان

واصفہ سہیل

رمضان المبارک کے بابرکت مہینے کا آغاز ہو گیا ہے ہر گھر میں رمضان کی عبادت کے ساتھ ساتھ سحری اور افطاری کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ روزانہ سحری اور افطاری میں کیا نیا بنائیں کی تکرار رہتی ہے ہم نے سوچا کہ اس سلسلے میں ہم اپنی قاری بہنوں کی کچھ مشکل آسان کریں۔ آیئے آج موسم کے پکوان سے آپ کیا بنا رہی ہیں۔

## قیمے کے سموسے

ضروری اشیاء:

| | |
|---|---|
| سموسہ پٹی | حسب ضرورت |
| قیمہ | ایک پاؤ |
| پیاز | ایک عدد |
| لہسن، ادرک | ایک چمچہ |
| نمک | حسب ذائقہ |
| لال مرچ | آدھا چائے کا چمچہ |
| ہلدی | ایک چوتھائی چائے کا چمچہ |
| زیرہ | ایک چائے کا چمچہ |
| تیل | تلنے کے لیے |
| ہرا دھنیا | دو چمچے |
| ہری مرچ | حسب ذائقہ |
| تیل | ایک کھانے کا چمچہ |

ترکیب:

قیمہ میں باریک کٹی ہوئی پیاز، پسا ہوا ادرک لہسن، نمک، مرچ، ہلدی، کٹا ہوا زیرہ، آدھا کپ پانی اور ایک چمچہ تیل ڈال کر ہلکی آنچ پر پکنے رکھ دیں۔ بھننے لگے تو اس میں باریک کٹی ہری مرچ اور ہرا دھنیا ڈال کر بھونیں اور اتار کر ٹھنڈا کر لیں۔

اب سموسہ پٹی میں ایک کھانے کا چمچہ یا حسب پسند قیمہ رکھ کر شیپ دے لیں۔ اسے آپ فریز بھی کر سکتی ہیں۔ گہرے تیل میں تل لیں۔

## چوکور تہہ والے پراٹھے

ضروری اشیاء:

| | |
|---|---|
| آٹا | چار کپ |
| نمک | حسب ذائقہ |
| ہلکا گرم پانی | حسب ضرورت |
| گھی | حسب ضرورت |

ترکیب:

آٹے کو تسلے میں چھان کر نمک مکس کر کے ہلکے گرم پانی سے آٹا گوندھ لیں اور تھوڑی دیر کے لیے ڈھک کر رکھیں۔

آٹے کے پیڑے بنا کر روٹی بیل لیں۔ روٹی پر گھی لگائیں اور تھوڑا خشک آٹا چھڑک دیں۔ ایک سائیڈ سے روٹی کا آدھا حصہ پلٹ دیں اور دوسری سائیڈ پلٹ کر ہاتھ سے دبا کر آمنے سامنے والا حصہ پلٹ کر دبا کر بیل لیں اور چوکور شیپ دیں۔ پہلے سے گرم توے پر پراٹھا ڈالیں۔

ایک طرف سے پک جائے تو پراٹھا پلٹ دیں اور گھی ڈال کر سینک لیں۔ پراٹھا دونوں طرف سے کرکرا ہو جائے تو توے سے اتار لیں انڈے یا سالن کے ساتھ پیش کریں۔

## ہری مرچ کے پکوڑے

ضروری اشیاء:

| | |
|---|---|
| ہری مرچ | ایک پاؤ |
| تیل | حسب ضرورت |
| نمک | حسب ذائقہ |
| چاٹ مسالا | ایک کھانے کا چمچہ |
| کھٹائی | ایک کھانے کا چمچہ |
| بیسن | ایک کپ |
| آلو | دو عدد |

ترکیب:

آلو ابال کر باریک کچل لیں اور اس میں نمک،

چاٹ مسالا اور پسی ہوئی کھٹائی ملا دیں۔ ہری مرچوں سے بیج نکال کر مسالا لگے آلو کا آمیزہ بھر دیں۔

بیسن میں نمک، لال مرچ، ہلدی، چٹکی بھر میٹھا سوڈا اور زیرہ کوٹ کر ملا کر پانی ڈال کر گاڑھا پیسٹ بنا لیں۔ ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں۔ مرچوں کو بیسن کے آمیزے میں ڈبو کر تیل میں ڈال کر درمیانی آنچ پر سنہرا ہونے تک تل لیں۔ میٹھی چٹنی کے ساتھ افطار میں پیش کریں۔

## کالے چنے

ضروری اشیاء:

| | |
|---|---|
| کالے چنے | آدھا کلو |
| ٹماٹر | ایک پاؤ |
| ہرا دھنیا | حسب پسند |
| پیاز | ایک عدد |
| زیرہ | ایک چائے کا چمچہ |
| لال کٹی مرچ | دو چائے کے چمچے |
| لال مرچ | ڈیڑھ چائے کا چمچہ |
| املی | آدھا کپ |
| تیل | تین کھانے کے چمچے |

ترکیب:

چنوں کو رات بھر بھگو کر ابال لیں۔ چھلنی میں دھو کر نکال لیں۔ تیل میں پیاز کو ہلکا سرخ کر لیں۔ چنے ڈالیں پھر املی، زیرہ، کٹی مرچ، لال مرچ، اور ٹماٹر ڈال کر دھیمی آنچ پر ٹماٹر گل جانے تک پکائیں، ہرا دھنیا ڈال کر پیش کریں۔

## رول

ضروری اشیاء:

| | |
|---|---|
| رول کی پٹیاں | تیرہ عدد |
| بند گوبھی | ایک عدد |
| گاجر | دو عدد |
| شملہ مرچ | دو عدد |
| ہری مرچ | چار عدد |
| نمک | حسب ذائقہ |
| کٹی لال مرچ | ایک چائے کا چمچہ |
| کالی مرچ | ایک چائے کا چمچہ |
| سویا ساس | دو چائے کے چمچے |
| سرکہ | دو چائے کے چمچے |
| انڈا | ایک عدد |
| تیل | دو کپ |

ترکیب:

انڈا ابال لیں، گاجر کدوکش کر لیں، بند گوبھی، شملہ مرچ باریک کاٹ لیں، ہری پیاز بھی باریک کاٹ لیں۔ تمام سبزیوں کو دو چمچے تیل ڈال کر تل لیں۔ پانچ منٹ کے بعد اس میں تمام مسالے شامل کر لیں۔ چولہے سے اتار کر ٹھنڈا کر لیں۔ اب ایک رول پٹی لے کر اس پر تیار سبزیوں کو رکھ کر رول بنائیں اسی طرح تمام رول تیار کر لیں پھر تیل میں تل لیں۔

## بگھارے دہی بڑے

ضروری اشیاء:

| | |
|---|---|
| بیسن | ایک کپ |
| کھانے کا سوڈا | ایک چٹکی |
| نمک | حسب ذائقہ |
| لال مرچ | آدھا چائے کا چمچہ |
| دہی | آدھا کلو |
| تیل | حسب ضرورت |
| کڑی پتا | چھ سے سات عدد |
| زیرہ | آدھا چائے کا چمچہ |
| ثابت لال مرچ | چار سے پانچ عدد |

ترکیب:

بیسن میں کھانے کا سوڈا، نمک اور لال مرچ ڈال کر پانی سے اچھی طرح پھینٹ لیں اور گرم تیل میں پکوڑے تل لیں سنہری ہو جائیں تو نکال کر پلیٹ میں رکھیں۔

دہی میں نمک ملا کر پھینٹ لیں۔ پکوڑے دہی میں ڈالیں ایک فرائی پین یا بگھار کے برتن میں چوتھائی کپ تیل گرم کر کے اس میں ثابت لال مرچیں، زیرہ اور کڑی پتا ڈال کر کڑکڑائیں اور دہی بڑوں پہ بگھار لگا دیں۔

☆☆

www.pklibrary.com

عدنان

# آپ کی ازدواجی الجھنیں

**فضا ...... حیدرآباد**

ہماری لو میرج تھی میرے شوہر پڑوس میں رہتے تھے اور بس اوپر والے نے جوڑی بنائی تھی، ہمارے سسرال والے تو اس شادی کے سخت خلاف تھے، بہرحال اللہ نے شادی کرادی تو بہت سے پردے آنکھوں پر سے ہٹے وہ الگ کہانی ہے۔

اب میری بڑی بیٹی [illegible] کی طالبہ ہے اسے اپنی کلاس فیلو کے بھائی سے محبت ہوگئی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ وہ بضد ہے کہ شادی کرے گی تو [illegible] لڑکے سے ہے۔ یقین جانیے اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو اسے قبول کیا جائے۔ میری ساس [illegible] اس کے باپ نے بھی اپنی مرضی چلائی تھی تو اب اس کی بیٹی کو بھی اس کی مرضی چلانے دو۔ [illegible] کے اس قسم کے الزامات سے تنگ چکی ہوں۔ میرے شوہر بھی بیٹی کے آگے ہار مان چکے ہیں پر میرا دل [illegible] ہے اور پر سے میری ساس۔ میں کیا کروں سب مجھے سمجھاتے ہیں کہ مان جاؤ لڑکے کی شکل صورت کو [illegible] پر میرا دل نہیں مان رہا۔ میرے دل میں تو ایک ہینڈسم داماد کا تصور تھا اور یہاں تو میری حور جیسی بیٹی نے [illegible] کو دل دے دیا ہے؟

ج: عزیز بہن! آپ نے یہ نہیں بتایا کہ شکل وصورت کی کمی کے علاوہ اس میں مزید کیا خرابی ہے۔ اگر معاملہ صرف شکل وصورت کا ہے تو اسے برداشت کیا جاسکتا ہے، شکل وصورت اہمیت ضرور رکھتی ہے لیکن ہر ایک کا معیار حسن جدا ہوتا ہے۔ اگر آپ کی بیٹی کو وہ پسند ہے تو اسے قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس کے ساتھ زندگی آپ کی بیٹی نے گزارنا ہے آپ نے نہیں۔ وہ خوش رہے آپ کو اور کیا چاہیے۔

لیکن اگر معاملہ اسٹیٹس کا ہے، تعلیم کا ہے، روزگار کا ہے یا اس میں کوئی بری عادتیں ہیں تو سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ایسی صورت میں شادی تو ہو جائے گی پھر مسائل پیدا ہوں گے۔ اس شادی کو نبھانا مشکل ہوگا اور آپ کی بیٹی خوش نہیں رہ سکے گی۔ ویسے لگتا یہی ہے آپ کو صرف اس کی صورت پسند نہیں کیونکہ اگر اس میں کوئی بڑی برائی ہوتی تو آپ کے شوہر اور ساس کبھی راضی نہ ہو۔ بہتر یہی ہے کہ بیٹی کی خوشی میں آپ بھی خوش ہو جائیں ویسے بھی زندگی صرف صورت کے سہارے نہیں گزاری جاسکتی۔

**رومانہ ...... کراچی**

میرے بھائی ہر سال عید پر چوڑیوں کے اسٹال لگاتے ہیں اور بڑا انجوائے کرتے ہیں لیکن جب سے میں نے دین کی جانب سنجیدگی سے رجوع کیا ہے، مجھے بڑا برا لگتا ہے کہ میرے بھائی غیر لڑکیوں، عورتوں کو اپنے ہاتھوں سے چوڑیاں پہناتے ہیں۔

گھر میں اس بات پر میں نے بڑا طوفان مچایا تو میری بھابیوں نے مجھے طعنہ دیا کہ جب ہمیں اعتراض نہیں تو تم کون ہوتی ہو اعتراض کرنے والی مجھے لگتا ہے کہ اس طرح ہم سب جہنم کی جانب بڑھ رہے ہیں، میں بہت ڈرتی ہوں۔ کیا کروں؟ سب ہی میرا مذاق بناتے ہیں۔

www.pklibrary.com

ج:۔رومانہ بی بی! شریعت کی رو سے آپ کی بات درست ہے۔ ویسے بھی آپ کے ئی صرف عید پر اسٹال لگاتے ہیں، یعنی یہ ان کا ذریعہ روزگار نہیں ہے، وہ صرف مشغلے کے طور پر وقت گزار کے لیے یہ کام کرتے ہیں اور ان کے لیے کام چھوڑنا مشکل نہیں ہے۔ آپ نے ان کو صحیح بات بتادی۔ آپ اپنا فرض ادا کردیا اب اگر وہ نہیں مانتے تو آپ کیا کرسکتی ہیں؟ یا کسی اور کا مشورہ ان پر کیا اثر کرے گا۔

## عینی خان...... مانسہرہ

عدنان بھائی! زندگی میں اتنے دکھ ملیں گے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ میرا تعلق لوئر مڈل ک رانے سے ہے۔ ابو کسی دکان پر سیلز مین تھے۔ دو کمروں کا تنگ و تاریک گھر جس میں ہم چھ بہن بھائی ن کے ساتھ رہتے تھے۔ تنگی کا وہ عالم تھا کہ اللہ کی پناہ۔ مہینے کے آخری دنوں میں جب آٹے کا ڈبا خالی ہو چٹنی روٹی کا سہارا بھی نہ رہتا۔ امی گھر میں سلائی کا کام کرتی تھیں وہ کہیں سے ادھار مانگ کر لاتی تھیں تو تا تھا۔ ایسے میں میرے لیے چچا کے گھر سے رشتہ آیا تو امی خوشی سے کھل اٹھیں۔ لیکن مجھ پر جیسے بجلی سی گر گئی ا کے گھر کے حالات بھی ہمارے گھر سے مختلف نہیں تھے۔ خالد جس سے میرا رشتہ آیا تھا۔ پلمبر تھا مہینہ میں دس بارہ دن تو گھر پر ہی رہتا کیونکہ روز مزدوری نہیں ملتی تھی۔ میں نے صاف انکار کردیا۔ امی نے بہت ، ابو نے بھی کوشش کی کہ میں مان جاؤں لیکن میں اپنی ضد سے پیچھے نہ ہٹی آخر امی، ابو مجبور ہوگئے انہوں چچا کے ہاں انکار کردیا۔

دوسال گزر گئے۔ خالد نے کہیں اور شادی سے انکار کردیا تھا۔ برادری سے ہی میرے ک رشتہ آیا وہ کھاتے پیتے لوگ تھے۔ میں تو خوش ہوگئی۔ امی ابو تو چاہتے تھے کسی بھی طرح میری شادی ہو ۔ رشتہ قبول کرلیا گیا، اسلم سے میری شادی ہوگئی پہلا بچہ ہوا اس کے بعد سسرال والوں نے کہا اب تم ر بساؤ ہمیں دوسرے بچوں کی بھی شادی کرنا ہے۔

اسلم باپ کے ساتھ کپڑے کی دکان پر بیٹھتے تھے۔ انہوں نے کرایہ پر گھر لیا تو کرایہ کہاں یں۔ باپ تو جیب خرچ دیتے تھے، باقی خرچ تو دکان سے نکلتا تھا۔ دکان اتنے اخراجات کی متحمل نہیں ہوسکتی ورا اسلم نے ملازمت کی۔ وہ بی اے پاس تھے۔ معمولی سی ملازمت ملی۔ کرایہ، گھر کے اخراجات اس دوران دو ی ہو چکا تھا۔ اب وہی مفلسی تھی جس سے پیچھا چھڑا کر میں یہاں آئی تھی۔ گھر میں لڑائی جھگڑے ہوتے۔ اسلم کا ٹ ہوا تو ان کی ٹانگ میں فریکچر ہوگیا۔ دوسال معذور گھر پر رہے پھر ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ چل بسے۔

میں والدین کے گھر آگئی۔ عدت کے بعد والدین نے کہا کہ مجھے اب گھر بسالینا چاہیے کیونکہ ے بچوں کے اخراجات نہیں اٹھاسکتے تھے۔ مجھے بھی گھر کے حالات نظر آرہے تھے۔ خالد نے ابھی تک شادی نہیں کی چا نے دوبارہ رشتہ بھجوایا تو مجھے قبول کرنا پڑا، ویسے بھی میں تقدیر کے سامنے ہتھیار ڈال چکی تھی۔ شادی ہوگئی۔ تنگی ترشی لیکن وہ مجھے طعنے دیتا ہے، جو میرے لیے ناقابل برداشت ہیں وہ یہ بھولنے کو تیار نہیں کہ میں نے اسے اس کی غربت ے ٹھکرایا تھا۔ مجھے بتایے میں کیا کروں، کہاں جاؤں کیا ایک اچھی زندگی کی خواہش اتنا بڑا جرم تھا جس کی سزا مجھے ملی۔

ج:۔اچھی بہن! آپ نے کوئی جرم نہیں کیا، نہ ہی آپ کو کوئی سزا ملی ہے، یہ صرف تقدیر کرشمے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری تقدیروں میں جو لکھ دیا ہے۔ وہ ہم سب کو سہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ م کی پیدائش سے بھی پہلے ہماری تقدیریں لکھ دی ہیں۔ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ آپ کے لیے آ ان کرے، وہ دعا قبول کرنے والا ہے۔ آپ کی دعائیں بھی قبول کرے گا۔ ان شاء اللہ۔

☆☆

www.paksociety.com



## نوشابہ فیروز۔ سرگودھا

س 1۔ میرے بال بہت زیادہ الجھتے ہیں۔ جب بھی کنگھا کروں تو بہت ٹوٹتے ہیں۔ ایسے بالوں کی دیکھ بھال کے لیے کوئی طریقہ بتادیں۔

ج۔ آپ کے بالوں کے لیے نیم گرم تیل کی مالش بہترین علاج ہے۔ اس سے آپ کے بال نرم مضبوط اور گھنے ہوجائیں گے۔ خشکی ہے تو وہ بھی ختم ہوجائے گی۔ اگر آپ کے بال زیادہ الجھتے ہیں تو آپ نہانے سے دو یا تین گھنٹے قبل مالش کریں۔ شیمپو کرنے سے قبل موٹے دانوں والے کنگھے سے بال سلجھائیں تاکہ بالوں میں جو الجھاؤ ہے وہ تیل لگے بالوں میں ہی سلجھ جائے۔ خشک بالوں میں کنگھا چلانے سے بال ٹوٹ جاتے ہیں۔ ہفتے میں دوبار آپ تیل کو بطور ہیر ماسک لگاسکتی ہیں۔ ناریل، زیتون، بادام اور تل کا تیل بہترین ہے۔ بال اس وقت الجھتے ہیں۔ جب وہ بالکل خشک ہوتے ہیں تیل لگانے سے بالوں کا الجھاؤ کم ہوجاتا ہے۔

آدھا کپ دہی کو پھینٹ کر بالوں میں لگالیں اور دو گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ بالوں کو نیم گرم پانی سے دھولیں۔

میتھی بھی بالوں کے لیے بہترین ٹانک ہے یہ بالوں میں نمی کی مقدار کو بڑھاتی ہے۔ تین سے پانچ کھانے کے چمچے میتھی کو رات بھر کے لیے بھگودیں۔ اگلے دن انہیں گرائینڈر میں پیس لیں۔ پھر اس آمیزے میں تین کھانے کے چمچے دہی اور ایک کھانے کا چمچہ زیتون کا تیل شامل کرکے ایک گھنٹے کے لیے بالوں میں لگائیں پھر سادے پانی سے دھولیں، یہ آپ ہفتے میں ایک بار لگاسکتی ہیں۔

## فاطمہ نثار۔ ملتان

س 2۔ میری جلد چکنی نہیں ہے لیکن میرے منہ پر مہاسے نکل آئے ہیں اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے کوئی ہرمون ٹوٹکا ہے تو وہ بھی بتادیں۔

ج۔ جلد تو سب کی مختلف ہوتی ہے۔ کبھی کبھار نارمل جلد کے لوگوں میں بھی یہ مسئلہ ہوجاتا ہے۔ آپ عرق گلاب اور لیموں کو برابر مقدار میں لے کر اسٹرینجنٹ بنالیں۔ چہرا دھوکر لگائیں اور پندرہ منٹ بعد دھولیں۔ اب گرمیاں آرہی ہیں۔ صندل پاؤڈر اور عرق گلاب کا گاڑھا پیسٹ بنا کر بیس منٹ تک چہرے پر لگائیں۔ اس کے علاوہ آپ پسے ہوئے نیم کے پتوں میں ہم وزن جوکا آٹا اور عرق گلاب ملا کر چہرے پر لگائیں یہ ماسک نئے نکلنے والے مہاسوں سے بچائے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی غذا پر دھیان دیں۔ مرغن مصالے دار غذائیں، زیادہ میٹھی اشیاء اور چائے کافی سے بھی پرہیز کریں۔ سبزیوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال کریں۔

## اریبہ شاہجہاں۔ سمہ سٹہ

س 3۔ میرا ایک مسئلہ یہ ہے کہ میری آنکھوں کے نیچے حلقے ہیں۔ دوسرا یہ ہے کہ میری جلد آج کل کھردری لگنے لگی ہے۔ میری عمر چھبیس سال ہے؟

ج۔ آنکھوں کے نیچے حلقوں کی بے شمار وجوہات ہوسکتی ہیں۔ کبھی کبھار یہ موروثی بھی ہوتا ہے۔ رات کو سونے سے قبل روغن بادام سے ان حلقوں پہ انگشت شہادت سے ایک ہی رخ پر ایک منٹ کے لیے مساج کریں۔ دس منٹ کے لیے پرسکون لیٹ جائیں۔

آپ کی جلد کے لیے پپیتے کے چھلکوں سے مساج بہترین ہے۔ چھلکے کا گودے والا حصہ جو ہے اس سے اپنے چہرے پر مساج کریں۔ اس کے علاوہ آپ دہی سے چہرے اور گردن کا بیس منٹ تک مساج کریں۔ سادے پانی سے دھولیں آپ ہفتے میں دو دفعہ یہ استعمال کرسکتی ہیں۔

☆☆